میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
میرے نالۂ نیم شب کا نیاز میری خلوت و انجمن کا گداز

سلیم کے نام خطوط

جلد دوم

پرویز

○

شائع کردہ
طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور

نام کتاب ——— سلیم کے نام خطوط (جلد دوم)

مصنف ——— مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویز

ناشر ——— طلوعِ اسلام ٹرسٹ
۲۵۔ بی گلبرگ ۲۔ لاہور

طابع ——— خالد منصور نسیم

مطبع ——— النور پرنٹرز و پبلشرز
۲/۳ فیصل نگر، ملتان روڈ
پوسٹ بکس ۱۰۹۰۴۔ لاہور ۵۴۵۰۰

ایڈیشن ——— ششم سنہ ۱۹۹۶ (۱۰ نومبر)

قیمت ——— سٹوڈنٹ:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مشمولات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

"سلیم کے نام خطوط" کا تفصیلی تعارف جلد اوّل کے پیش لفظ میں کرایا جا چکا ہے۔ اس کے دُھرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ اُس جلد میں سترہ خطوط شامل ہو گئے تھے۔ خیال یہ تھا کہ بقایا خطوط جلد دوم میں درج ہو جائیں گے، لیکن طباعت کے وقت معلوم ہوا کہ ایسا ہونا مشکل ہے چنانچہ زیرِ نظر جلد میں بارہ خطوط شامل ہو سکے ہیں۔ اب بقایا خطوط تیسری جلد میں شامل ہوں گے۔

دین کی ساری عمارت خدا، رسول اور وحی کے تصوّر پر استوار ہوتی ہے۔ اگر یہ تصوّرات صحیح ہیں تو دین کے متعلق بھی صحیح تصوّر قائم ہوگا۔ اگر ان میں کوئی غلطی یا خامی ہے تو دین کا صحیح نقشہ ذہن میں نہیں آ سکتا۔ زیرِ نظر جلد میں جو خطوط شائع ہو رہے ہیں، وہ بیشتر انہی تصوّرات پر مشتمل ہیں۔ ان میں سب سے پہلے "خدا کا تصوّر" سامنے آتا ہے۔ خدا کے متعلّق عام تصوّر یہی ہے کہ وہ کائنات سے باہر، انسانی دنیا سے الگ، اپنے عرش حکومت پر بیٹھا ہے۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم اس کے احکام بجا لاتے رہیں۔ اس سے وہ خوش ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو وہ ناراض ہو کر انسانوں کو جہنّم میں ڈال دیتا ہے۔ یہ تصوّر غیر قرآنی ہے۔ اس جلد کے پہلے خط میں جو سلسلہ کے اعتبار سے اٹھارھواں خط ہے) یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رُو سے خدا کا صحیح تصوّر کیا ہے اور اس کا ہمارے ساتھ کیا تعلّق ہے؟

خدا کے بعد اس کے رسول کا مقام ہے۔ رسول کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ اُسے خدا کی طرف سے وحی عطا ہوتی ہے اور دوسری حیثیت یہ کہ وہ اس وحی کی رُو سے انسانی معاشرے کو صحیح خطوط پر متشکّل کرتا ہے۔ رسول کی یہ حیثیتیں عجیب و غریب حقائق کو سامنے لاتی ہیں جن کا تفصیلی تذکرہ اُنیسویں خط میں سامنے آئے گا۔

اس کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانوں کی راہ نمائی کے لئے یہ طریق کیوں اختیار کیا گیا کہ ایک فرد کو وحی دی گئی اور باقی انسانوں کو اس وحی پر ایمان لانے کے لئے مکلّف کر دیا گیا؟ اس سوال کا جواب بیسویں خط کے پہلے حصّے میں دیا گیا ہے۔ اس کے دوسرے حصّے میں یہ بتایا گیا ہے کہ ختم نبوّت کا فلسفہ کیا ہے؟

اکیسواں خط بھی نبوّت اور رسالت کے مقامات کی مزید تفاصیل کو اپنے آغوش میں لئے ہے اور بائیسویں خط میں اس حقیقت کو نمایاں کیا گیا ہے کہ نبی اکرمؐ کی بعثت کس طرح تمام دنیا کیلئے موجب ہزار رحمت ہے؟

تئیسویں خط میں یہ حقیقت سامنے لائی گئی ہے کہ نبی اکرمؐ پر جو درود پڑھا جاتا ہے، اس کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟

دین کی پوری عمارت "خدا اور رسول کی اطاعت" کے سہارے قائم ہوتی ہے۔ رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ میں حضورؐ کی اطاعت کا طریق واضح تھا۔ سوال یہ ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد یہ اطاعت کسطرح سے کی جائے گی؟ چوبیسواں خط اس اہم سوال کے جواب پر مشتمل ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسلامی شریعت کے چار مآخذ ہیں۔ قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔ پچیسویں خط میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان چار مآخذ کی پوزیشن کیا ہے۔ اور چھبیسواں خط یہ واضح کرتا ہے کہ اسلامی مملکت میں قانون سازی کا اصول کیا ہے۔

اسلامی مملکت میں قانون کی بنیاد، قرآن کریم کے غیر متبدل اصول ہوتے ہیں۔ ستائیسویں خط میں قرآن کی عظمت کی یاد تازہ کرائی گئی ہے۔

لیکن قرآن کو تدبّر سے سمجھا جا سکتا ہے، اندھی تقلید سے نہیں۔ اٹھائیسویں خط میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم اندھی تقلید کو کس طرح تباہیوں اور بربادیوں کا موجب قرار دیتا ہے اور علم و بصیرت اور

دانش و بینش سے کام لینے کی کتنی سخت تاکید کرتا ہے۔

اٹھائیسواں خط اس خار دار سوال کا جواب پیش کرتا ہے کہ مسلمانوں کے فرقے مٹ کر یہ قوم پھر سے کسطرح اُمّت واحدہ بن سکتی ہے؟ سوال کی اہمیت اور پیچیدگی خود اس کے جواب کی اہمیت کی دلیل ہے۔

یوں یہ تمام خطوط ایک ہی سلسلے کی کڑیاں بن جاتے ہیں۔ ان خطوط کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں کا ہر خط فی ذاتہ مکمّل ہے، لیکن جب انہیں مسلسل پڑھا جائے تو ان میں عجیب و غریب ربط نظر آتا ہے۔

تیسری جلد کے لئے حسب ذیل خطوط اس وقت موجود ہیں:

۱۔ علماء کون ہیں؟
۲۔ تصوّف کی تاریخ۔
۳۔ صوفیائے کرام۔
۴۔ تصوّف اور قرآن۔
۵۔ قوموں کے تمدّن پر جنسیات کا اثر۔
۶۔ تقدیر اُمم کیا ہے؟
۷۔ فقط ایک بار دیکھا ہے۔
۸۔ ہماری تاریخ۔
۹۔ اسلامک آئیڈیالوجی۔
۱۰۔ اسلام آگے کیوں نہ چلا؟

ہو سکتا ہے کہ طباعت کے وقت ان میں اور خطوط کا بھی اضافہ ہو جائے۔ تیسری جلد کی اشاعت کے بعد ہم اطمینان سے کہہ سکیں گے کہ دین کے متعلق جو کچھ نوجوانانِ ملّت سے اس وقت تک کہا گیا ہے، اسے ہم نے عمدہ پیکروں میں ان کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

والسلام

۵ دسمبر ۱۹۵۹ء

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

اٹھارھواں خط

خُدا کا تصوّر

ارے بابا! تم تو چاہتے ہو کہ بس اللہ میاں کو تمہارے سامنے لا کر کھڑا کر دیا جائے تو پھر تمہارا اطمینان ہو۔ غنیمت یہ ہے کہ تم جناب کلیم اللہؑ کی طرح رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ (بار الٰہا! مجھے اپنا آپ دکھا کہ تجھ سے نگاہ کامیاب ہو سکے) ہی کہتے ہو، بنی اسرائیل کی طرح یہ نہیں کہتے کہ لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَہۡرَۃً (ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو اپنے سامنے نہیں دیکھ لیں گے)۔ یہی فرق ہے ایک قلب سلیم اور ذہن سرکش میں۔

سلیم! پہلے تو یہ سمجھ لو کہ دنیا جب بھی خدا کے متعلق بات کرے گی تو وہ بات درحقیقت خدا کے متعلق نہیں ہو گی بلکہ خدا کے متعلق انسانی تصوّرات (OUR IDEAS ABOUT GOD) کی بات ہو گی۔ اس لئے کہ انسانوں کے خود ساختہ مذاہب نے خدا کا انفرادی تصوّر دیا ہے۔ یعنی ہر فرد کے ذہن میں خدا کا الگ الگ تصوّر۔ اور انفرادی تصوّر ہمیشہ داخلی (SUBJECTIVE) ہوتا ہے۔ اس لئے ہر فرد کا خدا الگ الگ ہوتا ہے۔ اس قسم کے (SUBJECTIVE GOD) کے تصوّر میں حقیقی توحید آ ہی نہیں سکتی۔ غریب کا خدا اور قسم کا ہو گا، امیر کا اور قسم کا۔ مایوس کا خدا اور قسم کا۔ کامیاب کا اور قسم کا۔ فاتح و منصور کا خدا اور قسم کا ہو گا، مفتوح و محکوم کا اور قسم کا۔ اور آگے بڑھئے تو جیمس جینز (JAMES JEANS) کا خدا اور قسم کا ہو گا، وائٹ ہیڈ کا اور قسم کا۔ حتّٰی کہ ایک ہی فرد کی مختلف حالتوں میں مختلف خدا ہوں گے۔ بیماری کی حالت کا خدا اور قسم کا ہو گا، تندرستی کی حالت کا خدا اور قسم کا۔ صفراوی غلبہ کی حالت میں خدا اور قسم کا ہو گا، بلغمی مزاج میں اور قسم کا۔ افراد سے آگے بڑھئے تو قبائلی خدا (TRIBAL GOD) کی باری آتی ہے۔ ایک جابر و سرکش قوم کا خدا اور قسم کا ہو گا، اور مظلوم و مقہور قوم کا خدا اور قسم کا۔ ٹھگوں کا خدا اور قسم کا ہو گا اور کبیر پنتھیوں کا اور قسم کا۔ بنی اسرائیل کے دورِ شوکت و سطوت کا خدا اور قسم کا تھا اور زوال و انحطاط (بیت المقدس کی بربادی اور اس کے بعد "مسیح کی پیروؤں") کے زمانہ کا خدا اور قسم کا۔ وہ جو کہا گیا ہے کہ اگر تم نے دیکھنا ہو کہ فلاں دور میں فلاں قوم کا تمدّن کیسا تھا تو یہ دیکھو کہ اس دور

ہیں اس قوم نے اپنی پرستش کے لئے کس قسم کا خدا وضع کر رکھا تھا تو وہ اسی تفصیل کی سمٹی ہوئی شکل ہے۔ انسان اپنے سے باہر کسی مجرّد (ABSTRACT) شے کا تصوّر کر ہی نہیں سکتا۔ اس لئے ذہن انسانی کا تراشیدہ خدا ہمیشہ انسانی جذبات و عواطف کا پیکر ہوتا ہے۔ جس قسم کے امیال و عواطف اور جذبات و احساسات، اسی قسم کا خدا۔ کہنے کو تو یہ کہا جاتا ہے کہ "خدا نے انسان کو اپنی شکل پر ڈھالا ہے"، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان خدا کو خود اپنی شکل پر ڈھالتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ انسان کے ہاتھ، پاؤں، سر، آنکھیں، ناک، کان، چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، خدا کے بڑے بڑے ہوں گے۔ انسان کے دو ہاتھ ہوتے ہیں خدا کے دس ہوں گے۔ انسان اپنی مٹھی میں ذرا سی چیز دبا سکتا ہے، ایشور اپنی مٹھی میں جولا مکھی پہاڑ لے سکتا ہے۔ انسان دو چار گھونٹ پانی پی سکتا ہے، دیوتا پورے کا پورا سمندر چڑھا لیتے ہیں۔ یا یہ کہ انسان غصّے میں آکر کسی ایک انسان کے تھپڑ مار دیتا ہے، خدا غصّے میں آکر قوم کی قوم کو تباہ و برباد کر دیتا ہے وقس علیٰ ہذا۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ اس قسم کے (SUBJECTIVE GOD) کا تصوّر کس قدر کمزور بنیادوں پر قائم ہوتا ہے اور کس طرح انسانی تصوّرات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جب (ALLAN GRANT) یا اسی قسم کے دیگر مغربی مصنفین یہ کہتے ہیں کہ خدا ذہن انسانی کے تدریجی ارتقاء کا پیدا کردہ ہے تو ان کا مطلب اسی قسم کے (SUBJECTIVE GOD) سے ہوتا ہے جس کا تصوّر "مذہب"[1] پیش کرتا ہے۔ اس قسم کا خدا چونکہ ذہن انسانی کا تراشیدہ ہوتا ہے، اس لئے وہ ذہن انسانی کی ارتقائی منازل کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

اب آگے بڑھو سلیم! اس قسم کے (ذہن انسانی کے پیدا کردہ) خدا کی صورت میں ایک دقّت اور بھی ہوتی ہے۔ تم نے خود ہی یہ قصّہ سنایا تھا کہ جب عمر بخش اور خداداد کا مقدمہ چل رہا تھا تو دونوں، نماز کے بعد، اپنی اپنی کامیابی کی دعائیں مانگا کرتے اور دونوں خدا کے حضور منتیں مانا کرتے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے کہ تم دیکھ لینا کہ میرا سچا خدا کس طرح میری مدد کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ان دونوں کا "خدا" ایک ہی تھا تو اس کے لئے یہ مقام کس قدر کشمکش کا ہوگا۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں اس سے مدد مانگ رہے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ بہرحال ایک ہی کے حق میں ہو سکتا تھا (اور ایک ہی کے حق میں ہوا) اگر یہ فیصلہ

---

[1] اس حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھیئے کہ مذہب کا لفظ انسانوں کے خود ساختہ مذاہب کے لئے بولا گیا ہے اور دین کا لفظ صحیح اسلام کے لئے۔

اُس کے حق میں ہوا تھا جس نے زیادہ دعائیں مانگیں اور زیادہ منّتیں مانی تھیں، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ دونوں (فریقین) "خدا" کو اپنی اپنی طرف جھکانا چاہتے تھے۔ "خدا" اس کی طرف جھک گیا جس نے زیادہ دعائیں مانگیں، یا زیادہ چڑھاوا چڑھا دیا۔ اس شکل میں سلیم! سوچو کہ معاملہ کی صورت کیا ہوئی؟ دنیا میں ہزاروں انسان ایسے ہوتے ہیں جن کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ بعض اوقات پوری کی پوری قوم، دوسری قوم کے خلاف نبرد آزما ہو جاتی ہے اور ہر قوم اپنی کامیابی کے لئے خدا سے دعائیں مانگتی ہے (تمہیں یاد ہو گا کہ دوسری جنگِ عظیم میں ہٹلر بھی خدا کا نام لے کر حملہ کیا کرتا تھا اور چرچل بھی خدا کی مدد سے اس کا جواب دیا کرتا تھا) یعنی ہزاروں بلکہ لاکھوں انسان بیک وقت "خدا" کو ایک طرف کھینچتے ہیں اور لاکھوں انسان دوسری طرف۔ اس لئے کہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ اس کا "خدا" اس کے ساتھ ہے۔ اور اس کی مدد ضرور کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ ان حالات میں (ذہنِ انسانی کا تراشیدہ) "خدا" کیا کرتا ہے؟ اگر وہ کچھ نہیں کرتا اور دنیا کے معاملات یوں ہی چلے جا رہے ہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے "خدا" کے ماننے سے حاصل کیا ہے؟ ہر شخص خدا کو اس لئے مانتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا خدا مشکلوں اور مصیبتوں میں اس کی مدد کرے گا۔ لیکن اگر اس کا خدا اس کی مدد نہیں کرتا تو وہ ایسے خدا کو مان کر کیا کرے گا؟ اور اگر خدا مدد کرتا ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عمر بخش اور خدا داد (ہٹلر اور چرچل) میں سے کس کی مدد کرتا ہے؟ اگر وہ اس کی مدد کرتا ہے جو سب سے زیادہ منّتیں مانتا ہے تو یہ وہی کھینچا تانی کا سلسلہ ہو گیا جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ مذہب (یعنی ذہن انسانی کے تراشیدہ خدا) کے سلسلے میں، پہلی منزل (FIRST STAGE) یہی منّتوں اور چڑھاووں کی ہوتی ہے۔ اس سے آگے بڑھیئے تو عصرِ سحر (MAGIC AGE) آتی ہے جس میں خاص قسم کی رسومات، خاص قسم کے ورد او روظائف (منتر جنتر) سے "خدا" کو مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ اس شخص کی مرضی کو پورا کرے۔ "صبح کے وقت ندی میں کھڑے ہو کر، سوا لاکھ مرتبہ، یہ کچھ پڑھو، مقدمہ میں کامیابی لازمی ہے"۔ یعنی اگر تم نے ایسا کر دیا تو خدا مجبور ہو گا کہ مقدّمہ کا فیصلہ تمہارے حق میں کرائے۔ اس کے برعکس اگر یہی کچھ، یا اس سے زیادہ زوردار چلّہ فریق ثانی نے کر دیا تو خدا کو اُس کے حق میں فیصلہ کرانا پڑے گا۔

یہ کیفیت ہوتی ہے سلیم! اُس وقت جب خدا انسانی ذہن کا تراشیدہ (SUBJECTIVE) قرار پا جاتا ہے۔ انسانوں کا خود ساختہ مذہب، اسی قسم کے خدا کا تصوّر پیش کرتا ہے۔ اور یہی ہے وہ خدا جس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ محض انسانی تصوّرات کی تخلیق ہے۔ یعنی یہ اعتراض کہ انسان نے اپنے لئے خود خدا بنا لیا ہے خدا درحقیقت موجود نہیں ہے۔

لیکن دین (قرآن)، خدا کے متعلق ایک جدا تصور عطا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا ذہن انسانی کا تراشیدہ نہیں، بلکہ وہ خارج میں (OBJECTIVELY) موجود ہے۔ وہ اس وقت بھی موجود تھا جب کوئی تصور کرنے والا ذہن موجود نہیں تھا اور اُس وقت بھی موجود ہوگا جب کوئی تصور کرنے والا ذہن موجود نہیں ہوگا۔ وہ موجود ہے اور اپنی خصوصیات کے ساتھ موجود ہے۔ اس کی یہ خصوصیات (جنہیں صفات "ATTRIBUTES" کہا جاتا ہے) مستقل بالذات اور موجود فی الخارج ہیں۔ وہ نہ عمر بخش کی آرزوؤں کے مطابق بدلتی ہیں نہ خدا داد کی تمناؤں کے مطابق ڈھلتی ہیں۔ نہ اُنہیں کھینچ کر اُن کی جگہ سے ہٹا سکتا ہے نہ چرچل۔ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتَابِ (نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق نہ اہل کتاب کی خواہشات کے)۔

اب یہ ظاہر ہے کہ جب خدا، ذہن انسانی کا پیدا کردہ نہیں تو ذہن انسانی اس کے متعلق کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔ ذہن انسانی تو اس چیز کے متعلق کچھ بتا سکتا ہے جس کا وہ تصور کر سکتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس خدا کے متعلق ذریعہ معلومات کیا ہے؟ یہی وہ مقام ہے جہاں وحی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یعنی وہ علم جو ذہن انسانی کا پیدا کردہ (SUBJECTIVE) نہیں بلکہ خارج سے عطا شدہ (OBJECTIVE) ہے۔ یہ علم خود خدا کی طرف سے حضرات انبیاء کرامؑ کو براہ راست ملتا ہے (یعنی ملتا تھا۔ کیونکہ اب تو سلسلۂ نبوّت ختم ہوگیا) اور اس کے ذریعے خدا اپنا تعارف آپ کراتا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھو کہ خدا نے اپنے متعلق جس قدر معلومات بہم پہنچانی تھیں، اس خارجی ذریعہ علم (وحی) کی رو سے از خود بہم پہنچا دیں۔ جس قدر اپنا تعارف کرانا تھا اس کے ذریعہ کرا دیا۔ اب دنیا میں قرآن، اسی تعارف خداوندی کا خریطہ ہے۔ انہی تعارفی تفاصیل کو صفاتِ خداوندی (ATTRIBUTES) کہتے ہیں۔ یعنی حقیقت مطلق (ABSOLUTE REALITY) کے مختلف گوشے (FACETS)۔ انہی کو قرآن کی اصطلاح میں اَلْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی کہا جاتا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس خدا سے میرا کیا تعلق ہے؟ میں اسے کیوں مانوں؟ اس پر ایمان کیوں لاؤں؟ ایک شخص کہتا ہے کہ خدا ہے۔ دوسرا کہتا ہے نہیں ہے۔ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ نہ ماننے والے میں کیا کمی رہ جاتی ہے، جو ماننے والے میں پوری ہو جاتی ہے۔ اگر خدا ہے، تو ہوا کرے۔ اگر نہیں ہے، تو نہ سہی۔ مجھے اس سے کیا واسطہ؟ یہ سوالات بڑے اہم ہیں اور جب تک ان کا اطمینان بخش جواب وجہ طمانیتِ قلب نہیں ہوتا، ایمان کی ضرورت اور اہمیت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس لئے اسے ذرا غور سے سنو! میں آج تک تمہارے اس سوال کو ٹالتا رہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ موضوع کس قدر مشکل اور دقیق ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ میں نے بات شروع کی اور تم بدکے، اور اگر بدکے نہیں تو سو ضرور جاؤ گے۔ لیکن اب جو تم نے اس قدر اصرار کیا ہے تو غور سے سنو! اس لئے کہ انسانی

زندگی پر اس کا اثر بڑا گہرا ہوتا ہے۔ خدا کا ماننا اور نہ ماننا یونہی ہنسی کی بات نہیں کہ یوں ہوگیا تو کیا اور رووں ہوگیا تو کیا؟ اس یوں اور رووں میں زندگی کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ ساری کی ساری کائنات کی بساط اُلٹ جاتی ہے۔ یہی وہ محور ہے جس کے گرد زندگی کی تمام حرکتیں گردش کرتی ہیں۔

تو اب سنو!

دنیا میں ہر شخص کے سامنے زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ بالکل حیوانوں کی سی زندگی بسر نہ کر رہا ہو۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ بننا چاہتا ہے۔ اس کے لئے ہر شخص اپنے سامنے کوئی نہ کوئی نصب العین، کوئی نہ کوئی منزل، کوئی نہ کوئی نمونہ (PATTERN) رکھتا ہے۔ کوئی امیر بننا چاہتا ہے تو اُس کے سامنے کسی بہت بڑے دولتمند کا نمونہ ہوگا۔ کوئی صاحبِ علم بننا چاہتا ہے تو اُس کے پیشِ نظر کسی ذی علم ممتاز ہستی کی مثال ہوگی۔ کوئی بہت بڑا صنعت کار بننا چاہتا ہے تو وہ اپنے سامنے یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے اربابِ صنعت و حرفت اور کارخانہ داروں کی زندگی رکھے گا۔ کوئی شجاعت اور بہادری میں نام پیدا کرنا چاہتا ہے تو اُس کے سامنے بڑے بڑے فاتح جرنیلوں کے کارنامے ہوں گے۔ لیکن یہ سب مقاصد اضافی (RELATIVE) ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص، "انسان" بننا چاہے تو اسے اپنے سامنے کونسا نمونہ (PATTERN) رکھنا چاہیئے۔

آدمی کی ایک حیثیت تو وہ ہے جسے حیوانی سطح (ANIMAL LEVEL) کہا جاتا ہے۔ اس کی حیوانی زندگی، خالص مادی پیکرِ آب و گل کی زندگی ہے، جس کا مقصد تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) اور تولیدِ نسل (PROCREATION) ہے۔ اس کے لئے نہ اسے کسی نصب العین کی ضرورت ہے نہ کسی تمثیلی نمونہ کی۔ لیکن جس چیز کو انسانیت کہا جاتا ہے وہ اس حیوانی زندگی سے الگ ہے۔ قرآن میں تخلیقِ آدم کی مختلف کڑیوں پر غور کرو! پہلے اس کی حیوانی تخلیق کے مختلف مدارج گرگنایا گیا ہے (بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ) تخلیقِ انسانی کی ابتداء بے جان مادہ سے ہوئی۔ یہ ہوئی جمادات کی زندگی۔ (ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ) پھر اس کی نسل کو بذریعہ تولید آگے بڑھایا۔ یہ حیوانات کا درجہ آگیا (ثُمَّ سَوّٰهُ) پھر اس میں خاص توازن پیدا کیا۔ یہ حیوانات سے اگلی ارتقائی منزل آئی جہاں اس نے انسان بنا ہے۔ اس کے بعد کہا (وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ) پھر اللہ نے اس میں اپنی (روح) توانائی پھونکی۔ اب یہ انسان تخاطب کے قابل ہوگیا۔ (وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ) ($\frac{32}{9-7}$) اس کے بعد تمہیں سماعت، بصارت اور قلب عطا کر دیا۔ غور کرو سلیم! ان تمام مدارجِ تخلیق میں "نفخِ روح" وہ مقام ہے جہاں سے انسانیت کی ابتدا ہوتی ہے۔ اسی کا نام انسانی ذات

(PERSONALITY) ہے۔ اسی کو اقبال "خودی" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ لہٰذا انسان نام ہے "روحِ خداوندی" کے مظہر کا۔ یعنی خدائی صفات کا حامل۔ یہ صفات ہر فرزندِ آدم (ہر آدمی) کے اندر بطور ممکناتِ زندگی (REALISABLE POSSIBILITIES) موجود ہیں۔ پیدائشی اعتبار سے ہر انسان میں یہ صفات مستتر (POTENT) ہوتی ہیں۔ ان صفات کو بارز (ACTUALISE) کرنا یا مشہود (MANIFESTED) بنانا مقصودِ آدمیت ہے۔ اسی کو خودی کی نمود یا تکمیلِ ذات کہا جاتا ہے۔ خدا کی ذات میں یہ صفات اپنی انتہائی حقیقی شکل (REALISED FORM) اور مکمل ترین صورت میں موجود ہیں۔ نہ صرف مکمل ترین صورت میں بلکہ ایسے توازن و تناسب کو لئے ہوئے جس سے بہتر اور مکمل توازن کا تصور بھی ممکن نہیں۔ اسی لئے ان صفات کو اسماء الحسنیٰ (بہترین توازن، حسن کارانہ انداز کی حامل) کہا گیا ہے۔ انسان کا اسی انداز سے اپنی صفات کو تکمیل تک پہنچانا مقصدِ حیات ہے۔

اب تم خود فیصلہ کر لو سلیم! کہ کسی فرد کو "انسان" بننے کے لئے اپنے سامنے کونسا نمونہ (PATTERN) رکھنا ہوگا؟ جواب ظاہر ہے کہ یہ نمونہ خدا کی صفات کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ انسان جن صفات کا پیکر ہے، وہی صفات اپنی مکمل ترین شکل میں، اس کی تکمیلِ ذات کے لئے نمونہ بن سکتی ہیں۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (۲/۱۳۸) "اللہ کا رنگ، جس کے رنگ سے زیادہ حسین رنگ اور کوئی نہیں"۔ یہ ہے وہ نمونہ (PATTERN) جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے ہر انسان کا مقصودِ حیات ہونا چاہیئے۔ اسے کہتے ہیں سلیم! قرآن کی اصطلاح میں "اللہ پر ایمان لانا"۔ یہ ہے وہ ایمان جس کا مطالبہ تمام نوعِ انسانی سے کیا گیا ہے، خواہ وہ پہلے اپنے طور پر خدا کو ماننے ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی لئے صِبْغَةَ اللّٰهِ کی آیت سے پہلے یہ آیت ہے فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا اگر یہ لوگ اس انداز سے اللہ پر ایمان لائیں جس انداز سے تم ایمان لائے ہو۔ تو پھر سمجھو کہ یہ زندگی کی صحیح راہ پر گامزن ہو سکیں گے۔

لہٰذا اللہ پر ایمان کے معنی ہوئے صفاتِ خداوندی کے حسین مجموعے (اسماء الحسنیٰ) کو (جن کا تعارف قرآن میں کرایا گیا ہے) اپنی زندگی کا نصب العین بنانا۔ یعنی وہ صفاتِ الٰہیہ جو حدودِ بشری کے مطابق خود انسان کے اندر مضمر ہیں انہیں مشہود کرتے چلے جانا، یہ مضمر (LATENT) یا (POTENTIAL) صفات جس قدر مشہود (ACTUALISE) ہوتی جائیں گی، "انسان" خدا کے قریب" ہوتا جائے گا۔ جب یہ تمام صفات اپنی آخری انسانی حد تک مشہود ہو جائیں گی۔ تو "انسان اپنے رب تک پہنچ جائے گا"۔ قرآن نے انسانی زندگی کے نصب العین (GOAL) کو ان ہی الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (۵۳/۴۲)۔ اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ اس سے انسان

خود خدا نہیں بن جاتا۔ خدا لامحدود (INFINITE) ہے، انسان محدود (FINITE) اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی محدود، لامحدود نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا خدا کے قرب کے معنی ہیں ' انسان کا بحد بشریت صفاتِ خداوندی کا اپنے اندر منعکس کرنا۔ اور وہ بھی ان صفات کا جن کا انعکاس ایک محدود کے لئے ممکن ہو۔

غور کرو سلیم!

۱۔ چونکہ انسان، صفاتِ خداوندی (روحِ خداوندی) کا حامل ہے اس لئے اس کی تکمیلِ ذات کے لئے نمونہ صرف خدا کی صفات ہو سکتی ہیں۔

۲۔ اور یہ صفاتِ خداوندی، ہر فردِ انسانیہ کے لئے نمونہ ہوں گی۔ یعنی تمام نوعِ انسانی کے سامنے ایک ہی نمونہ (PATTERN) کیونکہ ہر انسان ان ہی صفات کا حامل ہے۔

اسے "توحید" کہتے ہیں۔ یعنی انسانی زندگی کے لئے صرف ایک نمونہ، ایک نصب العین ہونا۔ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَـهٗ۔

اور یہ نصب العین اس خدا کی صفات کا ہو سکتا ہے جس کا تعارف خود خدا نے وحی کی رو سے کرایا ہو (نہ کہ ذہنِ انسانی کا تراشیدہ خدا)۔ اس لئے دنیا کے ہر انسان کے لئے اس خدا پر ایمان لانا (یعنی اسے نصب العینِ حیات بنانا) ضروری ہے جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔ یہ اس لئے کہ وحی اپنی اصلی اور خالص شکل میں قرآن کے سوا اور کہیں موجود نہیں (دنیا کے تمام مذاہب کے متبعین اس حقیقت کے معترف ہیں کہ ان کے ہاں وحی اپنی اصلی اور غیر مخلوط شکل میں موجود نہیں۔ تفصیل اس کی میری کتاب "مبینہ آسمانی کتابوں کی تاریخ" میں ملے گی۔

اور چونکہ قرآن کے سوا خدا کا صحیح تعارف و تصور کہیں اور نہیں مل سکتا۔ اس لئے قرآن کا پیغام تمام دنیا میں بےمثل و بےنظیر ہے۔ ذہنِ انسانی کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اس خدا کا تصور پیدا کر سکے جسے قرآن نے پیش کیا ہے اس لئے کہ (جیسا کہ تم اوپر دیکھ چکے ہو) ذہنِ انسانی کے پیدا کردہ خدا کا تصور، انفرادی اور (SUBJECTIVE) ہوتا ہے، موجود فی الخارج (OBJECTIVE) خدا کا تصور نہیں ہوتا۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھو!

دنیا میں کوئی دو انسان جب اپنی زندگی کا نصب العین ایک ہی مقرر کر لیں۔ یعنی ان کے سامنے نمونہ (PATTERN) ایک ہی ہو، تو ان انسانوں میں قلب و نگاہ کی ہم آہنگی کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ اسی کا نام وحدتِ فکر

نظر ہے۔ لہٰذا جب تمام نوعِ انسانی کے سامنے ایک ہی نمونہ (PATTERN) ہو تو تمام افرادِ انسانیہ میں وحدت فکر و نظر پیدا ہو جائے گی۔ بالفاظ دیگر، توحید کا لازمی نتیجہ وحدتِ انسانیت ہے، اس کے سوا وحدتِ انسانیت کا اور کوئی ذریعہ نہیں اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (۲۳/۵۲)۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ہم نے خدا کی صفات کو اپنے سامنے بطور نمونہ (PATTERN) رکھا ہے تو ان صفات، یا اسماء الحسنیٰ (VARIOUS ASPECTS OF REALITY) کے متعلق ہمیں پوری پوری معلومات ہونی چاہئیں تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ ہم میں کون کون سی صفات نشو و نما پا رہی ہیں اور کون سی صفات ہنوز خوابیدہ یا خام ہیں۔ اس کا نام ہے تعلیم الکتاب یعنی قرآن کا علم۔ علم سے مراد محض کتاب کا پڑھ لینا نہیں، بلکہ اس کے نقوش کو دل کی گہرائیوں میں مرتسم کر لینا ہے۔

اس سے تم سمجھ گئے ہو گے کہ دین میں خدا پر ایمان کی اہمیت کیا ہے؟ یہ وہ بنیاد ہے جس پر انسانی زندگی کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے اور چونکہ دین نام ہی اس اسلوب و انداز کا ہے جس کے مطابق زندگی بسر کی جائے اس لئے خدا پر ایمان کے بغیر صحیح زندگی بسر کرنے کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ جس قسم کا نمونہ (PATTERN) اسی قسم کی انسانی زندگی۔ جس قسم کا نصب العین، اسی قسم کے اعمال۔ اس لئے کہ عمل نام ہے حصولِ نصب العین کے لئے جدوجہد کا۔ یہاں ذریعہ اور مقصد (MEANS AND ENDS) میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ تمہیں یاد ہے سلیم! اگلے دنوں تم نے (FERDINAND LASSALLE) کا ایک اقتباس نقل کیا تھا جس میں وہ کہتا ہے کہ:

> ایسا نہ ہو کہ ہمیں نصب العین کا پتہ تو دے دو لیکن اس تک پہنچنے کی راہ نہ بتاؤ۔
>
> اس لئے کہ دنیا میں ذرائع اور مقاصد اس طرح باہمدگر گتھے ہوئے ہیں کہ اگر ایک کو بدل دیا جائے تو دوسرا خود بخود بدل جاتا ہے۔ ہر مختلف راہ، مختلف منزل کی نشان دہی کرتی ہے۔

اس لئے خدا پر صحیح ایمان ہی، صحیح اعمال کا موجب بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ اگر خدا پر صحیح ایمان نہیں تو تمہارے اعمال کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے۔ یہ، ہر رنگ کی "خدا پرستی" میں "نیک عملی" کی راہیں بتانے والے "برہمو سماجی مسلمان[1]"، کیا جانیں کہ قرآن کی رو سے "خدا پرستی" کسے کہتے ہیں اور "نیک عملی" کیا

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کی یہی تعلیم تھی۔ دیکھئے ان کی تفسیر ترجمان القرآن کی جلد اوّل میں سورہ فاتحہ کی تفسیر۔

ہوتی ہے؟ یاد رکھو سلیم! سفر اور آوارگی، دونوں میں قدم تو یکساں اُٹھتے ہیں، لیکن ایک میں ہر قدم جانب منزل اُٹھتا ہے۔ اس لئے کچھ وقت کے بعد مسافر منزل تک پہنچ جاتا ہے اور دوسرے میں فقط قدم اُٹھتے ہیں، منزل کوئی بھی سامنے نہیں ہوتی۔ اس لئے اس میں سوائے تکان اور درماندگی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ۔

اس مقام پر اس اہم حقیقت کو بھی سمجھ لو کہ انسان کے اندر ان صفاتِ خداوندی کی تربیت تکمیل اور نشوونما معاشرے (اجتماعی نظام) کے بغیر ناممکن ہے۔ خودی (انسانی ذات، یا انسان کے اندر صفاتِ خداوندی) کی بیداری اور نمود کا مقام ہی وہ ہوتا ہے جب انسان کا واسطہ کسی دوسرے انسان سے پڑے۔ اور یہی وہ محک (کسوٹی) ہے جس پر انسان اس حقیقت کو پرکھ سکتا ہے کہ اس کی خودی کس حد تک بیدار ہو چکی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسانی خودی (PERSONALITY) اپنی ذات میں منفرد (UNIQUE) ہے لیکن اس کی تربیت ہمیشہ اجتماعی نظام میں ہوتی ہے۔ بقول اقبالؒ ؎

زندگی انجمن آرا و نگہ دارِ خود است

ایکہ در قافلۂ با ہمہ رَو بے ہمہ شو

یہ "بے ہمہ شدن" انسانی ذات کی انفرادیت ہے (کیونکہ انفرادیت، خودی کی بنیادی خصوصیت ہوتی ہے) اور "با ہمہ رفتن" جماعتی زندگی ہے جس کے بغیر تربیتِ خودی ناممکن ہے۔ اسی لئے قرآن، انسانی تکمیلِ ذات کے لئے اجتماعی زندگی کو لاینفک قرار دیتا ہے۔ اس کے لئے وہ ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں ہر فرد، دوسرے فرد کی خودی کی ربوبیّت (پرورش، تکمیل و نمود) کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہ معاشرہ ربّانیوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کے صرف بدن ہی ایک جگہ نہیں ہوتے، بلکہ قلوب باہمد گر پیوست ہوتے ہیں۔ اس معاشرے میں ہر فرد، دوسرے کے لئے جیتا ہے اور اسے ہر مقام پر اپنی ذات پر ترجیح دیتا ہے۔ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ (59/9)۔ اس قسم کا باہمی ربط (یعنی ایسے معاشرے کی تشکیل) بھی صرف اس ایمان کے ذریعہ ممکن ہے جس کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے۔ یعنی اس امر کا یقینِ محکم کہ تمام معاشرے کا نصب العین ایک ہے اور ہر فرد، دوسرے فرد کی پرورش اور نشوونما کو اپنا فریضۂ زندگی سمجھتا ہے۔

اس مقام پر تمہارے دل میں لازماً یہ خیال پیدا ہوگا کہ کیا خدا کا ہمارے ساتھ اتنا ہی تعلق ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کی تکمیل کے لئے اُس کی صفات کو بطورِ نمونہ سامنے رکھا ہے؟ اتنا ہی تعلق نہیں۔ یہ تو اُس تعلق کا صرف ایک گوشہ ہے، اب دوسرا گوشہ تمہارے سامنے آتا ہے۔ لیکن دیکھنا کہیں پھر سو نہ جانا۔ بات بڑی اہم ہو رہی ہے۔

ذات (PERSONALITY) کی خصوصیتِ کبریٰ (MAIN CHARACTERISTIC) استغناء (INDEPENDENCE) اور حرّیت و صمدیت (FREEDOM) ہے۔ استغناء، یعنی بغیر کسی خارجی سہارے کے، از خود موجود رہنا، اپنی ذات میں کسی کا محتاج نہ ہونا، اور حرّیت، کامل اختیار و ارادہ کا مالک ہونا۔ خدا، جو ذاتِ مطلق ہے، وہ انتہائی شکل میں "غنیٌّ حمید" اور "صمد" ہے۔ لیکن ہر ذات (PERSONALITY) اپنی نمود کے لئے، خود اپنے اُوپر کچھ قیود (SELF-IMPOSED LIMITATIONS) عائد کر لیتی ہے۔ خدا نے بھی اپنے اُوپر کچھ "قیود" عائد کر رکھی ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ (۶/۱۲) "اللہ نے اشیائے کائنات کی ربوبیّت و حفاظت اپنے اوپر لازم قرار دے رکھی ہے"۔ یہ "کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہٖ" (اپنے اوپر لازم قرار دے لینا) وہی خود عائد کردہ پابندی کی مثال ہے۔ ان قیود سے مقصد یہ ہے کہ کائنات کی نشوونما کے لئے جس قسم کا تقاضا ہو خدا کی طرف سے، اسی قسم کی صفت کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اس مشکل مقام کو سمجھنے کے لئے تم یہ کہہ لو کہ خاص حالات میں خدا کی طرف سے خاص ردِّ عمل (REACTION) ہوتا ہے۔ اسے قانونِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ یعنی جیسے حالات، اسی کے مطابق صفتِ خداوندی کا ظہور۔ اور چونکہ صفاتِ خداوندی غیر متبدّل ہیں اس لئے قانونِ خداوندی بھی غیر متبدّل، اٹل اور عالمگیر ہوتا ہے۔ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (قانونِ خداوندی میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی)۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَحْوِیْلًا (قانونِ خداوندی میں تبدّل و تحوّل ہرگز نہ دیکھو گے)۔ خارجی کائنات میں خدا کا یہ قانون ہر شے میں از خود جاری و ساری ہے۔ ان اشیاء کو اس میں کسی قسم کا دخل و اختیار نہیں۔ کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوْنَ (سب اس کے سامنے جھکی ہوئی ہیں)۔ لیکن انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو قانونِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے تو اس سے انکار کر دے۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ۔ یعنی انسان کو اس پر اختیار ہے کہ جس قسم کا جی چاہے عمل کرے۔ لیکن اسے اس پر اختیار نہیں کہ عمل ایک قسم کا کرے اور نتیجہ دوسری قسم کا پیدا ہو۔ جیسا عمل اُسی کے مطابق نتیجہ۔ اس لئے کہ جس قسم کا عمل انسان کی طرف سے

ہوتا ہے اسی قسم کی صفت خداوندی کا ظہور بطور ردِ عمل ہو جاتا ہے، اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ قرآن میں دیکھو ہر مقام پر تمہیں دکھائی دے گا کہ "اگر یوں کرو گے تو خدا یوں کرے گا"؛ یعنی اگر یہ کرو گے تو خدا کا قانون یہ نتیجہ پیدا کر دے گا۔ اگر وہ کرو گے تو وہ نتیجہ مرتب ہوگا۔ تمہارے ہر عمل کے مطابق خدا کی ایک خاص صفت کا ظہور ہوگا۔ مثلاً خدا کی صفت، ہادی، راہنمائی کرنے والا ہے۔ اس کے متعلق فرمایا کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹) جو لوگ ہماری راہ کی تلاش میں جد وجہد کریں گے ہم انہیں اپنی راہوں کی طرف راہنمائی کر دیں گے۔ یعنی اگر کسی انسان کی طرف سے راستہ کی تلاش کی جد وجہد ہوگی تو ادھر سے خدا کی صفت ہدایت کا ظہور ہوگا۔ یا مثلاً وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۷/۹۶) "اگر بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے، تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکات کے دروازے کھول دیتے"؛ یعنی اگر ان کی طرف سے ایسا ہوتا تو خدا کی صفت رزاقیت موجیں مارتی ہوئی جلوہ بار ہو جاتی۔ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۷/۹۶) "لیکن انہوں نے اس قانون کی تکذیب کی تو ہم نے انہیں ان کے اعمال کی سزا میں پکڑ لیا"۔ "انہوں نے یہ کیا تو ہم نے یہ کیا"۔ یہ ہے قانونِ خداوندی جسے قرآن کی اصطلاح میں "مشیئت" کہا جاتا ہے۔ قرآن نے تفصیلاً بتا دیا ہے اور بار بار دُہرا کر بتا دیا ہے کہ اگر چاہتے ہو کہ خدا کی فلاں صفت کا ظہور ہو تو اس کے لئے یہ کرو۔

تم دیکھ چکے ہو سلیم! کہ جس خدا کا تصور مذہب پیش کرتا ہے (یعنی ذہن انسانی کا تراشیدہ خدا) اس میں خدا ہر فرد کی آرزوؤں کے مطابق ڈھلتا ہے۔ اس لئے اس "خدا" کو ہر فرد اپنی طرف جھکانا چاہتا ہے۔ سمرجنش اپنی طرف خدا داد اپنی طرف۔ ہر مقدمے میں، مدعی اپنی طرف، مدعا علیہ اپنی طرف مستغیث اپنی طرف، ملزم اپنی طرف۔ تم نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس کھینچا تانی میں "خدا کا" کیا نقشہ بنتا ہے۔ لیکن دین میں خدا کا تصور ایک عالمگیر، اٹل اور غیر متبدل قانون ساز کا تصور ہے، جو اپنی جگہ پر قائم ہے اور کسی کی طرف نہیں جھکتا۔ ہر عمل الٰہی قانون کے مطابق نتیجہ خیز ہوتا ہے اور نتیجہ ٹھیک ٹھیک عمل کے مطابق مرتب ہوتا ہے، نہ کم نہ زیادہ۔ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۳/۱۶۱)۔ جو انسان جس قسم کا نتیجہ چاہتا ہے وہ خود اس کے مطابق بن جائے، نتیجہ مرتب ہو جائے گا۔ سے

رمز باریکے بحرفے مضمر است　　　تو اگر دیگر شوی او دیگر است

جو کسان چاہتا ہے کہ اس کا کھیت سیراب ہو اسے اپنا کھیت پانی کے نشیب کی طرف بنانا ہوگا۔ اس لئے کہ پانی کا عام

قانون، نشیب کی طرف بہنا ہے۔ جس نے اپنے کھیت کو پانی کے عالمگیر قانون سے ہم آہنگ کر لیا اس کے سامنے جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کا منظر آجائے گا۔ جس نے اسے فراز کی طرف رکھا۔ (یعنی قانونِ خداوندی سے انکار کیا اور سرکشی برتی (اسے کفر وعصیاں کہتے ہیں) ۔ وہ سیرابیوں اور شادابیوں سے محروم رہ گیا۔ اس میں نہ کسی کشمکش کی گنجائش ہے، نہ کھینچا تانی کا امکان ۔ نہ کسی کی سفارش کا کوئی سوال ہے نہ خوشامد کا ۔ قانونِ خداوندی کے یہ طے شدہ فیصلے ہیں، جسے قضا کہتے ہیں اور یہ تم جانتے ہی ہو کہ قضا بدلا نہیں کرتی ۔

یہاں تک خدا کے قانون کی محکمیت (غیر متبدل ہونے) کے متعلق گفتگو تھی ۔ اب اس کی عالمگیریت پر غور کرو۔ جس طرح عالمِ آفاق میں خدا کا قانون ہر جگہ یکساں طور پر جاری و ساری ہے، اسی طرح عالم انسانی میں بھی اس کا قانون ہر مقام پر یکساں نتائج پیدا کرتا ہے ۔ آگ، قطب شمالی کے اسکیمو کے لئے بھی اسی طرح وجۂ تپش ہے جس طرح افریقہ کے حبشی کے لئے ۔ ہوا ملکۂ برطانیہ کی ناک میں بھی اسی طرح جاتی ہے جس طرح تبّت کے چرواہے کی ناک میں ۔ اس میں نہ جغرافیائی حدود وقیود کی کوئی تخصیص ہے، نہ رنگ اور خون کی کوئی تمیز ۔ نہ دولت و ثروت کا کوئی لحاظ ہے نہ منصب و جاہ کی کوئی رعایت ۔ یہ قوانین نہ قبائلی ہیں نہ قومی ۔ نہ وطنی ہیں نہ نسلی ۔ جو کیفیت ان طبعی قوانین کی ہے وہی حالت اس قانون کی ہے جو عالمِ انسانیت کے متعلق ہے ۔ یہ قانون بھی تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں ہے ۔ یعنی وہ خدا جس کا تصوّر اُوپر دیا گیا ہے، ربّ العالمین ہے ۔ ربّ النّاس ہے، ملک النّاس ہے، الٰہ النّاس ہے ۔ دنیا کے کسی خطے میں، کسی قوم، کسی نسل، کسی رنگ کا انسان ہو، جو بھی اس خدا کو اپنا (PATTERN) بنالے گا، جو بھی اس کے قانون سے ہم آہنگی اختیار کرلے گا، وہ ربّانی بن جائے گا ۔ یہ ہے ربّانیوں کی وہ جماعت، جو قومیت، وطنیت، خون، رنگ، نسل کے اضافی رشتوں سے بالا ہو کر، فی الحقیقت ایک ملّتِ واحدہ بنتی ہے ۔ اسی لئے قرآن اس جماعت کو فقط "مومنین" کہہ کر پکارتا ہے کیونکہ ان سب میں وجۂ جامعیت اور سببِ اشتراک، اس قانون پر ایمان ہے ۔ یہی ایمان ان کی وحدت کی بنیاد ہے ۔ یعنی ساری دنیا میں ایک (PATTERN) کے مطابق زندگی بسر کرنے والے، ایک رنگ میں رنگے ہوئے، ایک قانون کو تسلیم کرنے والے انسانوں کی جماعت ۔ یہ ہیں اُس خدا کو ماننے والے افراد جس کا تصوّر، دین (قرآن) نے عطا کیا ہے ۔ وہ خدا ہر فرد سے یکساں فاصلے پر ہے، جس طرح دائرے کا مرکزی نقطہ، محیط کے ہر نقطے سے یکساں فاصلے پر ہوتا ہے ۔ جو انسان اسے اپنا (PATTERN) بنالے وہ اسے اپنے نزدیک پائے گا۔ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ (۲/۱۸۶) ۔ "میرے بندے جب میرے متعلق سوال کریں تو کہہ دے کہ میں اُن سے قریب ہوں"۔ اُن کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ۔ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ)

جو شخص اس کے قانون کو اپنی زندگی میں اپنا راہنما بنائے گا، وہ قانون ہر وقت اس کا ساتھ دے گا۔ وہ جس وقت اس قانون کو پکارے گا وہ قانون اس کی پکار کا جواب دے گا۔ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (۲/۱۸۶) "میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں" عالمگیر قانون کا یہی خاصہ ہونا چاہیئے۔ عالمگیر ہونے کے علاوہ وہ قانون باریک بیں بھی ایسا ہے کہ دل میں گزرنے والے خیالات اور نگاہوں میں بھر جانے والے تصورات تک بھی اس کی گرفت سے باہر نہیں۔ اس کی نتیجہ خیزی کا یہ عالم ہے کہ قلب و جوارح کی کوئی خفیف سی حرکت بھی ایسی نہیں جس کا اثر مرتب ہونے سے رہ جائے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔ غور کرو سلیم! ایسے خدا پر ایمان (یعنی ایسے قانون کی محکمیت پر یقین) انسان کے دل میں کتنی بڑی خود اعتمادی پیدا کر دیتا ہے۔ اگر وہ اس قانون کے مطابق کام کر رہا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کے دل میں وسوسہ انداز نہیں ہو سکتی کہ اس کی محنت رائیگاں جائے گی یا اس سے وہ نتیجہ مرتّب نہیں ہوگا جو اس کے پیشِ نظر ہے۔ دنیا بھر کی مخالفتیں اس کے دل میں یہ خدشہ نہیں پیدا کر سکیں گی کہ وہ ناکام رہ جائے گا۔ اس لئے خوف اس کے پاس نہیں پھٹکے گا، حزن اس کے قریب نہیں آئے گا۔ وہ ان حالات میں بھی جہاں عام سطح بین انسانوں کو امید کی کوئی کرن نظر نہ آتی ہو، دل کے پورے اطمینان کے ساتھ، تبسّم فشانیوں کے جلو میں کہہ دے گا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (۹/۴۰)۔ "مت گھبراؤ ہمیں ناکامی کیسے ہو سکتی ہے، جب کہ ہم قانونِ خداوندی کے مطابق چل رہے ہیں" ایسے انسان کو اگر سفرِ زندگی میں کہیں ناکامی ہوتی ہے تو وہ گھبرا کر خودکشی نہیں کر لیتا، بلکہ وہیں رُک جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس کا قدم کس مقام سے قانونِ خداوندی کی راہ سے ہٹ گیا ہے۔ چونکہ قانونِ خداوندی نہایت واضح صورت میں اس کے سامنے ہوتا ہے اس لئے اس امر کے تعین میں بھی کچھ مشکل نہیں ہوتی کہ اس کا قدم کہاں سے غلط سمت کی طرف اُٹھ گیا تھا۔ وہ اس غلطی کو متعین کر کے لوٹتا ہے اور پھر اُس دوراہے پر آ جاتا ہے جہاں سے اس نے صحیح راہ چھوڑی تھی (اسے توبہ کہتے ہیں) اور اس کے بعد پھر قانونِ خداوندی کے صراطِ مستقیم پر چل نکلتا ہے۔

کہو سلیم! اس خدا پر ایمان، انسان کے دل میں خدا کی صحیح قدر و قیمت پیدا کرتا ہے یا اُس خدا پر ایمان، جسے انسان نے اپنے ذہن سے تراشا تھا اور جس کے حضور منّتیں مان مان کر عمر بخش اور خداداد، دونوں اپنے اپنے حق میں مقدمہ کا فیصلہ چاہتے تھے۔ وہ "خدا"، جب انسان کی مدد نہیں کرتا تو انسان اس کے ماننے سے انکار کر دیتا ہے (اور انکار کرنا بھی چاہیئے) لیکن یہ خدا (یعنی دین کا خدائے حقیقی جس کا ہمہ گیر قانون اس محکمیت کے ساتھ کارفرما ہے)

اگر کسی کی "مدد نہیں کرتا" تو اس کا ماننے والا اپنے یقین کو اور پختہ کر لیتا اور سمجھ لیتا ہے کہ ناکامی اس لئے ہوئی ہے کہ اس کے ہاتھوں سے خدا (کے قانون) کا دامن چھوٹ گیا ہے۔ یعنی اس کی کامیابی اور ناکامی دونوں خدا (کے قانون) پر ایمان میں پختگی پیدا کرنے کا موجب بنتی ہیں۔

یہیں سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس خدا (کے قانون) پر ایمان سے وہ باہمی کشمکش بھی ختم ہو جاتی ہے جو ذہن انسانی کے تراشیدہ، انفرادی خدا کے ماننے والوں میں پیدا ہوتی ہے۔ انفرادی خدا کی صورت میں، عمر بخش اور خدا داد، دونوں اپنی اپنی جگہ خدا کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ لیکن خدا کے قانون پر ایمان رکھنے کی صورت میں خدا کی مدد اس کے ساتھ ہی ہو سکتی ہے جو خدا کے قانون سے ہم آہنگ ہو۔ اگر عمر بخش اور خدا داد میں باہمی تنازعہ یا منافقت ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو وہ دونوں خدا کے قانون سے الگ ہیں یا ان میں سے (کم از کم) ایک ضرور اس قانون سے مختلف راہ پر گامزن ہے۔ جو شخص خدا کے قانون سے ہم آہنگ نہیں اسے اس قانون سے مدد مانگنے کا حق نہیں۔ اور اگر وہ زبان سے اس کی مدد مانگتا بھی ہے تو بھی اسے اس کی مدد نہیں مل سکتی۔ اس قانون کی تائید و نصرت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ بھی اس قانون سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اگر وہ بھی اس قانون سے ہم آہنگ ہو گیا تو دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو گئے۔ اس لئے ان کا تنازعہ خود بخود رفع ہو گیا (تم نے سلیم! اسکول میں جیومیٹری کا یہ قاعدہ تو پڑھا ہی ہو گا کہ جو چیزیں کسی ایک چیز کے برابر ہوں وہ آپس میں بھی برابر ہوتی ہیں)۔ عمر بخش قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ تھا لیکن خدا داد نہیں تھا اس لئے ان دونوں میں اختلاف و تنازعہ کی صورت تھی۔ جب خدا داد بھی اس سے ہم آہنگ ہو گیا تو ان میں کوئی اختلاف یا تنازعہ باقی نہ رہا۔ معاملہ صاف ہو گیا۔

اب تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہو گا کہ خارجی کائنات میں خدا کا یہ قانون نہایت واضح، بیّن، محکم اور مشہود انداز میں جاری و ساری ہے۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں اس قانون کی کارفرمائی کہیں نظر نہیں آتی، بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ مثلاً خدا کا قانون یہ ہے کہ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۲۱)۔ جو قوم حقوقِ انسانیت میں کمی کرے اس کی کھیتی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ظالمین پھولتے پھلتے چلے جاتے ہیں اور حقوق کی رعایت رکھنے والے (دیانت دار اور عدل پسند) لوگ ہر جگہ مات کھاتے ہیں۔ آج دنیا کا یہی چلن ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بڑی توجہ سے سمجھنے کے قابل۔ اس مقام پر ٹھوکر کھا جانے سے بڑے بڑے اربابِ عقل و فکر کے پاؤں میں لغزش آ جاتی ہے۔ تمہیں سمجھانے کے لئے ایک دقت یہ بھی ہوتی ہے کہ تم سے

فلسفیانہ اصطلاحات میں گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ تمہیں میں نے ہزار بار کہا کہ زیادہ نہیں تو فلسفہ کی مبادیات سے واقفیت حاصل کر لو، لیکن تم نے ایک نہیں سُنی۔ لیکن تم سنو بھی کیوں؟ تمہیں کوئی دِقت ہو تو سنو بھی مصیبت تو میرے لئے ہوتی ہے کہ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ اس لئے جو بات میں چار لفظوں میں بیان کر سکتا ہوں، تمہارے لئے چار صفحے لکھنے پڑتے ہیں۔ بہرحال سنو، اور سمجھنے کی کوشش کرو۔

قانونِ کائنات کی بعض موٹی موٹی باتیں ایسی ہیں جنہیں ہم ہر وقت کارفرما دیکھتے ہیں۔ پانی نشیب کی طرف بہتا ہے۔ آگ حرارت پہنچاتی ہے۔ زمین کی کشش ثقل سے چیزیں نیچے کی طرف گرتی ہیں۔ ہوا سے ہلکی چیز اُوپر کی طرف جاتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس قانون کا وہ حصہ جو ان بدیہیات سے کہیں اہم، نازک اور دقیق ہے ایسا ہے کہ اس کے نتائج یوں ہی دیکھتے دیکھتے سامنے نہیں آجاتے۔ نظریۂ ارتقاء (EVOLUTION) کے ماہرین سے پوچھئے۔ وہ بتائیں گے کہ کسی ایک نوع میں ذراسی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے قدرت کو کس طرح ہزارہا سال تک کروٹیں بدلنی پڑتی ہیں۔ ارتقائی مراحل اس قدر سست رفتاری سے طے ہوتے ہیں کہ گھڑی کی گھنٹوں والی سوئی کی طرح ان کی رفتار محسوس ہی نہیں ہوسکتی۔ یہ رفتار وہ ہے جس کے پیمانوں کے متعلق قرآن میں ہے کہ خدا کا ایک ایک یوم تمہارے حساب وشمار کی رو سے ہزار ہزار اور پچاس پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ اس لئے ارتقائی تبدیلیوں کو نہ کوئی آنکھ دیکھ سکتی ہے نہ کسی ایک فرد کا دماغ محسوس کر سکتا ہے۔ ایک فرد کیا، دس دس، بیس بیس نسلوں (GENERATIONS) تک بھی یہ تبدیلیاں محسوس شکل میں سامنے نہیں آتیں۔ تبدّل و تحوّل کے اس قانون کو تدریج و امہال کا قانون کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی تبدیلی کی پہلی حالت سے آخری حالت تک درمیانی وقفہ۔ تبدیلی تو درحقیقت نقطۂ اوّلین سے شروع ہو جاتی ہے لیکن ہم اسے اس وقت محسوس کرتے ہیں جب وہ مکمل ہو کر مشہود و مرئی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ تمہیں یاد ہے، گزشتہ سردیوں میں جب تم نے پانی چولھے پر رکھا تھا اور میں نے پانچ منٹ کے بعد پوچھا تھا کہ کیا پانی گرم ہو گیا، تو تم نے کہا تھا کہ ابھی کہاں؟ اس پر میں نے کہا تھا کہ سلیم! بات سوچ کر کرو۔ اس پانچ منٹ میں پانی یقیناً گرم ہو گیا ہے، لیکن تم اس گرمی کو محسوس نہیں کر رہے۔ تھرمامیٹر رکھ کر دیکھو، اس کی گرمی محسوس ہو جائے گی۔ اسی کا نام قانونِ تدریج و امہال ہے۔ یعنی تبدیلی کا تبدریج واقعہ ہونا، عمل اور نتیجہ کے درمیان مہلت کا وقفہ ہونا۔ اسی کو تاجیل بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی تبدیلی کے ظہور کی مدتِ معینہ۔ وہ میعاد جس میں قطرہ گہر بن جائے۔

جس طرح عالمِ آفاق (PHYSICAL UNIVERSE) میں یہ قانون جاری وساری ہے، اسی طرح عالمِ انسانی

(یا عالم معنویات) میں بھی یہی قانون کارفرما ہے۔ عمل اور اس کے نتیجے کے درمیان انتظار کا وقفہ لازمی ہے۔ قُلْ فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ) ۔ اور جس طرح مادی دنیا میں انتظار کے اس وقفے کے پیمانے بہت وسیع ہیں، اسی طرح نتائج اعمال کے وقفے بھی بہت طول طویل ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے کہ وَیَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر قانونِ خداوندی کے خلاف چلنے سے تباہی و بربادی آتی ہے، تو کہاں ہے وہ تباہی و بربادی؟ ان سے کہو کہ وَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۔ ذرا انتظار کرو اللہ کا قانون اٹل ہے۔ اس کے نزدیک نتائج میں کبھی کوتاہی نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس کے لئے اس کے پیمانے مختلف ہیں۔ وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۲۲/۴۷)۔ قانونِ خداوندی کے حساب و شمار میں ایک دن، تمہارے ہاں کے ہزار برس کے برابر ہوتا ہے۔ اسی میعاد کو قرآن اجلِ مسمّٰی اور اجلِ معدودہ کی اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ایک اور حقیقت بھی ہے۔ عالم آفاق میں ہر شے قانون کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لئے وہ اس اجلِ مسمّٰی (مدتِ معیّنہ) کو گھٹا بڑھا نہیں سکتی۔ یا یوں کہئے کہ وہ قانون کی نتیجہ خیزی کی رفتار میں کمی بیشی نہیں کرسکتی۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں اس کا بھی امکان ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ قانون نام ہے، کسی خاص واقعہ پر، خدا کی ایک خاص صفت کے مشہود ہونے کا۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ خود انسانوں کے اندر بھی (اپنے پیمانے پر) یہی صفات موجود ہیں۔ اور اگر ان کی تربیت و پرورش ہو جائے تو یہ بھی صفاتِ خداوندی کی طرح مشہود ہوتی اور وہی نتائج پیدا کرتی ہیں۔

اگر انسانوں کا ایسا معاشرہ قائم ہو جائے جس میں افرادِ معاشرہ کی یہ صفات تربیت پا کر، صفاتِ خداوندی کی طرح، خاص موقعہ پر مشہود ہوتی رہیں تو قانونِ خداوندی کی اثر انگیزی اور نتیجہ خیزی کی رفتار کئی گنا زیادہ ہو جائے گی۔ یعنی جب انسانوں کی صحیح قوتیں، قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جائیں، تو یہ قانون اپنی نتیجہ خیزی میں بہت تیز رفتار (سَرِیْعُ الْحِسَابِ) ہو جاتا ہے۔ یہی مفہوم ہے سلیم! قرآن کی اس آیت کا کہ۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ " اگر تم قانونِ خداوندی کی مدد کرو گے تو وہ قانون تمہاری مدد کرے گا"۔ یہی وہ مقام تھا جس کی طرف (جنگ بدر میں) ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا کہ "تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم خود چلا رہے تھے"۔ قرآنی معاشرہ کے افراد اور قانون خداوندی کی اس رفاقت کو قرآن نے "نزولِ ملائکہ" سے تعبیر کیا ہے۔ جنگِ بدر میں ان ہی ملائکہ کے نزول کا ذکر ہے۔ اور اسی طرح عام حالات میں بھی جہاں فرمایا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ

اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَآئِكَةُ (۴۱/۳۰) "جو لوگ ایک دفعہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر عزم کر کھڑے ہو جاتے ہیں، تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے" ملائکہ وہ قوتیں ہیں جو قانونِ خداوندی کے مطابق، اعمال کو نتیجہ خیز بناتی ہیں۔ قرآنی معاشرے میں، افرادِ معاشرہ کی تربیت یافتہ صفات (روحِ خداوندی) اور ان (ملکوتی) قوتوں میں باہمی توافق ہو جاتا ہے اور اس طرح اس قانون کی نتیجہ خیزی کی رفتار تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے اور نتائج بہت جلد سامنے آجاتے ہیں۔ اتنے جلد کہ یہ جماعت، اپنے فریق مقابل سے، پوری خود اعتمادی سے کہہ سکتی ہے کہ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ إِنِّيْ عَامِلٌ ۔ اے میری مخالف قوم! تم جو کچھ کر رہے ہو اپنی جگہ کئے جاؤ۔ میں اپنی جگہ کام میں لگا ہوا ہوں فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ بہت جلد نتیجہ سامنے آجائے گا اور معلوم ہو جائیگا کہ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۔ آخر الامر کامیابی کا مقام کس کے لئے ہے۔ اس وقت تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ خدا کا یہ قانون کس قدر سچا ہے کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۱۳۶) "ظلم کرنے والوں کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی"۔

یہ ہے طریقہ سلیم! قانونِ خداوندی کے نتائج کو اپنے سامنے مرئی و مشہود دیکھ لینے کا۔ اسے اور واضح الفاظ میں سمجھنا ہو تو دو مثالوں کو سامنے لاؤ۔ کائنات میں خدا کی صفت خالقیت کا ظہور ہر آن ہوتا رہتا ہے۔ لیکن تم نظریۂ ارتقاء کے ضمن میں دیکھ چکے ہو کہ ان تخلیقی منازل کی رفتار کس قدر سست ہے۔ لیکن جب ادھر سے انسانوں کی صفت خالقیت مشہود ہو کر باہر آتی ہے تو وہی تخلیقی عمل نہ صرف یہ کہ بے حد تیز گام ہو جاتا ہے بلکہ اس میں ندرت و تنوع بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ دھوپ میں رکھی ہوئی روئی صرف گرم ہوتی ہے، اس میں شعلہ پیدا نہیں ہوتا لیکن جب وہی دھوپ (انسان کے ساختہ) "آتشیں شیشہ" میں سے گزاری جاتی ہے تو ایک ثانیہ میں شعلہ بھڑک اٹھتا ہے۔ "پیامِ مشرق" میں تم نے خدا اور انسان کا مکالمہ پڑھا ہو گا۔ اس میں انسان اپنی الٰہی شوخ و شنگ ندرت کاریوں کا ذکر کرتا ہے جب کہتا ہے کہ ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم	سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی	خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم	من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اب اس کے بعد صفتِ ربوبیت کو لو۔ ربوبیت (تربیت) کے معنی تم کئی مرتبہ سن چکے ہو۔ کسی شے کا نقطۂ اوّلیں سے آخری منزل تک بتدریج اوجِ کمال کو پہنچنا، جس طرح (شاعری کی تشبیہ کے اعتبار سے) بطنِ صدف میں

قطرۂ نیساں آہستہ آہستہ بتدریج، تربیّت (پرورش) پاکر گہر بن جاتا ہے۔ لیکن یہ عمل بالکل غیر محسوس اور طول طویل ہوتا ہے۔ اسی لئے تو غالب دل گرفتہ ہو کر کہتا ہے کہ ؏

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اس لئے کہ خدا کے قانون کے مطابق ؏

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک

لیکن اگر انسان اپنی معاشرتی زندگی میں نظامِ ربوبیّت قائم کر لیں اور ہر فرد دوسرے فرد کا مربّی (ربوبیّت دینے والا، ربّانی) بن جائے تو پھر، پوچھو سرزمینِ حجاز کے انجم آرا ذرّات سے، کہ انسانی جوہروں کی تکمیل کس طرح برق رفتاری سے ہوتی چلی جاتی ہے اور "زمین سے آسمان" تک کا یہ سفر "معراج" کس طرح براق کے کندھوں پر طے ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس شکل میں خدا کے آفاقی پروگرام کے ساتھ ان تربیت یافتہ انسانوں کا ارضی پروگرام بھی رفیق کار بن جاتا ہے اور یوں یہ تمام مراحل کلمح البصر طے ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس نظامِ ربوبیّت کے اندر ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں ہر فرد کی محنت اپنا پورا پورا نتیجہ مرتب کرتی چلی جاتی ہے اور اس میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہونے پاتی۔ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۲/۲۸۱)

اب ذرا تم توحید کے اس پہلو کو انسانی معاشرے کے سامنے لا کر دیکھو کہ اس میں انسانی خوشگواریوں اور ارتقائی ندرت کاریوں کی کتنی جنّتیں پوشیدہ ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان امن کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ ہر فرد، ہر گروہ، ہر جماعت، ہر قوم، تلاشِ امن میں ماری ماری پھر رہی ہے۔ جس سے پوچھو وہ یہی کہے گا کہ امن نصیب نہیں۔ انسان اپنے ہزارہا سال کے تاریخی تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ حقیقی امن صرف اس معاشرے میں مل سکتا ہے جس میں زندگی آئین و قوانین کے مطابق بسر ہوتی ہو۔ جس سرزمین میں بے آئینی کا دور دورہ ہو، وہاں شہنشاہ سے لے کر ایک ادنیٰ مزدور تک، کسی کی زندگی امن سے نہیں گزر سکتی۔

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جس قدر فضا پُرامن ہو گی اس میں اسی قدر انسانی صلاحیتوں کے اُبھرنے اور نشوونما پانے کے مواقع زیادہ ہوں گے۔ چنانچہ دنیا کی مختلف قوموں پر غور کرو۔ جس ملک میں زندگی آئین کے مطابق بسر ہوتی ہے وہاں کی قومیں، دماغی صلاحیتوں میں دوسری قوموں سے آگے ہوتی ہیں۔ آئین کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کو معلوم ہو کہ فلاں کام کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اگر یہ کیا جائے گا تو اس کا مواخذہ یوں ہوگا۔ اگر ان چیزوں کی پابندی کی جائیگی

تو اس پر کسی قسم کی کوئی گرفت، کوئی سختی، کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ اس کی جان و مال، آبرو، سب کچھ محفوظ رہے گا۔ امن کا احساس، ان تمام زنجیروں کو کاٹ کر الگ پھینک دیتا ہے جن میں انسان کے اعصاب جکڑے رہتے ہیں۔ جس قدر زندگی آئین و قوانین کے مطابق بسر ہوگی اسی قدر انسان کو آزادی میسّر ہوگی۔ یہ حالت اس دنیاوی آئین و قوانین کے تحت زندگی بسر کرنے کی ہے جو محکم و استوار یا غیر متبدل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اس قانون کو دیکھو جو توحید کی رو سے مرتب ہوتا ہے۔ اس قانون سے مفہوم یہ ہے کہ:

۱۔ تمام کائنات میں ایک ہی قانون رائج ہے جو انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتا۔

۲۔ یہ قانون، دوسرے قوانین پر غالب رہتا ہے۔ دنیا کا کوئی قانون بھی اسے شکست نہیں دے سکتا۔

۳۔ یہ قانون اس قدر محکم، اٹل، غیر متبدل اور یقینی طور پر نتیجہ خیز ہے کہ اس میں کسی قسم کی غلطی، سہو یا لغزش کا امکان ہی نہیں۔ قانون کی محکمیت کا یہ عالم ہے کہ انسانوں کو تو اجازت ہے کہ وہ جس قسم کی روش چاہیں اختیار کریں، لیکن قانون کو یہ اجازت نہیں کہ وہ جس قسم کا چاہے نتیجہ پیدا کر دے۔ جس قسم کی روش انسان اختیار کریگے قانون مجبور ہے کہ اس کے مطابق نتیجہ برآمد کرے۔

۴۔ اس میں ان انسانوں کو بھی کوئی ردو بدل کر لینے کی اجازت نہیں جن کے ہاتھوں سے یہ قانون نفاذ پذیر ہوتا ہے۔ نہ اس میں کسی کی سفارش چلتی ہے نہ کسی کی رورعایت ہوتی ہے، نہ کسی پر زیادتی۔ نہ کوئی بے گناہ پکڑا جاتا ہے۔

اب سوچو سلیم! کہ جس معاشرے میں اس قسم کا قانون نافذ ہوگا اس میں امن و سکون کا کیا عالم ہوگا؟ اس معاشرے میں خوف و حزن کا دخل تک نہیں ہوسکتا۔ ہر شخص جو قانون کی پابندی کرے گا، ہر قسم کے خوف سے مامون ہوگا۔ یہ ہے وہ معاشرہ جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ مَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ جس نے قانونِ خداوندی کی پابندی کرلی وہ خوف و حزن سے مامون ہوگیا۔ اللہ اکبر! کتنی بڑی ہے یہ ضمانت (SECURITY)۔ جس معاشرے میں انسانوں کو اس قسم کا امن نصیب ہوجائے اس میں ان کی خوابیدہ قوتیں کس قدر بیدار اور مضمر صلاحیتیں کتنی جلدی مشہود ہوجائیں گی۔ انسانی اعصاب سے بے آئینی کے خوف کا بوجھ اتار دیجئے۔ اس کی صلاحیتیں خود بخود ابھرنی شروع ہوجاتی ہیں۔ یہ تھا حقیقی سبب، سلیم! اس کا کہ نبی اکرمؐ نے اتنی مختصر سی مدّت میں، نہ صرف تمدّن کی دنیا میں، بلکہ خود انسانی قلوب کی بستیوں میں اس قدر محیرالعقول انقلاب پیدا کر دیا آپؐ نے اس باب میں کیا کیا تھا؟ انسانوں تک خدا کا قانون پہنچا دیا اور اس قانون کو اس معاشرے میں نافذ کر دیا۔ انسانوں میں سب سے بڑی شخصیت خود رسول اللہؐ کی ہوسکتی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے اعلان کر دیا کہ

میری حیثیت حاکم کی نہیں بلکہ قانون کے متبع کی ہے اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ میں خود سب سے پہلے اس قانون کی اطاعت کرتا ہوں۔ تم ہمیشہ اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھو کہ (لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ) قانون صرف ایک خدا کا ہے کسی اور کا نہیں (مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ) ۔ اور تو اور، انسانوں میں سب سے زیادہ ممتاز ہستی (محمدؐ) کی پوزیشن بھی اتنی ہی ہے کہ وہ اس قانون کا انسانوں تک پہنچانے والا ہے۔ اسے بھی کوئی حق نہیں کہ کسی پر اپنا حکم چلائے۔ خدا اپنے قانون میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا۔ جب لوگوں کو اس امر کا یقین ہوگیا کہ یہاں فی الواقعہ اطاعت قانون کی ہے اور قانون بھی ایسا جس میں کوئی انسان کسی قسم کا ردوبدل نہیں کرسکتا، تو اُن کے دل و دماغ سے وہ تمام بوجھ اُتر گئے جن کے نیچے وہ دب رہے تھے۔ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ (۷/۱۵۷)۔ جب اس طرح بوجھ اُتر گئے تو لوگوں کو صحیح معنوں میں آزادی مل گئی۔ ان کی قوتوں نے پھولنا پھلنا اور نشو و نما پانا شروع کر دیا اور چند دنوں میں وہی اُونٹ چرانے والے، بہترین انسانی صلاحیتوں کے مالک بن گئے۔ مغرب کے مؤرخین عمر بھر تحقیق کرتے رہتے ہیں اور پھر بھی سمجھ نہیں پاتے کہ نبی اکرمؐ نے ایسا محیر العقول انقلاب پیدا کس طرح کر دیا تھا؟ بات صرف اتنی تھی کہ اس معاشرے میں آئینی زندگی کا امن پیدا ہوگیا تھا اور اس امن کا لازمی نتیجہ انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما تھا۔ انسان کے اندر بے پناہ قوتیں موجود ہیں۔ جب وہ قوتیں اس طرح یک لخت اُبھر کر بروئے کار آجائیں تو ان کی رُو سے پیدا شدہ انقلاب کا کیا ٹھکانہ ہے۔ جن انسانوں کی صلاحیتیں یوں نمودار ہو جائیں وہ (عام الفاظ میں) انسان نہیں رہتے، کچھ اور ہو جاتے ہیں۔ اُن انسانوں کا مقابلہ وہ لوگ کبھی نہیں کرسکتے جن کی صلاحیتیں دبی ہوئی ہوں۔ ہم ـــــ غلام ابن غلام ابن غلام ـــــ اس کا کیا اندازہ لگا سکتے ہیں سلیم! کہ نشو و نما یافتہ صلاحیتیں انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہیں؟ ہمارے نصیب میں، ساری زندگی میں، ایک سانس بھی ایسا نہیں ہوسکتا جس میں ہم کہہ سکیں کہ ہم پر قانونِ خداوندی کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ یہ اتنی بڑی سعادت تھی کہ جب وادیٔ ضجنان میں حضرت عمرؓ کا گزر ہوا تو وہ سواری سے اتر کر سجدہ ریز ہوگئے ساتھیوں نے پوچھا کہ یہ کونسا مقام سجدہ تھا؟ فرمایا کہ عمرؓ اس میدان میں اونٹ چرایا کرتا تھا۔ باپ ایسا سخت گیر تھا کہ مار مار کر کھال اُدھیڑ دیا کرتا تھا۔ ایک وہ دن تھا اور ایک آج کا دن ہے کہ:

عمرؓ اور اُس کے خدا کے درمیان کوئی طاقت حائل نہیں۔

سلیم! آج تمام روئے زمین پر کوئی فرد بھی ایسا ہے جو چھاتی پر ہاتھ رکھ کر عمرؓ کی ہمنوائی میں کہہ سکے کہ:

میرے اور میرے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں۔

یہ تھی وہ حقیقی حریت اور آزادی جو آئین کی سچی پابندی نے ان لوگوں کو عطا کر دی تھی، اور اسی آزادی کا نتیجہ تھا کہ اونٹ چرانے والا عمرؓ دنیا کی ممتاز ترین شخصیت قرار پا گیا۔ اور ایک حضرت عمرؓ ہی پر کیا موقوف، وہ معاشرہ پورے کا پورا اُمت وسطیٰ (بین الاقوامی قوم) کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس حریت بخشی میں خود تربیت نبویؐ کا کتنا بڑا حصہ تھا، اسکی تفصیلات تم "معراج انسانیت" میں پڑھ چکے ہو۔ اس لئے اس خط میں ان کے دھرانے کی ضرورت نہیں۔ دو لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ حضورؐ نے ساری عمر میں، قوانین خداوندی کے نفاذ سے الگ کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اپنی طرف سے نہیں منوائی۔ یہی وجہ تھی کہ جب حضورؐ کسی سے کچھ فرماتے تو (دنیاوی نقطۂ نگاہ سے) ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی آزادی سے یہ پوچھ لیتا کہ یہ خدا کا حکم ہے یا آپؐ کی اپنی رائے ہے۔ اور اگر آپؐ فرماتے کہ نہیں یہ میری اپنی رائے ہے تو وہ نہایت اطمینان سے کہہ دیتا کہ میں اپنے معاملہ کو بہتر سمجھتا ہوں اس لئے آپ کی رائے کو نہیں مان سکتا۔ ایسا کہنے پر نہ تو کہنے والے کے دل میں کبھی گمان تک بھی گزرتا کہ اس "عدول حکمی" کا نتیجہ کیا ہوگا اور نہ رائے دینے والے کے دل میں اس کا خیال تک بھی آتا کہ اس نے میری بات نہیں مانی۔

یہ ہے قرآنی معاشرے میں توحید کے آئینی پہلو کا عملی اثر!

یہ ہے سلیم! وہ خدا جس پر ایمان لانے کا مطالبہ قرآن کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو پھر دھرا لو کہ یہ خدا کسی انسان کے ذہن کی تخلیق نہیں، بلکہ ایک موجود فی الخارج (OBJECTIVE) ذات ہے جسے حقیقت مطلق (ABSOLUTE REALITY) کہا جاتا ہے۔ اس خدا کا تعارف ان صفات کی رو سے ہوتا ہے جو اس نے خود وحی کے ذریعے بیان کر دی ہیں۔ اور یہ وحی آج اس آسمان کے نیچے صرف قرآن کے اندر ہے۔ اس خدا کی صفات ایک طرف انسان کے لئے زندگی کا نمونہ (PATTERN) بنتی ہیں اور دوسری طرف ان کا ظہور اس عالمگیر قانون کی صورت میں ہوتا ہے جو رگِ کائنات میں خونِ زندگی کی طرح جاری و ساری ہے۔ یہی وہ خدا ہے جس پر ایمان کا مطالبہ تمام نوع انسانی سے کیا جاتا ہے، بلا لحاظ اس کے کہ وہ خدا کے ماننے کے مدعی ہیں یا نہیں۔ نزول قرآن کے وقت، عرب میں اہل کتاب بھی موجود تھے جو خدا کو ماننے کے مدعی تھے، اور ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو بلا مذہبی گروہ بندیوں کے بیچ کے خدا پر ایمان رکھتے تھے۔ (عربوں کی تاریخ میں انہیں حنفاء کے نام سے پکارا جاتا ہے[1])۔ قرآن کہتا ہے کہ یہود و نصاریٰ ہوں، جو مذہبی گروہ بندیوں میں جکڑے ہوئے خدا پر ایمان کے

---

[1] اس قسم کے لوگ آج بھی موجود ہیں۔ یورپ کے اکثر مفکرین اپنے آپ کو کسی مذہب کا پیرو نہیں بتاتے لیکن وہ (باقی فٹ نوٹ صفحہ ۲۲ پر)

مدعی ہیں۔یا بلا گروہ بندی کی تخصیص کے خدا کو ماننے والے۔ان کا خدا پر ایمان، اُس خدا پر ایمان نہیں جسے وحی نے پیش کیا ہے اور جو قرآن کے اندر ہے۔لہٰذا ان لوگوں کے لئے بھی اسی طرح "قرآنی خدا" پر از سرِ نو ایمان لانا ضروری ہے جس طرح ان لوگوں کے لئے ضروری ہے جو خدا کے منکر ہیں۔اس لئے کہ جہاں تک "قرآنی خدا" کا تعلق ہے ان ماننے والوں کا ایمان اور نہ ماننے والوں کا انکار یکساں ہے۔جب تک یہ سب قرآن کے بتائے ہوئے خدا پر ایمان نہیں لائیں گے، جوہرِ انسانیت کو تباہ کر دینے والی قوتوں کے خطرات سے محفوظ نہیں ہو سکیں گے۔دیکھو سلیم! قرآن نے اس حقیقت کو کس قدر واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔جب فرمایا کہ:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، وَالَّذِیْنَ هَادُوْا، وَالصَّابِئُوْنَ وَالنَّصَارٰی، مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۵/۶۹)۔

جو لوگ (بلا مذہبی گروہ بندی کے لیبل کے) خدا کو ماننے کے مدعی ہیں[1] یا جو لوگ یہودی بن چکے ہیں یا صابی یا نصاریٰ (اور اپنے اندازوں کے مطابق خدا کو مانتے ہیں۔ان کا یہ ایمان حقیقی خدا پر ایمان نہیں) ان میں سے جو بھی اس خدا پر ایمان لائے گا جسے قرآن نے پیش کیا ہے اور قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مستقبل کی زندگی پر، اور اس کے بعد (قرآنی پروگرام کے مطابق) انسانی صلاحیتوں کو ابھارنے والے کام کرے گا۔تو یہ وہ لوگ ہیں جو خوف و حزن سے محفوظ و مصئون رہیں گے۔

اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ میں دُہرا دیا کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا۔ اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو، پھر ایسا ہوگا کہ ان پر آگے بڑھنے کی راہیں کھل جائیں گی جس نے اس خدا کو زندگی کا نصب العین بنانے اور اس کے قانون کو ایک عالمگیر قانون تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔یا خدا کے اس تصوّر کے ساتھ اپنے تصوّرات بھی ملا دیئے اور اس کے قانون کے علاوہ کسی اور قانون کو بھی کارفرما سمجھ لیا، اس پر زندگی کی برومندی کی راہیں نہیں کھل سکتیں۔یہ ہے سلیم! خدا پر ایمان اور اس سے کفر اور شرک کا مفہوم!

---

[1] ان سے مراد پیدائشی مسلمان بھی ہو سکتے ہیں قرآن بالتصریح ان سے بھی ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔(۴/۱۳۶)

(صفحہ ۲۱ کا بقیہ فٹ نوٹ) کسی مذہب کے پیرو ہیں) لیکن خدا کو (اپنے اپنے انداز کے مطابق) مانتے ہیں۔یعنی یہ نہ یہودی ہیں نہ نصرانی لیکن (اپنے خیال کے مطابق) خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔

خط بہت لمبا ہوگیا ہے اس لئے تمہارا یہ مطالبہ کہ خدا کی صفات (اسماء الحسنیٰ) کا کچھ اجمالی تعارف کرادیا جائے اور یہ بھی بتادیا جائے کہ جو معاشرہ ان افراد پر مشتمل ہوگا جن میں ان صفات کی نمود ہوگی، اس میں انسانیت کا انداز کیا ہوگا، کسی دوسرے وقت سہی[1]

مے باقی و ماہتاب باقیست مارا بتو صد حساب باقیست

والسّلام
جولائی ۱۹۵۲ء

[1] "خدا کے تصوّر" کا موضوع بڑا اہم اور وضاحت طلب ہے۔ اسے پرویز صاحب کی ایک مستقل تصنیف میں شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے جس کا نام ہے "من و یزداں"۔ صاحب ذوق حضرات کے لئے اس کا مطالعہ منفعت بخش ہوگا۔ (طلوعِ اسلام)

اُنیسواں خط

مقامِ محمدیؐ

آج سلیم! تم نے ایک ایسی بات پوچھی ہے جس کے متعلق کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھاتے وقت، ہاتھ کانپ اُٹھتا ہے، اس لئے کہ یہ مقام وہ ہے جس کے متعلق کہنے والے نے صحیح کہا ہے کہ ؎

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

تمہیں معلوم ہے عزیزم! کہ میری زندگی کا مشن، پیامِ خداوندی کو عام کرنا ہے۔ لیکن پیامِ خداوندی سمجھ میں نہیں آسکتا تاوقتیکہ مقامِ محمدیؐ نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔ مقامِ محمدیؐ (کہ جسے دوسرے لفظوں میں مقامِ نبوّت کہا جائے گا) ماورائے سرحدِ ادراک ہے۔ یعنی وحی کا سرچشمہ وہ مقام ہے جو انسانی عقل سے آگے ہے۔ اس لئے نہ تو مقامِ محمدیؐ کا تعین عقل کی رو سے کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہی عقل کی رُو سے اس کی کُنہ و حقیقت، اور کیفیت، و ماہیت تک پہنچا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ چیز عقل کے بس کی بات نہیں کہ یہ سمجھ سکے کہ وحی کی ماہیت کیا ہوتی ہے اور وہ نبی کو کس طرح ملتی ہے۔ اس لئے اس کے متعلق جو کچھ سمجھا جا سکتا ہے اسے خدا ہی سمجھا سکتا ہے جو وحی کا سرچشمہ ہے۔ اس مقام کے متعلق یوں تو قرآن کے مختلف گوشوں میں منتشر طور پر بہت کچھ کہا گیا ہے، لیکن سورۂ والنجم کی ابتدائی آیات میں اسے اس حسنِ ایجاز و ارتکاز سے بیان کیا گیا ہے کہ جوں جوں نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، ان چھوٹے چھوٹے موتیوں میں بڑے بڑے اہم حقائق اس طرح سموئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ ان آیات کے متعلق مجمل طور پر میں نے تم سے زبانی ذکر کیا تھا۔ اب اس اجمال کی تفصیل لکھتا ہوں۔ ذرا غور سے سُننا۔

ان آیات تک پہنچنے سے پہلے، تمہیداً کچھ سمجھ لینا ضروری ہے۔ یہ نوعِ انسان کی بدقسمتی تھی کہ ہمارے دور میں

جس قوم (اہلِ مغرب) نے سائنس کی دنیا (کائناتی علوم) میں اس قدر تحقیق و تفتیش کی، اُس کے سامنے مذہب (عیسائیت) وہ تھا جو علم کا دشمن اور عقل کا حریف تھا، اور جن "حقائقِ کائنات" کو وہ مذہب، وحی کہہ کر پیش کرتا تھا، وہ علمی تحقیقات کی روشنی میں ایک ثانیہ کے لئے بھی ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ اس لئے کہ جو وحی حضرت عیسیٰؑ کی طرف نازل ہوئی تھی، وہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہ تھی اور جس تعلیم کو وحی (انجیل) کہا جاتا تھا وہ درحقیقت انسانوں کی خود ساختہ تعلیم تھی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ یورپ کے یہ محققین نفسِ وحی سے بدگمان ہو گئے۔ چنانچہ وہاں ایک فکری تحریک رونما ہوئی جس کی رو سے کہا یہ گیا کہ اس کائنات کے پیچھے تو یقیناً ایک عظیم قوت ہے جو اسے اس حسن و خوبی سے چلا رہی ہے۔ لیکن جہاں تک انسانی معاملات کا تعلق ہے، خدا اور اس کی راہ نمائی کا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسان کو اپنے معاملات عقل کی رو سے طے کرنے چاہئیں۔ انسانی راہ نمائی کے لئے عقل سے بلند کوئی سرچشمہ نہیں۔ یہ تحریک (HUMANISM) کے نام سے متعارف ہے۔ اس تحریک کے علمبردار اسے فکری تحریک تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ ایک مذہب کی حیثیت سے اختیار اور رائج کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس تحریک کے ایک مشہور مفکر (JULIAN HUXLEY) نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (RELIGION WITHOUT REVELATION)۔ یعنی وہ مذہب جس کی بنیاد وحی پر نہیں۔ اس وقت اس کی فرصت نہیں (اور یوں بھی اس سے میں اپنے موضوع سے دور ہٹ جاؤں گا)، ورنہ میں بتاتا کہ ہکسلے جس قسم کے مذہب کی تلاش میں ہے وہ کس طرح قرآن کی وحی میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ نہ صرف اتنا جتنے کی اُسے تلاش ہے، بلکہ اس سے کہیں زیادہ۔ اگر مغرب کے ان مفکرین کے سامنے قرآن ہوتا تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی کہ خدا کی وحی جو اپنی اصلی شکل میں ہو، وہ نہ علم کی دشمن ہوتی ہے، نہ عقل کی حریف۔ علم و عقل کی حریف ہونا تو درکنار، جوں جوں علمی تحقیقات آگے بڑھتی ہیں اُس وحی کے دعاویٔ حقیقت ثابت ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بہر حال ان مفکرین کا مسلک یہ ہے کہ اُس خدا کو تو مان لیا جائے جس کے قوانین خارجی کائنات میں کارفرما ہیں، لیکن اُس خدا سے انکار کیا جائے جس کے قوانین انسانی دنیا میں راہ نمائی کا کام دیتے ہیں۔ اگر بہ نظرِ تعمق دیکھا جائے تو ان کی یہ روش ایک قسم کا نفسیاتی تضاد (PSYCHOLOGICAL CONTRADICTION) ہے جس کی رو سے وہ ایک طرف اس تسکین کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جو خدا پر ایمان سے نصیب ہوتی ہے اور دوسری طرف ان پابندیوں سے آزادی چاہتے ہیں جو خدا پر ایمان کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔ تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ قرآن نے ان (HUMANISTS) کو للکار کر پکارا ہے اور واضح الفاظ میں کہا ہے کہ اس خود فریبی سے حاصل کیا ہے؟ محض کائناتی خدا کو ماننا اور انسانی دنیا سے اس کا کوئی واسطہ نہ سمجھنا، خدا پر ایمان نہیں، اس سے انکار ہے۔ لہٰذا اگر تم نے اسے ماننا ہے تو پورے طور پر مانو۔ اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً (۲۰۸/۲)۔ اور اگر

انکار کرنا ہے تو کھلے بندوں انکار کر دو۔ یہ کیا کہ

منکرِ مے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن

تم شاید سلیم! یہ کہو کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں (HUMANISTS) کہاں تھے جو اس نے انہیں للکار کر ان کی غلط روش پر متنبہ کیا؟ یہ تو ہمارے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُس زمانے میں (HUMANISTS) نام رکھنے والا گروہ موجود نہیں تھا۔ لیکن قرآن کا تو اعجاز ہی یہ ہے کہ وہ انسانی فکر کی ہر لغزش کو نمایاں (POINT OUT) کرتا اور اس کی ہر خامی کو واضح کر کے، مثبت دلائل سے، اس کی تردید کرتا ہے۔ تم دیکھو کہ اس نے (HUMANISTS) کی غلط نگہی کو کس انداز سے پیش کیا ہے اور کس طریق سے اس کی تردید کی ہے۔ سورۃ المومنون میں ہے قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِیْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۳/۸۴)۔ ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ سب کس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے اور اس کا مالک اور آقا کون ہے؟ اس کے ساتھ ہی ان سے یہ بھی کہو کہ اس کا جواب تعصب اور جہالت سے نہ دیں۔ علم و بصیرت کی رُو سے دیں۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اسکے جواب میں یہ یقیناً یہی کہیں گے کہ یہ سب خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے۔ اور وہی اس کا مالک اور آقا ہے۔ (سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ)۔ اس لئے کہ علم کی بارگاہ سے اس کے سوا کچھ اور جواب مل ہی نہیں سکتا۔ اس پر قرآن کہتا ہے کہ جب تمہاری عقل و دانش اور علم و بصیرت تمہیں اسی نتیجہ تک پہنچاتی ہے، تو پھر تم اصل حقیقت کو کیوں اپنے سامنے نہیں لاتے؟ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۲۳/۸۴-۸۵)۔ پھر وہ کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ اس فضائے آسمانی میں تیرنے والے مختلف کروں میں جو کچھ ہے ان کی زندگی اور نشوونما کس کے قانون کے مطابق ہو رہی ہے؟ نہیں! اتنا ہی نہیں، بلکہ یہ پوچھو کہ اس تمام کائنات کی نشوونما (DEVELOPMENT) کا مرکزی کنٹرول کس کے ہاتھ میں ہے؟ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ (۲۳/۸۶)۔ اس کے جواب میں بھی وہ یہی کہیں گے کہ یہ سارا کنٹرول خدا ہی کے لئے ہے (سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ)۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ جب حقیقت یہ ہے تو پھر تم اس کی نگہداشت کیوں نہیں کرتے؟ (قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ)۔ پھر قرآن یہ کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ کائنات کی ہر شے پر اقتدار کس کا ہے؟ کس کا قانون ہے جس کے تابع یہ تمام اشیاء اس طرح مصروفِ سعی و عمل ہیں۔ وہ کون ہے جس کی طرف ہر شے اپنی حفاظت کے لئے پناہ ڈھونڈھتی ہے اور جو اس کے قانون کی خلاف ورزی کرے اسے کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ بتاؤ کہ تمہارا علم و فکر تمہیں کیا جواب دیتا ہے۔ قُلْ مَنْۢ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ هُوَ یُجِیْرُ وَ لَا یُجَارُ عَلَیْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۳/۸۸)۔ وہ کہتا ہے کہ

اس کے جواب میں بھی یہی کہیں گے کہ یہ سب کچھ خدا ہی کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔ (سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ)۔

خارجی کائنات میں قوانین خداوندی کی ان کارفرمائیوں کا اقرار لینے کے بعد، قرآن یہ پوچھتا ہے کہ تم بتاؤ کہ جب تمہارا علم و بصیرت تمہیں خود اس نتیجہ پر پہنچا رہا ہے کہ:

۱۔ خارجی کائنات کی تمام اشیاء ایک غیر متبدل، مستقل، محکم قانون کے مطابق چل رہی ہیں۔ اور

۲۔ یہ قوانین ان کے اپنے بنائے ہوئے نہیں، بلکہ خدائے کائنات کے متعین کردہ ہیں۔

تو کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ انسان کے لئے بھی غیر متبدل قوانین حیات اور مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کی ضرورت ہے۔ اور یہ مستقل اقدار اس کی اپنی عقل و خرد کی وضع کردہ نہیں ہو سکتیں۔ وہ کون سی بات ہے جس سے تمہیں اس کا دھوکا لگتا ہے کہ انسان، کائنات کے اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ ہے؟ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ (۲۳/۸۹)۔ کیا انسان بھی اسی کائنات کا جزو نہیں؟ انسان کو اگر باقی اشیائے کائنات سے امتیاز حاصل ہے تو صرف اس بات میں کہ یہ ان قوانین کی اطاعت بطیب خاطر (اپنی مرضی سے) کرتا ہے اور دیگر اشیائے کائنات ان کے مطابق چلنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں۔ انسان کے معاملہ میں یہ صورت نہیں کہ اسے مستقل قوانین کی ضرورت ہی نہیں، یا یہ ان قوانین کو خود وضع کر سکتا ہے۔ یہ قوانین خدا ہی کی طرف سے مل سکتے ہیں۔ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ۔ ہم ہی انہیں اٹل اور غیر متبدل قوانین دے سکتے ہیں۔ اگر یہ ان قوانین سے انکار کرتے ہیں اور خارجی دنیا میں خدا کی کبریائی پر ایمان لاتے ہیں تو یہ اپنے دعوئ ایمان میں جھوٹے ہیں۔ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۲۳/۹۰)۔

تم نے غور کیا کہ قرآن کس طرح (HUMANISTS) کے اس مسلک کی تردید کرتا ہے کہ خارجی کائنات میں خدا کی خدائی کو تسلیم کر لیا جائے لیکن انسانی دنیا میں اس کی طرف سے راہ نمائی کی ضرورت نہ سمجھی جائے۔ وہ ایسے خدا پر ایمان کو ایمان تسلیم ہی نہیں کرتا۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسانی دنیا میں بھی خدا کی طرف سے عطا کردہ قوانین کی ضرورت سمجھی جائے اور اس کی راہ نمائی کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔

قرآن نے یہ کچھ چودہ سو سال پہلے کہا تھا۔ لیکن اب مغرب کے مفکرین، (HUMANISM) کے مسلک کی بنیادی غلطی کو محسوس کر کے خود اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ خدا کو ماننے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کی راہ نمائی پر ایمان لایا جائے چنانچہ ہمارے دور کا ایک عظیم طبیعیاتی (PHYSICIST) ایڈنگٹن اپنی کتاب (SCIENCE AND THE UNSEEN WORLD) میں لکھتا ہے کہ:

اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہ نمائی کرتا ہے[1]۔

---

[1] یہ الگ سوال ہے کہ ایڈنگٹن کے ذہن میں وحی کا تصور کس قسم کا ہے۔

اوسپنسکی (OUSPENSKY) اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ:

اگر وحی کا تصوّر نہ ہو تو مذہب ہی باقی نہیں رہتا۔ اور مذہب میں کوئی عنصر تو ایسا ہوتا ہے جو فکر انسانی کے احاطے سے باہر ہو۔ اس لئے اگر یہ کوشش کی جائے کہ جن باتوں کو انسانی عقل اچھا سمجھتی ہے انہیں ایک جگہ اکٹھا کرکے اس کا نام مذہب رکھ لیا جائے تو اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ایسی کوششوں کا نتیجہ مذہب نہیں بلکہ ایک زبوں حال فلسفہ ہوگا۔

(NEW MODEL OF THE UNIVERSE)

تم نے غور کیا سلیم! کہ خود مغرب کے مفکّرین کس طرح، خدا کے ساتھ وحی کی ضرورت کو لاینفک قرار دے رہے ہیں یعنی اُن کے نزدیک مقام نبوّت کے بغیر مذہب کا تصوّر ہی ممکن نہیں۔

اب یہ دیکھو کہ قرآن نے مقام نبوّت کو کن الفاظ میں سمجھایا ہے۔ لیکن یہاں پھر چند الفاظ تمہیداً ضروری ہیں۔ اسی ہکسلے نے، اگست ۱۹۵۶ء میں نیویارک میں ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ وہ جس مذہب کی تلاش کر رہا ہے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُسے پیش ایسے انداز میں کیا جائے:

جو ایک طرف ایسا سلیس اور سادہ ہو کہ عام سطح کے انسان بھی اس سے نفع اندوز ہو سکیں۔ اور دوسری طرف اس قدر عمیق اور پُر معنی کہ بلند پایہ مفکر بھی اس سے مطمئن ہو جائے۔

(نیویارک ٹائمز ۲۲ $\frac{8}{56}$)

تم دیکھو! قرآن کریم اس معیار پر بھی کس طرح پورا اُترتا ہے۔ اُس نے بات یہ بھی سمجھائی ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں ہر شے ایک غیر متبدّل قانون کے تابع سرگرم عمل ہے اور وہ قانون اس کا اپنا وضع کردہ نہیں، اسی طرح انسان کے لئے بھی اسی قسم کے غیر متبدّل قوانین کی ضرورت ہے جو اُسے وحی کی رو سے ملیں۔ قرآن نے یہ بات سمجھائی تھی اور (سب سے پہلے) سمجھائی تھی اُس قوم کو جو نہ کارگہِ کائنات کے نظم و نسق سے واقف تھی، نہ سائنٹیفک تحقیقات سے آشنا۔ اُس قوم کی علمی سطح کیا تھی اس کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ وہ قوم آج سے چودہ سو سال پہلے کے زمانے میں تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جسے اس زمانے کے لوگ تاریک زمانہ (DARK AGES) کہتے ہیں یعنی خود زمانے کے اعتبار سے وہ دَورِ تاریکی کا دَور تھا۔ پھر اس تاریکی کے دَور میں عرب کا ملک، اپنے ہم عصر ممالک میں، تہذیب و تمدّن تو ایک طرف، علم و بصیرت میں بھی سب سے پیچھے تھا۔ حتّٰی کہ اس خطّہ میں ایسے لوگ بھی کچھ زیادہ نہ تھے جو معمولی نوشت و خواند سے واقف تھے۔ یہ لوگ اونٹوں کے دُودھ اور کھجوروں کی گٹھلیوں پر گزارہ کرتے تھے

یہ تھے اولیں مخاطب جنہیں یہ سمجھانا مقصود تھا کہ تمہیں زندگی میں مستقل قوانین کی ضرورت ہے اور یہ قوانین وہاں سے ملیں گے جہاں سے خارجی کائنات کو اٹل قوانین فطرت ملے ہیں۔ دیکھو کہ قرآن ان لوگوں کو اس قسم کی بلند اور دقیق حقیقت کن الفاظ میں سمجھاتا ہے، اور پھر یہ بھی دیکھو کہ اس حقیقت کو جن الفاظ میں اس جاہل اور ناخواندہ قوم کو ازمنۂ مظلمہ میں سمجھایا گیا تھا وہی الفاظ آج اس دورِ علم و تمدن میں بلند ترین مفکروں کے سامنے کس طرح انکشاف حقیقت کرتے ہیں۔

وہ بادیہ نشین قوم تھی۔ اُن کی زندگی کا معمول یہ تھا کہ ــــــ ہر صبح سفر، ہر شام سفر، بلکہ صبح تو کاہے کو ہے سفر اکثر و بیشتر شام ہی کو ہوتا، اس لئے کہ دن کے وقت ریگستان میں سخت گرمی ہوتی اور ان کے کاروان اکثر راتوں کو سفر کرتے۔ لیکن ان کا یہ سفر گرانڈ ٹرنک روڈ پر نہیں ہوتا تھا کہ پشاور سے چلے اور آنکھیں بند کئے سیدھے کلکتہ پہنچ گئے۔ ان کا سفر صحراؤں میں ہوتا جن میں نہ کہیں سڑکیں تھیں نہ نشانات راہ۔ اگر کبھی کسی نے کوئی نشانات متعین بھی کر لئے۔ (مثلاً یہ کہ یہاں کوئی ٹیلہ ہے اور وہاں کچھ جھاڑیاں) تو صحرا میں چلنے والی ہوائیں اور اُن سے اُڑنے والی ریت، دوسری شام تک اُن نشانات کو بدل کر رکھ دیتی۔ جہاں کل ٹیلہ تھا وہاں آج گڑھا ہے۔ جہاں گڑھا تھا، وہاں ریت کا ڈھیر ہے۔ پھر، وہاں بستیاں اور آبادیاں بھی قریب قریب نہ تھیں کہ مقامی لوگوں سے راستہ پوچھ لیا جائے۔ یہ تھے وہ حالات جن میں وہ سفر کرتے تھے۔ اور وہ بھی تاریک راتوں میں۔

اُن سے کہا گیا کہ تم جو ان صحراؤں میں، اندھیری راتوں میں سفر کرتے ہو اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تم راستے کی تلاش میں مارے مارے پھرو یا راستہ پالینے کے بعد پھر بھٹک جاؤ۔ تو ایسا کس طرح سے ہوتا ہے؟ وہ کون سے مستقل نشانات ہیں جن سے تم راہ نمائی حاصل کرتے ہو؟ ان کا جواب صاف اور سیدھا تھا کہ ہم تاریک راتوں میں ستاروں سے راہ نمائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ ایسے سچے راہبر ہیں کہ راستہ دکھانے میں نہ کبھی غلطی کرتے ہیں نہ دھوکا دیتے ہیں۔ قرنہا قرن سے یہ ہمارا تجربہ ہے اور نسلاً بعد نسلٍ اس کی شہادت ملتی چلی آرہی ہے۔ ان کی راہ نمائی پر نہ زمانے کا مرور اثر انداز ہوتا ہے، نہ ملکوں کا بُعد اور تفاوت۔ یہ ہر زمانے اور ہر قوم کو یکساں راہ نمائی دیتے ہیں۔ ان کا شروع سے یہی انداز چلا آرہا ہے۔ اور آج بھی ان کی یہی روش ہے۔

اس پر اُن سے کہا گیا کہ ذرا سوچو کہ جس خدا کی طرف سے ستاروں کو یہ صلاحیت حاصل ہوئی ہے کہ وہ اپنی راہ نمائی میں نہ غلطی کرتے اور نہ دھوکہ دیتے ہیں، اگر اُسی خدا کی طرف سے تمہیں بھی راہ نمائی ملے تو کیا وہ راہ نمائی بھی ستاروں کی راہ نمائی کی طرح مستقل، غیر متبدّل، قابلِ اعتماد، سہو و خطا سے مبرّا اور فریب دہی کے

امکان سے بلند و بالا ہو گی یا نہیں ؟ یہ ہے وہ مقام جہاں سے سورۂ والنجم کی ابتداء ہوتی ہے۔ یعنی وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی (۵۳/۱)۔ طلوع ہونے والا ستارہ، جب وہ اپنا راستہ طے کرنے کے بعد غروب ہوتا ہے، اس حقیقت کبریٰ پر شاہد ہے کہ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی (۵۳/۲)۔ تمہارا یہ رفیق سفر جو تمہیں زندگی کے صحیح راستے کی طرف لے جانا چاہتا ہے، نہ تو راستے کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے اور نہ ہی راستہ پا جانے کے بعد بھٹک گیا ہے۔ اس لئے کہ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی (۵۳/۳)۔ یہ جو کچھ کہتا ہے اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (۵۳/۴)۔ یہ صرف اس وحی کو بیان کرتا ہے جو خدا کی طرف سے اس کو دی جاتی ہے۔ انسانی خیالات کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔

زماں زماں شکند آں چہ می تراشد عقل

جو باتیں ہم بچپن میں کرتے ہیں، ذرا آگے بڑھ کر دیکھئے تو ان پر خود ہی بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ جوانی کے جن فیصلوں کو ہم عقل و تدبیر اور دانش و بینش کا کمال سمجھتے ہیں، پانچ سات برس کے بعد، وہ چند نادانیوں سے زیادہ کچھ دکھائی نہیں دیتے۔ اس کے بعد علم و تجربہ میں کچھ پختگی آنے لگتی ہے تو بڑھاپا آجاتا ہے، جس میں (قرآن کے الفاظ میں) عقل اوندھی ہو جاتی ہے۔ یہ کیفیت تو عمر کی مختلف منزلوں میں ہوتی ہے۔ ایک ہی منزل میں حالت یہ ہوتی ہے کہ صحت کے عالم میں خیالات اور قسم کے ہوتے ہیں، بیماری کے زمانے میں اور قسم کے۔ حالات مساعد ہوں تو زاویۂ نگاہ اور قسم کا ہوتا ہے اور جب پریشانیاں گھیر لیں تو تمام نظریات و تصوّرات بدل جاتے ہیں۔ غصّے کے عالم میں ہمارے خیالات اور قسم کے ہوتے ہیں اور سکون کی حالت میں اور قسم کے۔ یہ حالت تو افراد کی ہے۔ اگر قوموں کی زندگی پر نگاہ ڈالی جائے تو وہاں بھی یہی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ جن باتوں کو کوئی قوم سو سال پہلے علم و دانش کی معراج سمجھتی تھی آج وہ خود ان پر ہنستی ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنے خیالات سے کوئی بات کہے گا وہ اس کی طبعی کیفیات اور ذہنی اور قلبی میلانات سے متاثر اور اس کے زمانے کے احوال و ظروف سے متّسم ہو گی۔ اس لئے وہ کبھی مستقل اقدار (نہ بدلنے والے قوانین) کا تعین نہیں کر سکے گا۔ یہ چیز صرف اُس سرچشمہ سے مل سکے گی جو زمان و مکان کے ہر قسم کے اثرات سے مبرّیٰ ہو، اور قلبی و ذہنی عواطف و میلانات کی رنگینی سے معرّا۔ اُسے وحی کہتے ہیں۔

انہی حقائق کو قرآن کریم نے دیگر مقامات پر بھی بیان کیا ہے۔ ستاروں کی راہ نمائی کے متعلق سورۂ انعام میں ہے۔ وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ النُّجُوْمَ لِتَھْتَدُوْا بِھَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (۶/۹۸)۔ اللہ وہ ہے جس نے تمہارے فائدے کے لئے ستاروں کو اس انداز سے بنایا کہ تم اُن سے زمین اور سمندر کے

سفر کی تاریکیوں میں راہ نمائی حاصل کر سکو۔ سورۂ واقعہ میں کہا کہ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ ۔ (۵۶/۷۵) نہیں! بات یوں نہیں جس طرح تم اپنے ذہن میں خیال کئے ہو، بات کچھ اور ہے۔ اس کے لئے میں ستاروں کی گذرگاہوں (ان کے طلوع و غروب کے مواقع) کو شہادت میں پیش کرتا ہوں ۔ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ (۵۶/۷۶)۔ اور اگر تم علم و بصیرت کی بارگاہ سے پوچھو تو وہ تمہیں بتائے گی کہ یہ شہادت کس قدر عظیم ہے۔ یہ شہادت کس امر کی ہے؟ اس امر کی کہ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ (۵۶/۷۷) ۔ یہ حقیقت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے کہ یہ قرآن نوعِ انسانی کے لئے بڑا ہی نفع رساں اور عزت بخش ہے ۔ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ (۵۶/۷۸) ۔اس کے حقائق غیر متبدل ہیں ۔ اور وہ خود بھی ایک محفوظ کتاب کے اندر ہے، اس لئے اس کے حروف و الفاظ میں بھی کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ حقائق کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ الفاظ ہی ہوتے ہیں ۔ اگر الفاظ میں تبدیلی ہو جائے تو حقائق میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اور شرط بھی ہے اور وہ یہ کہ الفاظ کا صحیح مفہوم بھی اسی صورت میں سمجھ میں آسکتا ہے جب ان الفاظ کو خالی الذہن ہو کر سمجھا جائے ۔ اگر انسان پہلے سے اپنے ذہن میں کوئی خاص خیالات اور تصورات لے کر قرآن کی طرف آئے تو قرآنی حقائق اپنی اصلی اور بلا آمیزش شکل میں سامنے نہیں آسکیں گے ۔ اس کے لئے تطہیر فکر و نظر نہایت ضروری ہے ۔ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۵۶/۷۹) اس کے حقائق کو صرف وہی پا سکتے ہیں جن کا قلب و دماغ غیر قرآنی تصورات سے پاک ہو ۔ جن کا ادراک بے رنگ ہو ۔

پھر، جس طرح ستاروں کی راہ نمائی تمام اقوامِ عالم اور جملہ ممالکِ دُنیا کے لئے یکساں ہے اسی طرح، قرآن کی راہ نمائی بھی زمان و مکان کی حدود سے بے نیاز اور تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں ہے ۔ اس لئے کہ یہ اُس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جو پورے عالمِ انسانیت کا نشو و نما دینے والا ہے ۔ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۵۶/۸۰) ۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ (۵۶/۸۱) ۔ ذرا سوچو کہ تم اس قسم کے محکم، غیر متبدل، یقینی، ستاروں کی طرح واضح اور روشن ضابطۂ حیات کو جھٹلاتے ہو؟ اس سے اِدھر اُدھر پھسلنا چاہتے ہو ۔ اس میں کمی بیشی کر کے مداہنت اور مفاہمت (COMPROMISE) کی راہیں تراشنے کی کوشش کرتے ہو؟ تم چاہتے ہو کہ اس میں تمہاری مرضی کے مطابق تھوڑا سا رد و بدل کر دیا جائے! بتاؤ کہ اگر ستارے، لوگوں کی خواہش کے مطابق اپنے راستے بدلنے لگ جائیں تو مسافروں کا کیا حشر ہو؟

اور ایسی روش تم اختیار کیوں کرتے ہو؟ محض اس لئے کہ تم نے مذہبی پیشوائیت کو اپنے لئے ذریعۂ

معاش (روٹی کا آسرا) بنا رکھا ہے اور قرآنی مسلک اختیار کرنے سے وہ چیز چھن جاتی ہے؟ وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ (۵۶/۸۲)۔ ذرا سوچو کہ کس قدر پست مقصد کی خاطر تم اتنی بلند حقیقت کو جھٹلاتے اور مداہنت اختیار کرتے ہو؟

اسی طرح، سورۂ تکویر میں ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۔ میں یہ باتیں یونہی نہیں بیان کر رہا۔ اس حقیقت پر سارا نظامِ کائنات شاہد ہے۔ اس پر شاہد ہیں وہ ستارے، جو دبے پاؤں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے رہتے ہیں۔ اَلْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۔ اور وہ تیز خرام ستارے جو اپنی اپنی منزل طے کر کے چھپ جاتے ہیں۔ وَ الَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۔ اور رات جو خاموشی سے آتی ہے اور خاموشی سے چلی جاتی ہے۔ وَ الصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ (۸۱/۱۵-۱۸)۔ اور صبح، جب وہ حیاتِ نو کا پیغام لے کر نمودار ہوتی ہے۔ یہ سب مظاہر کائنات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۔ جو ہماری وحی کی بات تم سے کہہ رہا ہے وہ ہمارا بھیجا ہوا پیغامبر ہے اور نہایت معزز پیغامبر۔ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ (۸۱/۱۹-۲۰)۔ اسے اس خدا کی طرف سے بڑی قوتیں عطا ہوئی ہیں جو کائنات کے مرکزی کنٹرول کا مالک ہے۔

بہرحال یہ ہے وہ انداز جس سے قرآن نے اس صحرانشین قوم کو اتنی بلند اور ایسی لطیف حقیقت سے آگاہ کیا۔ اگر تم نے دیکھنا ہو کہ ستاروں کی انہی گزرگاہوں سے دورِ حاضر کے بلند پایہ سائنسدان کس طرح ان حقائق تک پہنچتے ہیں تو (کم از کم) سرجیمز جینس کی مشہور کتاب (THE MYSTERIOUS UNIVERSE) یا (THE STARRY WAY OF HEAVENS) کو دیکھو اور غور کرو کہ عصرِ حاضر کا یہ سب سے بڑا ماہر فلکیات، اس محیرالعقول کارگہِ سماوی کے مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد، خدا کے بلند و بالا قانون کی عظمت و جلال کے سامنے کس طرح سجدہ ریز ہوتا ہے وہ ان اجرامِ فلکی کی نقل و حرکت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتا ہے کہ قانونِ خداوندی کے محکم اور غیر متبدل ہونے پر ستاروں کی شہادت فی الواقعہ ایک عظیم شہادت ہے۔ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۔

اب سلیم! آگے بڑھو۔ ہمارے ہاں معاشرے کی جو حالت ہو رہی ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ لوگوں کے دلوں میں قانون کا احترام بہت کم رہ گیا ہے۔ قانون کی کتابوں کو دیکھو تو وہ اعلیٰ درجہ کے قوانین سے بھری پڑی ہیں لیکن افراد معاشرے کو دیکھو تو قانون پر عمل بہت کم ہو رہا ہے۔ چوری نہ کرو، جھوٹ نہ بولو، کسی کو فریب نہ دو، کسی سے "چار سو بیس" نہ کرو۔ بلیک مارکیٹ سے مجتنب رہو، وغیرہ وغیرہ، تمام قوانین

اور ہدایات موجود ہیں لیکن ان پر عمل کوئی نہیں کرتا۔ یہی نہیں کہ ان پر عمل نہیں ہوتا۔ حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ جو شخص دیانتدار اور صداقت پسند رہنا چاہے اسے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تم اس صورتِ حالات کا تذکرہ کسی ذمہ دار اہلِ حل و عقد سے کرو، وہ فوراً کہہ دے گا کہ کیا کیا جائے؟ قانون تو موجود ہے، لیکن اس کے نافذ کرنے کی مشینری بہت کمزور اور ناقص ہو چکی ہے۔ اس لئے معاشرے میں ہر طرف فساد ہی فساد برپا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ صرف اچھے قانون کا ہونا کافی نہیں۔ اس قانون کے پیچھے قوتِ نافذہ کا ہونا بھی ازبس ناگزیر ہے۔ اگر قوتِ نافذہ کمزور ہو تو قانون کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اپنے معاشرے کے برعکس، خارجی کائنات پر غور کرو اور دیکھو کہ وہاں فطری قوانین کس حسن و خوبی سے کارفرما ہیں۔ فلک کی پہنائیوں میں تیرنے والے ان عظیم کرّوں کو دیکھو۔ ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں کس نظم و ضبط کے ساتھ مصروف سعی و عمل ہے۔ ماہرینِ افلاک کا کہنا ہے کہ کہکشاں، جو ہمیں محض گرد مرمریں یا جوئے شیر نظر آتی ہے، سیاروں اور ستاروں (ثوابت و سیار) کی ایک عظیم کائنات ہے جس میں ایک کرّہ، نہ صرف سورج بلکہ پورے نظامِ شمسی سے بھی اس قدر بڑا ہے جیسے تِل کے سامنے پہاڑ۔ یہ تمام محیر العقول کارگہ اور اس کی یہ ہوش ربا مشینری، روزِ اوّل سے آج تک غیر مرئی اور نامحسوس باہمی کشش کے ذریعے، اس حدود ناآشنا فضا میں لاکھوں میل فی سیکنڈ کی رفتار سے، مصروفِ حرکت ہے لیکن کیا مجال جو اس میں کبھی ذرا سا بھی ٹکراؤ پیدا ہو جائے۔ اس "کارگہِ شیشہ گراں" کی حالت یہ ہے کہ اگر ان کروڑ ہا کروڑ اجرامِ فلکی میں سے کسی ایک میں، ایک ذرّے کے برابر بھی کشش میں کمی، یا اس کی رفتار میں تیزی یا سستی واقع ہو جائے تو یہ سارے کا سارا نظام ایک لمحہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

آسمانوں سے نیچے اتر کر اپنی زمین کی طرف آؤ تو قانونِ خداوندی کی کارفرمائی اور نتیجہ خیزی نگہِ بصیرت کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ ایک ہی قطعۂ زمین میں برابر برابر ببول اور آم کے بیج ڈال دو۔ وہی مٹی ہے وہی پانی، وہی ہوا ہے وہی روشنی وہی برودت ہے وہی حرارت۔ لیکن آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ببول کے تخم سے آم کا پیڑ اُگ آیا ہو اور آم کے درخت میں ببول کے کانٹے لگ گئے ہوں۔ تم غور کرو سلیم! کہ جس ہستی نے کائنات کے لئے ایسے غیر متبدّل قوانین متعیّن کئے ہیں وہ کس قدر صاحبِ اقتدار و جبروت ہے کہ ہر قانون اپنا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کئے جا رہا ہے۔ اب تم سوچو کہ جب اُسی خدا کے قوانین (جو وحی کی رُو سے ملیں) انسانی دنیا میں بھی کارفرما ہو جائیں تو وہ بھی کس طرح اپنے صحیح صحیح نتائج بحسن و خوبی پیدا کرتے چلے جائیں گے؟ اس حقیقت کے اظہار کے لئے سورۂ والنجم میں وحی کے بیان کے بعد کہا کہ عَلَّمَهُ

شَدِیۡدُ الۡقُوٰی (۵۳/۵)۔ نبی کو اس وحی کا علم اس ہستی نے دیا ہے جو بڑی زبردست قوتوں کی مالک ہے۔ وہ ذُو الۡقُوَّۃِ الۡمَتِیۡنِ (۵۱/۵۸) ہے۔ لہٰذا ہو نہیں سکتا کہ جو معاشرہ اس کے قوانین کے مطابق چلے اُسے ان قوانین کے نتائج و ثمرات نصیب نہ ہوں۔ وہ ان نتائج سے ضرور بہرہ یاب ہو گا۔ لَا یُخۡلِفُ اللّٰہُ الۡمِیۡعَادَ (۳۹/۲۰)۔ اللہ کے وعدے ضرور پورے ہو کر رہا کرتے ہیں۔

اب اور آگے چلو۔

کائنات کی مشینری کا ہر پُرزہ اس لئے مصروفِ سرگرمی ہے کہ ہر شے کی مضمر صلاحیتوں (POTENTIALITIES) کی پوری پوری نشوونما (DEVELOPMENT) ہو سکے۔ ابر و باد و مہ و خورشید، سب اس لئے مصروفِ کار ہیں کہ رائی کا ایک ننھا سا دانہ پودا بن کر سات سات سو دانے پیدا کرے۔ یہ اس دانے کی تقدیر یا (DESTINY) ہے۔ یہ اس کی زندگی کی آخری منزل ہے۔ یہ اس کی مضمر صلاحیتوں کی تکمیل کا آخری نقطہ ہے۔ لہٰذا خدا کا کائناتی قانون اس حسن و خوبی سے اسلئے سرگرم عمل ہے کہ ہر شے کی رُبوبیّت (پرورش، نشوونما) ہوتی چلی جائے۔ وہ اپنے نقطۂ آخریں تک جا پہنچے۔ اس کی صلاحیتوں کی تکمیل ہو جائے۔

لیکن اشیائے کائنات کی نشوونما، قانون ارتقاء (EVOLUTION) کے تحت ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شئے، ہر آن، سلسلۂ ارتقاء کی ایک نئی منزل (STAGE) میں داخل ہوتی ہے جہاں اس کی نشوونما کے تقاضے، اسکی سابقہ منزل سے مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا خدا کا قانونِ ربُوبیّت ایسا ہے کہ کوئی شئے جس حالت میں ہو، وہ اس کے مطابق سامانِ نشوونما بہم پہنچاتا ہے۔ یَسۡـَٔلُہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، اپنی نشوونما کے لئے سب خدا (کی رُبوبیّت) کا محتاج ہے۔ اور ان میں سے ہر چیز کی حالت یہ ہے کہ کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِیۡ شَاۡنٍ (۵۵/۲۹)۔ وہ ہر آن، ایک نیا انداز لئے ہوتی ہے جس میں اس کی پرورش کے تقاضے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اور یہ اس کے قانونِ رُبوبیّت کا کمال ہے کہ جو شئے جس حالت میں ہو وہ اسی کے مطابق اس کی نشوونما کا سامان عطا کر دیتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی ماں کی چھاتیوں سے دودھ کے چشمے رواں ہو جاتے ہیں۔ یہ دودھ شروع میں بہت پتلا ہوتا ہے۔ جوں جوں بچے کو زیادہ غذا (NOURISHMENT) کی ضرورت ہوتی ہے، دُودھ میں غذا کے اجزا زیادہ ہو جاتے ہیں اور پانی کی مقدار کم۔ اس کے ساتھ ہی بچے کے معدے میں ہضم کی قوت بھی بڑھتی جاتی ہے تاکہ وہ ثقیل دُودھ کو جزوِ بدن بنا سکے۔ پھر، جب وہ خارجی غذا ہضم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو اسے دانت دئیے جاتے ہیں اور دُودھ کی نہریں خشک ہو جاتی ہیں۔ وقس علیٰ ذٰلک

ہر شے کو اس کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق سامانِ نشو ونما ملتا چلا جاتا ہے ۔

جس طرح طبیعی دنیا میں نشو ونما کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں اسی طرح انسانیت کی دنیا میں بھی نشو و ارتقاء کے تقاضوں میں تغیّر و تبدّل ہوتا رہتا ہے ۔ اگر آج افریقہ کے حبشی اپنے جوہرِ انسانیت کی نشو ونما کے لئے نظامِ خداوندی کو اختیار کریں تو ان کی نشو ونما کے تقاضے اور ہوں گے اور اگر یورپ کی متمدن اقوام یہی کچھ چاہیں تو اُن کے تقاضے اُن سے مختلف ہوں گے ۔ لہٰذا ، انسانوں کی دنیا میں خدا کا قانون بھی ایسا ہونا چاہیئے جو انسانی ذات کے مختلف جوہروں کی پرورش اور بالیدگی زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق کرتا چلا جائے ۔ اس کے لئے فرمایا کہ وحی کا قانون جو اپنی نتیجہ خیزی میں حتمی او ریقینی واقع ہوا ہے ، اُس خدا کا قانون ہے جو ذُوْ مِرَّةٍ (۵۳/۶) ہے ۔ یعنی زندگی کی تمام گزرگاہوں کا مالک ۔ زمان اور مکان ، دونوں اعتبار سے انسانی زندگی کے تمام بدلتے ہوئے تقاضوں سے باخبر اور ان کی نشو ونما کا پورا پورا انتظام کرنے والا ۔ ربّ العالمین ۔

یہاں تک سلیم ! گفتگو وحی یا اس خدا کے متعلق ہو رہی تھی جو وحی کو عطا کرتا ہے ۔ اب اُس گراں مایہ ہستی کا تذکرہ جلیلہ آتا ہے جس کا منوّر و مقدّس سینہ وحی کا مہبط بنتا ہے ۔ یعنی خود نبیؐ کا تذکرہ ۔ لہٰذا یہاں سے مقامِ نبوّت یا مقامِ محمدیؐ کا آغاز ہوتا ہے ۔ اسے سمجھنے کے لئے عزیزم ! پہلے سے بھی زیادہ ذوق و انہماک کی ضرورت ہے ۔

آجکل ہم (مسلمانوں) میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ نبی کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ خدا کی طرف سے حاصل کردہ وحی کو دوسروں تک پہنچا دے ۔ اور بس ۔ یعنی وہ پیغامِ خداوندی کو دوسروں تک پہنچا دیتا ہے تو اس کے بعد اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی ۔ اُن کے خیال کے مطابق یوں سمجھیئے کہ نبی کی حیثیت (معاذ اللہ) ایک ریڈیو سیٹ کی سی ہوتی ہے ۔ جو کچھ براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے براڈ کاسٹ (نشر) ہوتا ہے یہ سیٹ اسے اخذ کر لیتا ہے اور بعینہٖ اسی طرح دوسروں تک پہنچا دیتا ہے ۔ جب براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے کچھ نشر نہیں ہوتا تو ریڈیو محض ایک لکڑی کا ڈبہ رہ جاتا ہے ۔

اس کے علاوہ ، بعض لوگوں کو ایک اور غلطی بھی لگتی ہے ۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وحی چونکہ اکتسابی چیز نہیں بلکہ وہبی ہے یعنی وحی میں نبی کے اپنے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ علم اسے خدا کی طرف سے ملتا ہے ۔ اس لئے نبی میں کسی ذاتی صلاحیت اور قابلیت کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ خدا نے اپنی وحی کسی نہ کسی کے ذریعے انسانوں تک پہنچانی ہوتی ہے اس لئے اس مقصد کے لئے جو انسان بھی اس کے سامنے آ جائے وہ اس کے ذریعے انسانوں تک پہنچا دیتا ہے ۔ یہ ہے وہ خیال جس کا مظہر وہ شعر ہے جو ہمارے ہاں بڑا مقبول ہے اور جسے تم نے بھی کئی بار گنگنایا ہو گا ۔ یعنی ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

یعنی اللہ تعالیٰ کے پروگرام کے مطابق وہ وقت آچکا تھا کہ خدا کی وحی بنی اسرائیل تک پہنچا دی جاتی ۔ اُس وقت "اتفاق سے" حضرت موسیٰؑ آگ کی تلاش میں اُدھر آ نکلے تو اللہ میاں نے تاجِ نبوّت ان کے سر پر رکھ دیا ۔ اگر اُس وقت اُن کی جگہ کوئی اور وہاں جا پہنچتا تو یہی پیمبری اُسے مل جاتی !

یہ خیال بھی بنیادی طور پر غلط ہے اور مقامِ نبوّت سے یکسر بے خبری کا نتیجہ ۔ اس کی وضاحت کے لئے خود حضرت موسیٰؑ کی مثال سامنے لاؤ ۔ (جن کے متعلق نہایت بے تکلفی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ آگ لینے کو گئے اور پیمبری مل گئی !) سنو کہ اللہ تعالیٰ ان کے منصبِ نبوّت پر سرفراز ہونے کے سلسلہ میں کیا کہتا ہے ۔ جب حضرت موسیٰؑ کو وحی سے نوازا گیا (اور اُن سے فرعون کے خلاف جس مہم پر جانے کے لئے کہا گیا تھا ۔ اس کے لئے اُن کی طرف سے پیش کردہ متعدد درخواستیں منظور کر لی گئیں) تو حضرت موسیٰؑ کی پیشانی (فطری طور پر) احساسِ سپاس گزاری سے بدرگاہِ ربّ العزّت جھک گئی ۔ اُس وقت آپ سے کہا گیا کہ "اے موسیٰؑ ! تم نے اسی کو ہمارا احسان سمجھا اور اس کے لئے جذباتِ تشکّر تمہارے آبگینۂ قلب سے اُبھر آئے ۔ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ سلسلۂ احسانات کب سے شروع ہے ؟ اس کے لئے تمہیں بہت پیچھے جانا ہوگا ۔ یہ سلسلہ تو اُسی دن سے شروع ہوگیا تھا جب تم پیدا ہوئے تھے ۔ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ (۲۰/۳۷) ۔ جب ہم نے تمہاری ماں کی طرف حکم بھیجا تھا کہ تمہیں ایک صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دے ۔ اس نے اس حکم کی تعمیل کی اور تمہارا صندوق فرعون کے محلات میں جا پہنچا ۔ اس طرح ہم نے اس کا انتظام کر دیا کہ تمہاری پرورش فرعون کے محلات میں ہو ۔ تم نے بڑے ہوکر (نبی بن کر) فرعون سے ٹکر لینی تھی ۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ تم رموزِ سلطنت اور اسرارِ حکومت سے واقف ہوتے ۔ لیکن تم ایک محکوم قوم (بنی اسرائیل) کے فرد تھے ۔ اس لئے تمہارے لئے ان اسرار و رموز تک بار پانا ناممکن تھا ۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہم نے یہ تدبیر کی کہ تمہاری پرورش و تربیت خود محلاتِ شاہی میں ہو ۔ لیکن تم نے ساری عمر شہزادگی یا شہنشاہی کی زندگی بسر نہیں کرنی تھی ۔ تمہاری پیدائش سے مقصود کچھ اور تھا ۔ تم نے ایک دن بنی اسرائیل کو لے کر وادیٔ سینا کے جنگلوں اور بیابانوں میں بھی جانا تھا اور وہاں اُن کی تربیت کرنی تھی ۔ اس لئے یہ بھی ضروری تھا کہ تم صحرائی اور بیابانی زندگی سے بھی واقف ہو جاؤ ۔ اس مقصد کے لئے ایسی تدبیر کی گئی کہ تم شاہی محلات کو چھوڑ کر مدین کی طرف بھاگ نکلو ۔ فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِي أَهْلِ مَدْيَنَ (۲۰/۴۰) ۔ سو تم کئی برس اہلِ مدین میں رہے ۔

اس طرح جب تم ان تمام مختلف مراحل سے گزرے تو ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَا مُوسَىٰ (۲۰/۴۰) ۔ تب کہیں جا کر تم ہمارے پیمانے پر پُورے اُترے ۔ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي (۲۰/۴۱) ۔ اس طرح ہم نے تمہیں اپنے ایک مقصد کیلئے بہ کمالِ حسن و خوبی تیار کیا اور جب تم اس طرح اس مقصدِ بلند کے قابل ہوگئے تو تمہیں وحی عطا ہوئی ۔ یہ نہیں کہ تم یونہی آگ

لینے کو اُدھر آنکلے اور ہم نے نبوّت کا تاج تمہارے سر پر رکھ دیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ ایک ہونے والے نبی کو پہلے ہی دن سے منصبِ نبوّت کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے خود اس کا علم نہیں ہوتا۔ وَمَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ (۴۲/۵۲)۔ اس لئے کہ نبی کے اپنے کسب و ہُنر کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔ لیکن نبی کے سینے کو ایسی گراں بہا متاع کا امین بننے کے لئے خاص طور پر تیار کیا جاتا ہے اس مقصدِ عظیم کے لئے نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس میں کیا کیا خصوصیتیں پیدا ہوئی تھیں۔ سورۂ والنجم کی اگلی آیات میں ان کا ذکر ہے۔ اس کے لئے قرآن نے سب سے پہلے ایک لفظ استعمال کیا ہے۔ فَاسْتَوٰی (۵۳/۶)۔ دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا لفظ ہے لیکن معنویت کے اعتبار سے اس قدر جامع ہے کہ انسانی ذات کے معراجِ کبریٰ کی ساری تابانیاں اس کے اندر مرتکز ہو گئی ہیں۔ اس کے مفہوم کے لئے یوں سمجھو جیسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں کہتے ہیں (BALANCED PERSONALITY)۔ وہ ذات جس میں انسانیت کی مضمر صلاحیتیں مکمل طور پر نشو و نما پا کر، پورے پورے اعتدال اور حسنِ توازن و تناسب کے ساتھ جمع ہوں۔ جس میں انسانی قوتیں اور جوہر انتہائی اعتدال کے ساتھ جلوہ فرما ہوں سلیم! تم سوچو کہ ارتقائے شرفِ انسانیت میں اس سے بڑا مقام اور کونسا ہو سکتا ہے۔ یہ ہے وہ پہلی خصوصیتِ کبریٰ جس سے مقامِ محمدیؐ کی ابتداء ہوتی ہے یعنی حسنِ سیرت کی کمالِ زیبائی و رعنائی۔ مختلف صفاتِ انسانیہ کا پورا پورا اعتدال۔ خدا نے خود اپنے متعلق "اسماء الحسنیٰ" کہا ہے تو اس کا بھی یہی مطلب ہے۔ یعنی وہ ذات جس میں تمام صفات (اسماء) اپنی مکمل صورت میں بایں انداز جمع ہوں کہ ان میں پورا پورا تناسب پایا جائے۔ تناسب (PROPORTION) کا اعتدال ہی در حقیقت حسن ہے۔ حسنِ عمل بھی وہی ہے جس میں صحیح صحیح تناسب و اعتدال ہو۔ صحیح اعمال وہ ہیں جن میں صفاتِ خداوندی کی جھلک ہو۔ لیکن ان میں اعتدال کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اسی لئے قرآن میں ہے۔ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْهُ بِهَا تمام صفات، کامل اعتدال کے ساتھ، حسن کارانہ انداز سے خدا کی ذات میں جمع ہیں۔ اُسے انہی صفات کے ساتھ پکارو یعنی اپنی ذات میں انہی صفات کو اُجاگر کرو۔ لیکن پورے اعتدال و تناسب کے ساتھ وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِهٖ (۷/۱۸۰)۔ اور جو لوگ اس کی صفات میں (افراط و تفریط سے) کسی ایک طرف نکل جاتے ہیں۔ ان سے کوئی واسطہ نہ رکھو۔ تم نے دیکھا کہ یہاں اعتدال پر کس قدر زور دیا گیا ہے۔ یعنی جو کسی ایک صفتِ خداوندی میں اعتدال کا دامن چھوڑ کر افراط اختیار کر لیتے ہیں، وہ صحیح راستے پر نہیں۔ یہاں "الحاد فی الاسما" کہا ہے۔ سورۂ حٰمٓ سجدہ میں الحاد فی الآیات یعنی آیاتِ خداوندی میں کسی ایک طرف نکل جانے کو باطل کی راہ کہا ہے (۴۱/۴۰)۔ مومن وہ ہیں جو صراطِ مستقیم پر چلتے ہیں۔ یعنی توازن بدوش راہ پر جس میں افراط ہو نہ تفریط۔ یہی لوگ منعم علیہ ہیں۔ یعنی جنہیں زندگی کی تمام خوشگواریاں نصیب

ہیں ۔ اسی درخشندہ فہرست کا سرعنوان، مقامِ محمدیؐ ہے جسے قرآن نے فاستوٰی سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی صفاتِ خداوندی کو (علیٰ حدِ بشریت) پورے پورے اعتدال کے ساتھ لئے ہوئے۔

یہ ہوا سیرت کا کمال۔ اب آگے بڑھو۔ ارشاد ہے، وَھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی (۵۳/۷)۔ اُفق کے معنی (HORIZON) یا زمین کے آخری کنارے کے ہیں۔ اس میں وسعت کی انتہا آجاتی ہے، اور جب اس کے ساتھ " اعلیٰ " کا لفظ آجائے تو اس میں وسعتیں اور بلندیاں دونوں شامل ہو جاتی ہیں۔ تم سطحِ زمین پر کھڑے ہو کر دیکھو تو تمہاری افق (وسعتِ نگاہ) بہت قریب ہوگی۔ کسی اُونچی عمارت پر کھڑے ہو کر دیکھو تو تمہاری اُفق کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔ اور جب تم کسی بلند ترین (اعلیٰ) مقام پر کھڑے ہو تو وسعت اپنی انتہا تک پہنچ جائے گی۔ لہٰذا بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی سے مراد یہ ہے کہ نبی کا علم اپنی وسعتوں اور بلندیوں میں انتہا تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں عام طور پر نبی کے معنی پیش گوئیاں کرنے والا یا خبریں دینے والا کئے جاتے ہیں (یعنی اسے نباء سے مشتق مانا جاتا ہے)۔ نبوت کا یہ تصور درحقیقت یہودیوں کے ہاں سے آیا ہے۔ اُن کے ہاں ہیکل (معبد) میں ایک بلند منصب کا حامل نبی کہلاتا تھا جس کا کام لوگوں کو آنے والے واقعات کے متعلق خبریں دینا رہا (اُن کی قسمت اور تقدیر بتانا) تھا۔ چنانچہ یہودی لٹریچر میں جن نبیوں کے قصے درج ہیں، وہ بالعموم ہیکل کے انہی منصب داروں سے متعلق ہیں۔ انگریزی میں اس لفظ (نبی) کا ترجمہ (PROPHET) ہوا یعنی (PROPHECIES) پیش گوئیاں کرنے والا۔ قرآن کی رُو سے نبی کے معنی اس سے مختلف ہیں۔ یہ لفظ نبوّۃ سے مشتق ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ لہٰذا نبی کے معنی ہیں جو بلند مقام پر کھڑا ہو۔ ھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی (۵۳/۷)۔ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ (۸۱/۲۳)۔ ان معانی کی وضاحت خود نبی اکرمؐ نے کر کے دکھا دی۔ جب آپؐ کو حکم ملا کہ خدا کا پیغام اپنے لوگوں تک پہنچائیں تو آپؐ مکّہ کے باہر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر کھڑے ہو گئے اور لوگوں کو (بالخصوص اپنے اہلِ خاندان کو) بلایا۔ جب وہ جمع ہو گئے تو آپؐ نے اُن سے کہا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑی کی دوسری طرف ایک لشکر جرار ہے جو تم پر چڑھائی کرنے کے لئے بڑھے چلا آرہا ہے تو تم میری بات کو سچ مانو گے یا نہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم اسے ضرور سچ مانیں گے۔ آپؐ نے پوچھا کہ تم اسے سچ کیوں مانو گے؟ اُنہوں نے کہا کہ ایک تو اس لئے کہ آپؐ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آگے بڑھنے سے پیشتر سلیم! ذرا اس ٹکڑے پر پھر غور کرو کہ اُنہوں نے کہا کہ آپؐ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ تم نے دیکھا کہ ایک بننے والے نبی کی زندگی، نبوت سے پہلے بھی کس قسم کی ہوتی ہے؟ اس قسم کی کہ وہ اپنی قوم میں صادق اور امین مشہور ہوتا ہے۔ اس کی زندگی ایک پاکباز اور دیانتدار انسان کی زندگی ہوتی ہے۔ ایسی پاکباز اور دیانتدارانہ زندگی کہ وہ

اسے اپنے دعوے کی صداقت کے لئے بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ چنانچہ جب نبی اکرمؐ نے نبوّت کا دعویٰ کیا تو آپؐ کی قوم نے کہا کہ آپ کوئی معجزہ دکھائیے تاکہ ہم یقین کرلیں کہ آپؐ واقعی خدا کے رسول ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○ (۱۰/۱۶)۔ میں تم میں کوئی اجنبی نہیں ہوں۔ میں کہیں باہر سے نہیں آیا کہ تم مجھے جانتے نہ ہو۔ میں نے اس دعوے سے قبل ساری عمر تم میں بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا؟ اگر تم ذرا بھی عقل و فکر سے کام لو تو یہ حقیقت تم پر واضح ہو جائے کہ جس شخص نے اپنی ساری عمر صداقت اور دیانت سے گزاری ہو، کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک ہی رات میں یوں بدل جائے کہ وہ اتنے بڑے جھوٹ اور فریب پر اتر آئے؟ لہٰذا میری گزشتہ زندگی میرے دعویٰ کی صداقت کی دلیل ہے۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔

ہاں! تو ان لوگوں نے کہا کہ ہم آپ کی بات کا اس لئے یقین کرلیں گے کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور دوسرے اس لئے کہ آپ اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں سے آپ پہاڑی کے اس طرف بھی دیکھ سکتے ہیں اور اس طرف بھی۔ ہم اس جگہ ہیں جہاں سے ہم اس طرف دیکھنے کے قابل نہیں۔

آپؐ نے فرمایا کہ میں یہی بات تم سے کہنا چاہتا تھا۔ مجھے خدا نے علم کی اس بلندی پر فائز کیا ہے جہاں سے میں اس دنیا کو بھی دیکھ سکتا ہوں جہاں سے حقائق کائنات ابھرتے ہیں۔ اور اس دنیا کو بھی جہاں یہ منطبق (APPLY) ہوتے ہیں۔ اسے مقامِ نبوّت یا وحیِ خداوندی کہتے ہیں۔

یہی ہے سلیم! وہ اُفُقِ الْاَعْلٰی جس پر نبی فائز ہوتا ہے۔ جہاں سے وہ اس دنیا کو بھی دیکھتا ہے جو دوسرے انسانوں کی نگاہوں، بلکہ قیاس و خیال و گمان و وہم تک سے اوجھل ہے۔ اور اس دنیا کو بھی جہاں انسان بستے ہیں۔ وہ علم کی ان بلندیوں پر ہوتا ہے۔

اب اگلی آیت کی طرف آؤ۔ تم دنیا کے بڑے بڑے فلاسفرز (مفکّرین) کی زندگی کو دیکھو۔ بالعموم یہ نظر آئیگا کہ اُن کے افکار (THOUGHTS) بہت بلند ہونگے۔ وہ کائنات کے عظیم حقائق سے بحث کریں گے۔ لیکن ان حقائق کی جھلک اُن کی اپنی سیرت و کردار میں بہت کم دکھائی دے گی۔ یعنی اُن کی فکر، ان کی عقل (INTELLECT) کی بلندی، اور اُن کی عملی زندگی میں بہت بُعد ہو گا۔ لیکن نبی کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ وہ علم کے اُفقِ اعلیٰ پر فائز ہونے کے ساتھ عملاً بھی حقائقِ کائنات سے بہت قریب ہوتا ہے۔ ثُمَّ دَنَا (۵۳/۸)۔ ان حقائق میں اور اس کی اپنی زندگی میں قطعاً بُعد نہیں ہوتا۔

زندگی کو ان حقائق سے ہم آہنگ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان حقائق کا صرف فکری طور پر ہی ادراک نہیں کرتا، بلکہ وہ ان کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ فَتَدَلّٰی (۵۳/۸)۔ وہ ضمیرِ کائنات کے عمق (DEPTHS) تک جا پہنچتا ہے۔

جوڈ (JOAD) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کسی انسان میں علم کی وسعت ہو تو وہ مفکر (یعنی فلاسفر) ہوتا ہے اور اگر اس میں جذبات کی گہرائی ہو تو وہ تخلیقی نابغہ (CREATIVE GENIUS) ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ نبی کی ذات میں علم کی بلندیاں، حقائق کی وسعتیں اور تخلیقی جذبات کی گہرائیاں اپنے انتہائی اعتدال کے ساتھ یکجا جمع ہوتی ہیں۔ ان خصوصیات کے بعد وہ سینہ وحی کے علم کا مہبط بنتا ہے[1]

یہ ہے سلیم! علم و جذبات و کردار کے اعتبار سے مقامِ محمدیؐ کی ایک جھلک، جو قرآن کے ان درخشندہ موتیوں میں اس طرح جھلمل جھلمل کرتی دکھائی دیتی ہے۔

اب یہ دیکھو کہ اس قدر عظیم علم (وحی) پانے کے بعد نبی کا فریضہ کیا قرار پاتا ہے؟ اس کا منصب کیا ہوتا ہے؟ یہیں سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ نبی محض (معاذ اللہ) ایک آلۂ ابلاغ (پیغام پہنچانے والا ریڈیو سیٹ) نہیں ہوتا۔ اس کا مشن اس سے آگے کچھ اور بھی ہوتا ہے۔

تم، علامہ اقبالؒ کے مجموعۂ خطبات (LECTURES) سے واقف ہو۔ انہوں نے اپنے پانچویں لیکچر کا افتتاح اس طرح کیا ہے۔

> محمدؐ عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔
>
> یہ الفاظ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ (عبدالقدوس گنگوہیؒ) کے ہیں۔ تصوّف کے تمام لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے جو ایک فقرے کے اندر شعورِ نبوّت اور تصوّف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجرد گاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا۔ اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس، ایک

---

[1] وحی کے اتباع سے ایک مردِ مومن میں بھی علم و حقائق کی وسعتیں اور گہرائیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن اس سے وہ وحی کا حامل نہیں بن سکتا۔ وحی میں نبی کے سوا اور کوئی شریک نہیں ہوتا۔

نبی کی مراجعت تخلیقی مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانے کے طوفان پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے۔ اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ ایک صوفی کے لئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجرد گاہ آخری مقام ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک صاحب وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آگئی ہے، وہ کس انداز کی ہے۔

(خطبات اقبال)

میں اس وقت، ان تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ تصوّف کی حقیقت کیا ہے اور جس چیز کو کشف و الہام کہا جاتا ہے اس کی ماہیت کیا ہے؟ ان امور کے متعلق کسی دوسرے وقت لکھوں گا[1]۔ اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ مقامِ نبوّت رفعتِ افلاک کی بلندیوں تک پہنچنا تو ایک طرف، صوفی کا گذر ان دوائر میں بھی نہیں ہو سکتا جن سے وحی کا نزول ہوتا ہے۔ صوفی کے تمام کمالات اس کے اپنے کسب و ہنر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس نبوّت ایک یکسر وہبی عطیہ ہے جس میں نبی کے اپنے کسب و ہنر کو (تو ایک طرف اختیار و ارادہ کو) بھی دخل نہیں ہوتا۔ جس چیز کو تصوّف کی دنیا میں روحانی ترقی سمجھا جاتا ہے وہ دراصل انسان کی بعض نفسیاتی قوّتوں کی بیداری اور نشوونما ہوتا ہے۔ یہ اس کی اپنی داخلی قوتیں ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس، وحی، خارج سے انکشافِ حقیقت کا نام ہے جسے "نزول" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے وحی کی بنیادی خصوصیت اس کی (OBJECTIVITY) ہے۔ لہٰذا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ صوفی اس مقام تک پہنچ کر جہاں سے نبی کو وحی ملتی ہے واپس آ سکتا ہے یا نہیں۔ جو وہاں پہنچ ہی نہیں سکتا، اس کی واپسی کا کیا ذکر؟ جس مقصد کے لئے میں نے اس اقتباس کو لکھا ہے وہ یہ ہے کہ جب نبی پر انکشافِ حقیقت ہوتا ہے (یعنی اسے وحی ملتی ہے) تو اس سے مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ ان حقائقِ مستور کے پُر کیف مناظر سے اپنے طور پر ہی لذّت اندوز ہوتا رہے اور ان کی حیرت انگیز کیفیات میں اس قدر مستغرق ہو جائے کہ صوفیوں کی طرح اس کی بھی (معاذ اللہ) یہ حالت ہو جائے کہ

کاں را کہ خبر شد خبرش باز نہ آید

---

[1] اس موضوع پر پرویز صاحب کی کتاب "تصوّف کی حقیقت" ۱۹۸۱ء میں شائع ہو گئی ہے۔

نبی کو وحی اس لئے نہیں ملتی۔ اُسے وحی اس لئے ملتی ہے کہ وہ اسے لے کر انسانوں کی طرف آئے اور ظلم و استبداد کی ان تمام طاغوتی قوتوں کو جو عالمِ انسانیت میں فساد برپا کر رہی ہوں، راستہ سے ہٹا کر انسانی معاشرے کو قوانین خداوندی کے خطوط پر متشکل کر دے۔ بالفاظِ دیگر، وہ عالمِ انسانیت میں خدا کے پروگرام کی تکمیل کا ذریعہ بنے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف (داستانِ حضرت موسیٰ میں) یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے کہ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِى (۲۰/۴۱) ہم نے تجھے (اے موسیٰؑ! اس طرح) اپنی ذات کے لئے تیار کیا۔ اس میں لِنَفْسِى کا ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ گویا خدا کا ایک پروگرام تھا جس کی تکمیل کے لئے اس نے صاحبِ کلیم کو اس طرح (درجہ بدرجہ منزل بہ منزل) تیار کیا۔ وہ پروگرام کیا تھا۔ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۰/۴۳)۔ تم دونوں، (حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ) فرعون کی طرف جاؤ اس لئے کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ وہ حد سے نکل گیا ہے۔ یعنی ایک نبی کو وحی اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ مظلوم انسانیت کو مستبد اور سرکش قوتوں کے پنجۂ آہنی سے چھڑا کر خدا کے قوانین کے تابع لے آئے۔ یہ نقطہ، عزیزم! مزید وضاحت کا متقاضی ہے۔ تم نظامِ کائنات پر غور کرو۔ وہاں ہر شے خود بخود قوانینِ خداوندی کے مطابق مصروف کار ہے۔ جس کے سپرد جو کام کیا گیا ہے وہ اس کی تکمیل کے لئے ہر وقت رقصاں و جنباں ہے۔ لیکن انسان کو چونکہ صاحبِ ارادہ پیدا کیا گیا ہے اس لئے اسے اختیار حاصل ہے کہ یہ چاہے تو قانونِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے اس سے سرکشی اختیار کر کے دوسری روش پہ چل نکلے۔ جب مستبد قوتیں قانونِ خداوندی کے راستے کو چھوڑ کر، اپنے خود ساختہ قوانین کے مطابق نظام قائم کر لیتی ہیں، تو زیر دست انسان اُن کے پاؤں تلے بُری طرح روندے جاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ خدا کا قانونِ مکافات، ان سرکش قوتوں کے اعمال کے نتائج مرتب کر رہا ہوتا ہے۔ اور ان نتائج کو ایک دن اُن کے سامنے بھی آنا ہوتا ہے۔ لیکن یہ کچھ خدا کے کائناتی قانون کے حساب و شمار کے مطابق ہوتا ہے جس میں (قرآن کے الفاظ میں) ایک ایک دن ہزار ہزار سال (۳۲/۵) اور پچاس پچاس ہزار سال (۷۰/۴) کا ہوتا ہے۔ لیکن اگر خدا کے اس قانونِ مکافات کے ساتھ انسان کا ہاتھ بھی لگ جائے تو یہی نتائج انسانوں کے ماہ و سال کے حساب سے مرتب ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔ اور جن سرکش قوموں نے صدیوں کے بعد جا کر تباہ ہونا تھا وہ دنوں میں سرنگوں ہو کر وجۂ نجاتِ انسانیت بن جاتی ہیں۔ بالفاظ دیگر، یوں سمجھو کہ جب انسان خدا کا رفیق بن جائے تو پھر خدا کے پروگرام (مشیت) کی تکمیل انسانی حساب و شمار کے مطابق ہو جاتی ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن میں بانداز دگر بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ سجدہ میں ہے، يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ۔ قانونِ خداوندی کے مطابق تدبیرِ امور کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنی ہر اسکیم کو اس کے پست ترین نقطہ سے شروع کرتا ہے۔ اور اسے اس کے نقطۂ آخرین تک پہنچنا ہوتا ہے۔ وہ اسکیم

اپنے نقطۂ آغاز سے بلند ہونا شروع ہوتی ہے۔ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (۳۲/۵)۔ اور اس طرح اوپر اٹھتی جاتی ہے (خدا کی طرف بلند ہوتی جاتی ہے) ایک ایک ارتقائی مرحلہ میں جس کی مقدار تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے۔ اسی کو سورۂ فاطر میں یوں کہا گیا ہے کہ إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ۔ خوشگوار نظریۂ حیات اُس کی طرف بلند ہوتا ہے۔ اس کا یہ بلند ہونا خدا کے کائناتی قانون کے حساب و شمار کے مطابق ہوتا ہے (جس کی طرف اُوپر اشارہ کیا گیا ہے)۔ اس کے آگے ہے۔ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (۳۵/۱۰)۔ اور عمل صالح اسے رفعت عطا کر دیتا ہے۔ یعنی ویسے تو وہ خدا کے کائناتی قانون کے مطابق بلند ہوتا ہی ہے، لیکن اگر اس کے ساتھ انسان کے اعمال صالح بھی شامل ہو جائیں تو یہ اس کی رفتار یا ترقی (SPEED OR PROGRESS) کو تیز تر (ACCELERATE) کر دیتے ہیں۔ انسان کی رفاقت کے بغیر وہ صرف اپنے زور دروں سے اُوپر چڑھتا تھا اس کی رفاقت اسے خارجی قوت کا سہارا دے کر، جلد تر بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے۔ خدا اور انسان کا یہ حسین تعلق (یعنی رشتۂ رفاقت) وہ عظیم حقیقت ہے جس کی طرف نبی اکرمؐ نے اپنی زندگی کے آخری سانس میں ان الفاظ سے اشارہ فرمایا بَلْ هُوَ الرَّفِيقُ الْأَعْلَىٰ۔ خدا رفیق اعلیٰ ہے یعنی اس پروگرام کی تکمیل میں انسان رفیقِ ادنیٰ ہوتا ہے۔ اور خدا رفیق اعلیٰ۔ لیکن تعلق ان کا رفاقت ہی کا ہوتا ہے۔ یعنی انسان کا قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ ہونا۔

اس پس منظر کی روشنی میں آگے بڑھو۔ عربوں میں قاعدہ تھا کہ جب دو دوست آپس میں گہری رفاقت کا معاہدہ کرتے تو دونوں اپنی اپنی کمانیں ملاتے اور اس طرح کہ دونوں کا چلّہ ایک ہو جاتا، یعنی وہ کمانیں تو دو ہوتیں لیکن اُن کا چلّہ ایک ہوتا۔ اس چلّہ میں ایک تیر رکھتے۔ ان میں سے ایک دوست کمان کو پکڑتا اور دوسرا چلّہ کو کھینچتا اور اس طرح دونوں مل کر تیر چلاتے۔ اس محکم معاہدۂ رفاقت کو وہ قاب قوسین (دو کمانوں کے ایک چلّہ) سے تعبیر کرتے۔

قرآن نے کہا کہ جب نبی اکرمؐ کی ذات اقدس میں شرفِ انسانیت کے مختلف عناصر یک جا جمع ہو کر اعتدال تک پہنچ گئے اور علم وحقائق کی دنیا میں آپ کو انتہائی بلندیاں، وسعتیں اور گہرائیاں حاصل ہو گئیں تو اس کے بعد فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ (۵۳/۹)۔ آپؐ کا خدا کے قوانین کے ساتھ انتہائی رفاقت کا تعلق قائم ہو گیا۔ یوں سمجھو کہ رسول اللہؐ نے خدائی پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کا پختہ عہد دے دیا۔ اس عہد وپیمان کے بعد وہ انسانوں کی دنیا کی طرف تشریف لائے۔ حالی کے سادہ اور حسین الفاظ میں، یہ داعیٔ انقلاب، تاجِ نبوت سے سرفرازی کے بعد سے

اُتر کر حرا[1] سے سوئے قوم آیا — اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

[1] غار حرا اور پہلی وحی کے متعلق جو کچھ ہمارے ہاں مشہور ہے اس کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں۔ یہاں حرا سے ہمارا مقصود نبوت کا ملنا ہے۔

اس نقطۂ نگاہ سے دیکھو تو نبوّت اس منصب کو کہیں گے جس کی رُو سے نبی کو وحی ملتی ہے اور رسالت وہ منصب ہے جس کی رُو سے وہ وحی کی روشنی میں انسانی معاشرے میں آسمانی انقلاب پیدا کرتا اور اس طرح عملاً وحی کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اس میں وہ قطعاً بخل نہیں برتتا۔ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ (۸۱/۲۴)۔ اس اعتبار سے نبوّت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو گوشے اور ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایک ہی شخصیت کو کہیں نبی کہہ کر پکارا ہے اور کہیں رسول کہہ کر۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ نبی اُسے کہتے ہیں جو صاحبِ کتاب نہ ہو اور رسول اسے جسے کتاب ملی ہو، قرآن سے یکسر لاعلمی کی دلیل ہے۔ قرآن کی رُو سے ہر نبی، یعنی ہر رسول کو کتاب ملتی تھی (دیکھئے ۲/۲۱۳ و ۵۷/۲۵)۔

ہاں! تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ ایک نبی، وحی کی جگمگاتی قندیل کو ہاتھ میں لئے، دنیائے انسانیت کی طرف آتا ہے تاکہ انسانی معاشرے کو کائناتی قوانین سے ہم آہنگ کر کے، خدا کے پروگرام کی تکمیل کرے۔ اور جس طرح اسکی بادشاہت آسمانوں (خارجی کائنات) میں ہے اسی طرح زمین پر بھی اس کی حکومت ہو جائے۔ اس طرح رسول اور اس کے ساتھی خدا کے انصار اور رفیق بن جاتے ہیں۔ اب جو کام ان کے ہاتھوں سے سرزد ہوتے ہیں، انہیں خدا خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے (مثلاً) جنگِ بدر میں جو تلواریں محمد رسول اللہؐ وَ الَّذِينَ مَعَهُ کے مقدس ہاتھوں سے اُٹھیں اور جو تیر اُن کی کمانوں سے نکلے اُن کے متعلق خدا نے کہا کہ وہ کچھ میں نے کیا تھا۔ فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ۔ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (۸/۱۷)۔ تم نے انہیں قتل نہیں کیا اللہ نے قتل کیا ہے۔ تم نے ان پر تیر اندازی نہیں کی، خود اللہ نے کی ہے۔ غور کرو سلیم! کہ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ کی کیسی دلنشیں پیرایہ میں تشریح کی گئی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے غالب نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ ؎

تیرِ قضا ہر آئینہ از ترکشِ حق است
لیکن کشودِ آں زکمانِ محمدؐ است

مقامِ رسالت کی اس سے بہتر انداز میں تصویر کشی شاید ہی کہیں اور مل سکے۔

علم و عمل کے ان تمام بلند ترین گوشوں کو سامنے لانے کے بعد، قرآن نے کہا ہے کہ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ (۵۳/۱۰)۔ جب یہ "عبد" (نبی اکرمؐ) اس مقام تک پہنچ گیا تو پھر خدا نے اسے وحی کی خلعت سے سرفراز کیا۔ یہ مرتبۂ بلند ہر کسی کو نہیں مل جایا کرتا۔ اتنی عظیم خصوصیات کا حامل ہوتا ہے وہ سینہ جسے وحی کا مہبط بننا ہوتا ہے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے حضورؐ کے لئے عبدہٗ کا لفظ کس مقام پر جا کر استعمال کیا ہے؟ اس سے تم نے اندازہ

لگا لیا ہو گا کہ مقام عبدیّت کیا ہے؟ یہ وہ مقام ہے جس کے تصوّر سے نگاہوں میں چمک، ذہن میں جلا اور قلب میں نور پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ اکبر۔ کتنا بلند ہے مقام عبدیّت۔ تم دیکھو گے کہ قرآن نے جہاں نزول وحی کا ذکر کیا ہے وہاں عام طور پر عبد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ (۱۸/۱)۔ تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ (۲۵/۱)۔ ھُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِہٖٓ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ (۵۷/۹) اسی لئے قرآن نے ہر رسول کو عبد کہا ہے۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھو۔ ایک شخص خواب میں کچھ محیر العقول باتیں دیکھتا ہے۔ جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خواب میں دیکھے ہوئے مناظر پر خود ہی ہنس دیتا ہے، اس لئے کہ اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ ایسی باتیں فی الواقعہ صحیح نہیں ہو سکتیں۔ قرآن کہتا ہے کہ نبی جن حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے، یعنی جو علم اسے وحی کی بناء پر حاصل ہوتا ہے، وہ خواب کا سا علم نہیں ہوتا کہ آنکھیں دیکھیں اور دل اس کی تردید کرے۔ اس کا دیکھنا علم و یقین کا دیکھنا ہوتا ہے۔ جو کچھ وہ دیکھتا ہے اس کا دل اس کی کبھی تکذیب نہیں کرتا۔ مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی (۵۳/۱۱)۔ یہ وجہ ہے کہ نبی اپنی وحی پر سب سے پہلے خود ایمان لاتا ہے۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (۲/۲۸۵)۔ جو کچھ اس کے رب کی طرف سے اس پر اتارا جاتا ہے رسول (سب سے پہلے) خود اس پر ایمان لاتا ہے۔ اور (پھر باقی) مومنین۔ اس لئے رسول کا اعلان یہ ہوتا ہے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (۶/۱۶۴)۔ میں سب سے پہلے اپنی وحی کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔

قرآن نے اس مقام پر ایمان کے لئے دل کی شہادت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس حقیقت کو اس نے سورۂ منافقین میں ایک اور انداز سے بیان کیا ہے۔ سورت کی ابتداء یوں ہوتی ہے کہ اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْھَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ (اے رسول، جب منافق تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو یقیناً اللہ کا رسول ہے۔ اس کے بعد ہے۔ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُہٗ۔ اللہ کو اس کا علم ہے کہ یقیناً تو اس کا رسول ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ منافقین ایسی بات کہتے ہیں جو امر واقعہ ہے اور جس کی شہادت خود اللہ دے رہا ہے۔ اسلئے منافقین کے سچا ہونے میں بظاہر کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ لیکن اس کے آگے ہے کہ وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ (۶۳/۱-۲)۔ اور اللہ اس کی بھی شہادت دیتا ہے کہ یہ منافقین یقیناً جھوٹے ہیں۔ تم غور کرو کہ قرآن نے یہاں کتنی بڑی حقیقت بیان کی ہے اور کیسے دلنشیں پیرایہ میں۔ اس نے کہا یہ ہے کہ منافقین زبان سے جو کچھ کہتے ہیں وہ تو

بالکل سچی حقیقت ہے لیکن چونکہ ان کا دل اس کی شہادت نہیں دیتا اس لئے یہ جھوٹے ہیں۔ اس سے قرآن نے کذب کی ایک واضح اور محکم تعریف (DEFINITION) بیان کر دی ہے۔ یعنی جب تک کسی کا قلب اور زبان ہم آہنگ نہ ہوں، اسے سچا نہیں کہہ سکتے۔ کذب وہ ہے جس میں قلب اور زبان میں ہم آہنگی نہ ہو۔ ایک شخص زبان سے ایک ایسی بات کہتا ہے جو بالکل سچی ہے۔ لیکن اگر اس کا دل اس کی تصدیق نہیں کرتا تو وہ کاذب ہے۔ صادق نہیں ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الٰہ الا لُو
لغت غریب جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

ایمان یہ ہے کہ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى (۵۳/۱۱)۔ جو کچھ آنکھیں دیکھیں دل اس کی تکذیب نہ کرے۔ نبی اپنی وحی پر اسی طرح ایمان لاتا ہے۔ وہ حقائق کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اس کا دل ان کی تصدیق کرتا ہے۔ اسکے بعد قرآن ضمناً ان لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے جو نبی کی اس وحی کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ تم ہمیشہ کہتے یہ ہو کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ لیکن عملاً تمہاری حالت یہ ہے کہ تم رسولؐ سے اس بات پر جھگڑتے ہو جسے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بیان کرتا ہے۔ أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ (۵۳/۱۲) کتنی بڑی ہے تمہاری یہ بھول اور کس قدر غیر معقول ہے تمہاری یہ مخالفت؟

اس ضمنی گوشے کے بعد قرآن پھر اسی موضوع پر آجاتا ہے اور اگلی آیت میں ایک اور عظیم حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ وحی، خواب نہیں ہوتا حقیقت کا حتمی مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس چیز کو اس نے بانداز دگر بیان کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ کسی خواب کو انہی تفاصیل، جزئیات، ربط اور تسلسل کے ساتھ کبھی دوبارہ نہیں دیکھ سکتے۔ یہ نفسیاتی ناممکنات میں سے ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ نبیؐ کی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اسے خواب مت سمجھو۔ اس لئے کہ وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ (۵۳/۱۳)۔ اس نے اسے بار دگر بھی دیکھا ہے۔ اور فی الحقیقت (لَقَدْ رَآهُ) دیکھا ہے۔ اس لئے اس کا یہ دیکھنا خواب کا دیکھنا نہیں۔ جو لوگ وحی کو خواب پر محمول کرتے ہیں۔ یا خوابوں کو از قبیل وحی تصور کرتے ہیں انہیں سوچنا چاہیئے کہ یہ ان کی کتنی بڑی غلطی ہے۔ وحی خواب نہیں ہوتا حقیقت کا یقینی مشاہدہ ہوتا ہے اور بار بار ہوتا ہے۔

اس کے بعد قرآن، وحی کے ایک اور بنیادی گوشے کو سامنے لاتا ہے۔ ایک طرف جذبات پرست ہیں جو خوابوں کو بھی از قبیل وحی قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف عام مفکرین (فلاسفرز) ہیں جن کا خیال ہے کہ وحی، انسانی فکر

(INTELLECT) ہی کی ایک بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے۔ برگساں نے وجدان (INTUITION) کے متعلق کہا ہے کہ وہ فکر ہی کی بلند سطح (HIGHER FORM OF INTELLECT) ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض لوگ وجدان کو وحی پر محمول کر لیتے ہیں۔ مغربی مفکرین کا رجحان اسی طرف ہے۔ قرآن نے جہاں اس تصوّر کی تردید کی ہے کہ خواب بھی وحی ہوتے ہیں وہیں واضح الفاظ میں اس کا بھی اعلان کر دیا کہ وحی فکر انسانی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام نہیں۔ وحی کا مقام وہ ہے جہاں عقل انسانی کے لئے حیرت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (۵۳/۱۴)۔ نبیؐ نے ان حقائق کو سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى کے قریب دیکھا۔ عربوں میں اَلسادِرُ اس شخص کو کہتے ہیں جو متحیر ہو جائے۔ سَدِرَ بَصَرُہٗ سَدْرًا کے معنی ہیں گرمی کی شدت کی وجہ سے اس کی نگاہیں حیران و ششدر رہ گئیں[1]۔ اس لئے نبی کو جس مقام پر وحی ملتی ہے وہاں عقل انسانی کے لئے سوائے تحیر کی فراوانیوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ انسانی عقل وہاں ششدر و حیران رہ جاتی ہے۔ یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں کہ وہ اس مقام اور اس کی کیفیت کا مشاہدہ یا اندازہ کر سکے۔

لیکن اگر عقل انسانی مقام وحی کی کنہ و حقیقت کو نہیں سمجھ سکتی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ عقل، وحی کے حقائق سے مستفید بھی نہیں ہو سکتی۔ وحی کی تعلیم انسان کی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اسی لئے قرآن نے بار بار فکر و تدبّر اور عقل و شعور سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔ اس تعلیم کا سمجھنا اس لئے ضروری ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اور اس پر عمل کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اس دنیا میں بھی جنّتی معاشرہ قائم ہو سکے اور اس کے بعد کی زندگی بھی جنّت کی ہو۔ لہٰذا وہی عقل جو مقام نبوّت کی کنہ و حقیقت کے سمجھنے سے یکسر قاصر ہے وہ اگر وحی کے پیغام کا اتباع کرے تو جنّت کی خوشگواریاں اس کے حصّہ میں آ سکتی ہیں۔ اس لئے کہ مقام وحی اگر عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ہے تو عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (۵۳/۱۵) جنّت بھی اسی کے پاس ہی ہے[2]۔ جو شخص عقل کی رو سے مقام نبوّت کو اپنے حیطۂ ادراک میں لانے کی سعی لاحاصل کرتا ہے اس کے حصّہ میں حیرت کی فراوانیوں کے سوا کچھ نہیں آتا۔ لیکن جو شخص عقل و بصیرت کی رو سے وحی کے پیغامات کو عملی نظام میں متشکل کرتا ہے وہ اپنے آپ اور اپنے ساتھ باقی انسانیت کو جنّت کے آغوش میں لے آتا ہے، جہاں وہ

---

[1] السّدیرُ پانی کے منبع اور سرچشمہ کو بھی کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى کے معنی علم الٰہی کے ہوں گے جو تمام حقائق کا سرچشمہ ہے۔

[2] اگر سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى کے معنی علم الٰہی کے لئے جائیں تو عندھا جنت الماوی سے مراد یہ ہو گی کہ جن لوگوں کی کشت امل وحی الٰہی کے پانی سے سیراب ہو، وہ جنت کے مالک ہوں گے۔

اضطراب باقی نہیں رہتا جو عقل کی نارسائی کی وجہ سے قدم قدم پر اس کے لئے وجۂ خلش بنتا تھا یہی وجہ ہے کہ اہلِ جنت کے متعلق کہا ہے کہ وہ فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ (۵۶/۲۸)۔ ہوں گے یعنی ان "بیریوں" کے نیچے جن کا سایہ آرام دِہ اور پھل خوشگوار ہوں گے۔ لیکن جن میں کانٹے نہیں ہوں گے۔ ایسی حیرت جس میں تشکوک کی خلش نہ ہو۔ بہر حال وحی کا مقام وہ ہے جہاں عقل انسانی بار ہی نہیں پا سکتی۔ جہاں عام انسان کی آنکھ کے لئے تحیر ہی تحیر ہوتا ہے وہاں نبی کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب ان تحیر کی وادیوں پہ ہر طرف سے علم الٰہی چھایا ہوا ہوتا ہے اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی (۵۳/۱۶)۔ تو اس کی آنکھ اس مقام پر بھی ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہوتی۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ (۵۳/۱۷)۔ وہ ذرا نہیں جھپکتی۔ غور کرو کہ عقل انسانی اور نگۂ نبوی میں کتنا عظیم فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق درجہ (DEGREE) یا کمیت کا (QUANTITATIVE) نہیں ہوتا۔ یعنی یہ نہیں کہ ایک ذرا نیچے ہے اور دوسری ذرا اُوپر۔ یہ فرق اصل و بنیاد کا فرق ہوتا ہے۔ کمیت کی بجائے کیفیت کا (QUALITATIVE) ہوتا ہے عقل انسانی کسب و ہنر سے اُس مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ لیکن اس مقام سے ملے ہوئے پیغامات سے نفع یاب ہو سکتی ہے۔ یہ تو ہے نگۂ نبوت کا تقابل عقل انسانی سے۔ یعنی عقل انسانی کے مقابلہ میں نگۂ نبوت حد و دفراموش ہوتی ہے۔ لیکن جب اس کا مقابلہ علم خداوندی سے کیا جائے تو علم نبوی لامحدود اور لامنتہا نہیں ہوتا۔ نبوت کی آنکھ اُس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی جو اس کے لئے علم خداوندی نے مقرر کر رکھی ہو۔ اس لئے مَا زَاغَ الْبَصَرُ کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ وَمَا طَغٰی (۵۳/۱۷)۔ وہ نگاہ، جہاں تحیر کی فراوانیوں کے باوجود ذرا اپنے مقام سے اِدھر اُدھر نہیں ہوتی، وہاں وہ اُس حد سے بھی تجاوز نہیں کر سکتی جو اس کے لئے متعین ہوتی ہے۔ اس لئے کہ نبی کا علم (وحی) کتنا ہی بلند اور وسیع کیوں نہ ہو وہ بہر حال، خدا کا عطا کردہ اور علم خداوندی کے مقابلہ میں محدود ہوتا ہے۔ انسانوں کے مقابلہ میں وحی کا مقام وہ ہے جہاں انسانی علم و عقل کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن علم خداوندی کے مقابلہ میں یہ لا انتہا نہیں۔

مقام نبوت کے متعلق ان تصریحات کے بعد، قرآن چند لفظوں میں بتاتا ہے کہ نبی اس بلند مقام پر پہنچ کر دیکھتا کیا ہے؟ اس مقام پر قرآن نے وحی کی تفصیل کو چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی (۵۳/۱۸)۔ اُس نے اس مقام پر اپنے نشو و نما دینے والے کی آیات کبریٰ (عظیم نشانیوں) کو دیکھا۔ ان آیات کبریٰ سے مراد کیا ہے؟ اس کے لئے پھر داستان حضرت موسیٰؑ کی طرف آؤ۔ جب حضرت موسیٰؑ کو طور کی چوٹیوں پر وحی سے نوازا گیا تو اُن سے کہا گیا کہ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہے لِنُرِیَكَ مِنْ اٰیٰتِنَا الْکُبْرٰی (۲۰/۲۳)۔

تاکہ ہم تجھے اپنی آیات الکبریٰ دکھائیں۔ اس کے بعد ہے اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۰/۲۴)۔ فرعون کی طرف جا کیونکہ وہ بڑا ہی سرکش ہو گیا ہے۔ وہ حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحی پانے کے بعد نبی کے سامنے پروگرام یہ ہوتا ہے کہ وہ سرکش قوتوں کو ان کے ظلم و استبداد سے روکے اور مظلوم انسانیت کو ان کے دندانِ حرص و آز سے چھڑائے۔ وہ اس مقصدِ عظیم کو لے کر آتا ہے اور طاغوتی قوتوں کو قیامت خیز تصادمات کے بعد شکست دے کر قوانینِ خداوندی کے مطابق معاشرہ کی تشکیل جدید کرتا ہے۔ ان سرکش اور مستبد قوتوں کی اس طرح سے شکست اور ان کے غاصب و ظالم نظام کی جگہ، خدا کے نظامِ ربوبیت عالمینی کا قیام، وہ آیاتِ کبریٰ ہیں جن کا مشاہدہ نبیؑ کو کرایا جاتا ہے۔

یہ ہے عزیزم! قرآن کی روشنی میں نبیؑ کا مقام اور یہ ہے وہ فریضۂ عظیم جس کی ادائیگی کے لئے اسے اس منصب جلیلہ پر فائز کیا جاتا ہے۔ اس سے تم نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ نبی کا مقام خدا سے وحی پاکر اسے انسانوں تک پہنچا دینا ہی نہیں ہوتا بلکہ وحی کی روشنی میں نظامِ خداوندی کا قیام بھی ہوتا ہے۔ اور یہ مقصد بہت بلند اور یہ فریضہ بڑا اہم ہوتا ہے۔

نبوت، نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گئی۔ لہٰذا حضورؐ کے بعد کوئی شخص خدا کی طرف سے وحی نہیں پا سکتا۔ لیکن اس وحی کی روشنی میں نظامِ خداوندی کا قیام اور اس کے بعد اس کا تسلسل و استحکام وہ فرائض ہیں جو حضورؐ کی تشریف براری کے بعد، اُمت کے سپرد ہوئے۔ حضورؐ کے بعد اُمت نے کچھ وقت تک اس فریضہ کو سرانجام دیا۔ لیکن اس کے بعد بدقسمتی سے، یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی اور نظامِ خداوندی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب اُمت کا کام یہ ہے کہ اتباعِ نبوی میں پھر سے اُسی نظام کو قائم کرے تاکہ خدا کا دین متمکن ہو جائے اور جنت سے نکلا ہوا آدم پھر سے فردوسِ گم گشتہ کو پالے۔

اس حقیقت کو سلیم! اچھی طرح سن رکھو اور ساری دنیا کو سنا دو کہ انسان جو جی میں آئے کر کے دیکھ لے اس کی نجات و سعادت کی ایک ہی راہ ہے یعنی وہ راہ جو مقامِ محمدیؐ (وحی) پر ایمان سے متعین ہوتی ہے اور جس کی طرف پیامِ محمدیؐ (قرآن) راہ نمائی کرتا ہے۔ ع　　اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

یہ خط لمبا ہو گیا۔ لیکن تم نے بات ہی ایسی پوچھی تھی۔ ویسے بھی

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔

اچھا خدا حافظ۔

والسلام
پرویز
(نومبر ۱۹۵۶ء)

بیسواں خط

کائنات کے دو عظیم انقلاب

تمہارا خط مختلف مقامات کی سیر کرتا مجھے یہاں ریاست سوات میں ملا جہاں میں وسط مئی سے آیا ہوا ہوں۔ اس علاقے کا تفصیلی تعارف تو کسی اور وقت کراؤں گا، اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ان وادیوں میں فطرت نے اپنی حسن پاشیوں میں کسی قسم کا بخل نہیں برتا۔ لیکن چونکہ انسانی ہاتھ نے ابھی تک اس کی مشاطگی نہیں کی اس لئے اس حسن میں نکھار نہیں پیدا ہو سکا۔ جس دن انسان نے اس کی تزئین و آرائش کی طرف توجہ کی، نہ معلوم یہ شگفتہ و شاداب خطۂ زمین کیا سے کیا بن جائے گا۔ لیکن میرے لئے یہ حسن معصوم بھی اپنے اندر کم جاذبیتیں نہیں رکھتا۔ اس کی کشادہ وادیاں کَیْفَ سُطِحَتْ۔ اس کی محکم پہاڑیاں کَیْفَ نُصِبَتْ۔ اور اس کی فلک بوس، برف آلودہ چوٹیاں کَیْفَ رُفِعَتْ کی جیتی جاگتی تفسیریں، اور ان سے ترتیب پائے ہوئے رنگین مناظر کَیْفَ خُلِقَتْ کی زندہ تصویریں ہیں۔ میرے کمرے کے دریچے کے سامنے دریائے سوات (جسے یہاں کے رہنے والے سندھ کہتے ہیں) اپنے مسلسل زیر و بم کے ساتھ سلسبیلانہ انداز سے محوِ خرام ہے۔ اس کی لہروں کی رنگینیاں میرے لئے جنتِ نگاہ اور اس کی آبشاروں کی نغمہ آفرینیاں فردوسِ گوش ہیں۔ میں اس کی طرف دیکھتا ہوں اور عجیب و غریب خیالات میں گم ہو جاتا ہوں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ جسے ہم دریا کہتے ہیں وہ دراصل ہے کیا؟ وہ پانی جس سے دریا کا وجود قائم ہے، پیچھے سے مسلسل آتا اور آگے بڑھتے چلا جاتا ہے۔ تو کیا اس پانی کو جو ابھی یہاں تھا، اور ابھی کہیں سے کہیں چلا گیا، دریا کہیں گے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ایک ہر آن تغیر پذیر شئے کس طرح ثابت قرار پا سکتی ہے؟ تو کیا دریا کے بطن (BED) کو دریا کہا جائے گا، جو اگرچہ مستقلاً اپنی جگہ پر قائم ہے، لیکن جو تغیر پذیر پانی کے بغیر دریا کہلا ہی نہیں سکتا۔ اگر اس میں پانی نہ ہو، تو اس میں، اور اس کے ارد گرد کی زمینوں میں کیا فرق ہے؟ دریا درحقیقت نام ہے اس ثبات (PERMANENCE) اور تغیر (CHANGE) کے مجموعہ کا، بعینہٖ جس طرح انسان نام ہے نہ بدلنے والی ذات (PERSONALITY) اور ہر آن بدلنے والے خیالات کے مجموعہ کا۔ ایک

خیال آتا ہے جس سے ہم خوش ہو جاتے ہیں۔ وہ نہایت خاموشی سے اس طرح آگے بڑھ جاتا ہے جس طرح سورج کے سامنے سے بادل گزر جاتا ہے، پھر ایک اور خیال آجاتا ہے جس سے ہم غمگین ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی اسی طرح آگے بڑھ جاتا ہے۔ خیالات کی یہ رو آتی رہتی اور جاتی رہتی ہے۔ لیکن ہماری ذات مستقلاً اپنے مقام پر موجود رہتی ہے۔ اسی طرح جیسے پانی کی لہریں آتی رہتی ہیں اور جاتی رہتی ہیں۔ لیکن دریا کا بطن اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ وہ پانی کے مسلسل تغیر سے اثر پذیر نہیں ہوتا۔ لیکن یہ دریا اس وقت تک دریا ہے جب تک اس کا پانی ساحلوں میں پابند ہے۔ اگر یہ ان ساحلوں کو توڑ کر حدود فراموش ہو جائے تو اسے دریا نہیں بلکہ سیلاب کہا جائے گا جس کا نتیجہ تخریب ہی تخریب ہو گا۔ انسانی خیالات و جذبات بھی اسی وقت تک انسانی کہلا سکتے ہیں جب تک وہ قوانین خداوندی کے ساحلوں میں محصور ہیں۔ اگر وہ ان سے سرکشی اختیار کر جائیں تو وہ انسانی نہیں حیوانی، بلکہ شیطانی ہو جائیں گے جس کا نتیجہ نوعِ انسانی کے لئے تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ انسانی ذات کے استحکام کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے جذبات و خیالات قیود نا آشنا نہ ہو جائیں۔ لیکن اس پابندی کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ یکسر جامد اور متصلّب ہو جائیں۔ اگر دریا کے پانی کی روانی ختم ہو جائے تو وہ دریا نہیں رہتا، جوہڑ بن جاتا ہے جس میں کچھ دنوں کے بعد بُو پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہی پانی جو ہر قسم کی کثافت کو صاف کرنے کے کام آتا تھا خود کثیف بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو تقلید کی زنجیروں میں جکڑ کر زندگی کی روانی سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس میں نہ ندرتِ فکر رہتی ہے نہ جدّتِ کردار۔ وہ ہر دم تازہ رہنے والی جوئے آب کی جگہ ایک تنگ و تاریک جوہڑ بن جاتی ہے جس سے ساری فضا متعفن ہو جاتی ہے۔ وہ زندہ قوموں کی صف سے نکل کر جن کی تقدیریں صبح و شام بدلتی رہتی ہیں، قبرستان میں تبدیل ہو جاتی ہے، جس میں موت کا نام سکون، اور بے حسی اور بے حرکتی کا نام اطمینان رکھ کر اپنے آپکو فریب دے لیا جاتا ہے۔ ان کے سانس لینے کی وجہ سے ان لوگوں کو زندہ سمجھ لیا جاتا ہے، لیکن درحقیقت وہ زندہ نہیں، مردہ ہوتے ہیں وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ (۱۸/۱۸)۔ ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

میکدۂ تہی سبو حلقۂ خود فراموشاں
مدرسۂ بلند بانگ بزمِ فسردہ آتشاں
فکر گرہ کشا غلام، دیں بر وائے تمام
زانکہ درونِ سینہ ہا دل ہدفے است بے نشاں

دیکھو سلیم! بیٹھا تھا میں تمہارے خط کا جواب لکھنے لیکن تصوّرات مجھے کہاں سے کہاں لے گئے۔ اچھا لو

اب اپنے خط کا جواب سنو، اگرچہ اس تشبیب میں بھی نہیں کئی کام کی باتیں مل جائیں گی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کائنات کی تخلیق ایک ایسا محیر العقول کارنامہ ہے کہ انسانی عقل جوں جوں اس کی گہرائیوں اور پہنائیوں پر غور کرتی ہے، قدم قدم پر اس کی عظمت اور اپنے عجز کا اعتراف کرتی چلی جاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے اس تخلیقی پروگرام میں دو مقام ایسے آئے ہیں جنہیں فی الحقیقت عظیم انقلاب کہا جا سکتا ہے۔ یعنی اس عظیم پروگرام کے اندر عظیم انقلابی مراحل۔ افسوس ہے کہ انسان نے ابھی تک ان انقلابی مراحل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ نہیں لگایا، جس کی وجہ سے وہ کائنات میں اپنے صحیح مقام کا اندازہ اور اس تک پہنچنے کے لئے طریق عمل کا صحیح تعین نہیں کر سکا۔ اور اس سے بھی زیادہ قابل تاسف اس حقیقت کا احساس ہے کہ اس باب میں مسلمان سب سے پیچھے ہے، حالانکہ یہ ہر وقت اس کتاب عظیم کو اپنے سامنے رکھتا ہے جس نے ان انقلابی مراحل کا خصوصیات سے ذکر کیا ہے اور انہیں اس طرح ابھار اور نکھار کر بیان کیا ہے کہ ان کی عظمت بادنیٰ تعمق سامنے آجاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک مسلمان ان مقامات کی عظمت کا صحیح صحیح اندازہ نہ کرلے، وہ قرآن کے پیغام اور اقوام عالم میں اپنی پوزیشن کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ میں کوشش کروں گا کہ اس مختصر سے خط میں ان مقامات کا اجمالی تعارف کرادوں (کیونکہ ان کے تفصیلی تعارف اور تبئین کے لئے بڑی فرصت کی ضرورت ہے)۔ اسے تم غور سے سمجھنے کی کوشش کرنا کیونکہ بات ذرا مشکل اور گہری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق بالمقصد کی ہے۔ اور جب کسی چیز کو کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کیا جائے تو سب کچھ ایک پلان (PLAN) کے مطابق کیا جاتا ہے۔ لہٰذا کائنات کی تخلیق ایک پلان کے مطابق ہوئی ہے۔ پلان کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہر پرزہ کے ذمہ ایک خاص فریضہ لگایا گیا ہے، اور مختلف پرزوں کے باہمی تعاون و تناصر کے لئے خاص قاعدے مقرر کئے گئے ہیں۔ بالفاظ دیگر کائنات کی یہ عظیم القدر مشینری ایک خاص نظم و ضبط اور قاعدے اور قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (۶۵/۳)۔ یقیناً اللہ نے ہر شے کے لئے پیمانے بنا دیئے ہیں۔ "قدر" پیمانے یا اندازے کو یا دور حاضر کی سائنٹیفک اصطلاح میں (MEASUREMENT) کو کہتے ہیں۔ "مقدور" کے معنی (MEASURED) یا (DETERMINED) کے ہوں گے وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳/۳۸)۔ اور اللہ کا ہر امر اندازے کے مطابق متعین کردہ ہے۔ خارجی کائنات میں خدا کے متعین کردہ انہی اندازوں کو قوانین فطرت یا (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے۔ سائنس کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ انسان نے ان قوانین کو کس حد تک دریافت کر لیا ہے۔ سائنسدان ان قوانین کو ایجاد نہیں کرتا۔ ان کا صرف انکشاف (DISCOVERY) کرتا ہے۔ ان قوانین کے محکم اور غیر متبدل ہونے کا نتیجہ ہے کہ ایک سائنسدان پورے ختم د

یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اگر فلاں اور فلاں چیز کو یوں ملا دیا جائے تو اس سے یہ کچھ بن جائے گا۔ کائنات کے یہ اجزاء جو اس قدر محکم انداز سے سرگرم عمل ہیں کس قدر باریک، لطیف اور نازک ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ ایک ایٹم (ATOM) مرکب ہوتا ہے (PROTONS) اور (ELECTRONS) سے۔ ایک برقیہ (ELECTRON) کی ضخامت ایک انچ کے کروڑویں حصّے کے برابر ہوتی ہے۔ یہ پروٹون اور الیکٹرون، اپنے محور کے گرد چودہ سو میل فی سیکنڈ کی رفتار سے گھومتے ہیں۔ ان کی گردش بالکل ویسے ہی ہے جیسے فضائے آسمانی میں نظام شمسی کے مختلف کرّوں کی گردش۔ پھر، مختلف اجزائے کائنات کی ساخت میں ان الیکٹرون وغیرہ کے صحیح صحیح تناسب کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ اگر کاربن کی ساخت میں ایک الیکٹرون کی کمی رہ جاتی تو اس کرۂ ارض پر زندگی (LIFE) ناممکن ہو جاتی۔ یا آکسیجن اور ہائیڈروجن جس محکم طریق سے باہمدگر مل کر پانی بن گئی ہیں، اگر ان کے اختلاط میں ذرا سا بھی ڈھیلا پن رہ جاتا تو یہ دنیا بھک سے اڑ جاتی۔ علاوہ اس کے، کائنات کے مختلف اجزاء میں باہمی ربط و ضبط ایسا محکم ہے کہ علم الحیات (BIOLOGY) کے ماہرین کا اعلان ہے کہ یہ تمام کائنات ایک نامی جسم کی طرح (ORGANIC) ہے۔ کائنات کی اسی وحدت کی بناء پر اسے (UNIVERSE) کہتے ہیں۔

کائنات کی ہر شے کے اندر وہ قانون از خود موجود ہوتا ہے جس کے مطابق اس نے زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔ (یہ ہے سلیم! وہ نقطہ جس کے لئے میں نے اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھی ہے) اس کو اس شے کی فطرت کہتے ہیں۔ یا یوں سمجھو کہ ہر شے کو اپنے اپنے فرض منصبی کا علم ہوتا ہے اور اس کا بھی پتہ ہوتا ہے کہ اس فریضہ کی سرانجام وہی کے لئے اسے کیا کرنا ہے قرآن کے الفاظ میں، كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ ($\frac{24}{41}$)۔ کائنات کی ہر شے اپنی تسبیح و صلوٰۃ سے واقف ہے (تسبیح و صلوٰۃ کے قرآنی مفہوم کو تم نے سمجھ لیا سلیم!) اسے قرآن نے وحی بھی کہا ہے، وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ ($\frac{16}{68}$)۔ "خدا نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی" وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ($\frac{41}{12}$)۔ ہر کرۂ سماوی کی طرف اس کے فریضہ کے متعلق وحی کر دی۔ یا سورۂ "زلزال" میں زمین کے متعلق ہے کہ، بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ($\frac{99}{5}$)۔ ان قوانین کے لئے وحی کا لفظ استعمال کرنے میں ایک نقطہ اور بھی ہے۔ وحی کے معنی خفیف اور تیز اشارے کے ہوتے ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء سے "اشاروں" میں بات کی ہے۔ اس لئے ان اشاروں کی حقیقت اور ان کا صحیح مفہوم معلوم کرنے کے لئے علم اور تجسّس درکار ہے۔ اسی کو سائنس کا علم کہتے ہیں جس کے لئے بڑی باریک بینی اور غائر مشاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء سے پردہ میں بات کی ہے۔ ان پردوں کو اٹھانا سائنسدان کا کام ہے۔ یعنی حقیقت کو (DISCOVER) کرنا۔ اس قسم کے تدبّر و تفکّر اور تجارب و

مشاہدات کے بعد یہ امر نکھر کر سامنے آجاتا ہے کہ فطرت کے یہ قوانین جو اس قدر خاموش اشاروں میں بیان ہوئے ہیں کس قدر واضح، متعیّن اور مفصل اور ایک دوسرے کے مطابق و موافق واقع ہوئے ہیں۔ ان میں کہیں اختلاف نہیں، ابہام نہیں، عدم تعیّن نہیں، سہو نہیں، خطا نہیں۔ مَا تَرٰى فِي خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (۶۷/۳)

بہرحال میں یہ کہہ رہا تھا کہ اشیائے کائنات میں سے ہر ایک کو اس ضابطہ کا علم براہِ راست دیا گیا ہے جس کے مطابق اسے زندگی بسر کرنی ہے۔ یہ علم اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۷/۱)۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۱۶/۴۹)۔ جو کچھ اُن سے کہا گیا ہے وہ اس کے مطابق عمل کئے جا رہے ہیں۔ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۵۰)۔ وہ اپنے فرائض کی سرانجام دہی کے لئے پوری پوری قوت سے سرگرداں رہتے ہیں اور نہایت سرعت اور تیزی سے دُور دُور نکل جاتے ہیں۔ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (۲/۳۰) تسبیح میں سیلم اعمل کی (INTENSITY) پائی جاتی ہے اور تقدیس میں (EXTENSIVENESS)۔ یعنی تمام اشیائے فطرت مشیت کے پروگرام کی تکمیل میں پوری قوت اور وسعت سے سرگرم عمل ہیں۔ کسی کو اس سے مجال سرتابی نہیں۔ یارائے سرکشی نہیں۔ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۱۶/۴۹) یعنی ان میں سے کسی کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ چاہے تو اس قانون کی اطاعت کرے اور چاہے تو اس سے سرکش ہو جائے۔ اشیائے فطرت میں کسی قسم کا اختیار و ارادہ ہوتا ہی نہیں۔

جو کچھ میں نے اوپر لکھا ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہے:

۱۔ اشیائے فطرت میں سے ہر ایک کو اللہ کی طرف سے براہِ راست اس قانون کا علم دے دیا گیا ہے جس کے مطابق اس نے زندگی بسر کرنی ہے۔

۲۔ یعنی یہ علم ان اشیاء کی فطرت میں داخل ہے۔

۳۔ وہ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے پر قادر ہی نہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ جو قانون کسی شے کی فطرت کے اندر داخل ہو وہ شے اس سے سرکشی اختیار ہی نہیں کر سکتی پانی کو اس کا اختیار ہی نہیں کہ وہ نشیب کی بجائے فراز کی طرف بہنے لگ جائے۔

سلسلۂ کائنات اسی طریق پر چلا آرہا تھا کہ مشیت کے پروگرام کے مطابق ان دو عظیم انقلابات میں سے، جن کی

طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا ہے، پہلا انقلاب واقع ہوا۔ یہ انقلاب تھا انسان کی پیدائش اور اس کی وجہ سے وحی کے سابقہ انتظام میں ایک بہت بڑی تبدیلی۔ سابقہ مخلوقات کے علی الرغم، انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا۔ اس کی اس خصوصیت کبریٰ کو اللہ تعالیٰ نے "اوہیاتی توانائی کا ایک کرشمہ" (نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ) ($\frac{15}{29}$) سے تعبیر کیا ہے۔ یہ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس قسم کی تخلیق کو جو سلسلۂ ارتقاء کی سابقہ کڑیوں سے مختلف ہو، دورِ حاضر کی اصطلاح میں فجائی ارتقاء یا (EMERGENT EVOLUTION) کہتے ہیں۔ گویا انسان کی تخلیق اس قسم کے فجائی ارتقاء کے طور پر عمل میں آئی ہے۔ لیکن جس طرح کائنات کی دیگر اشیاء کے لئے وہ قوانین مقرر کئے گئے ہیں جس کے مطابق زندگی بسر کر کے وہ مشیت کے پروگرام کو پورا کرتی ہیں۔ انسان کے لئے بھی ایسے قوانین متعین کر دئے گئے ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے وہ اپنی تخلیق کا مقصد پورا کر سکتا ہے۔ اگر ان قوانین کو (دیگر اشیائے کائنات کی طرح) اس کی فطرت کے اندر رکھ دیا جاتا، یعنی ان کا علم براہِ راست ہر انسانی بچّہ کو پیدائش کے ساتھ ہی دیدیا جاتا، تو انسان بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح ان قوانین پر چلنے کے لئے مجبور ہو جاتا۔ لیکن یہ چیز اس کے اختیار و ارادے کے خلاف جاتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کی طرف اپنی وحی بھیجنے کے طریق میں ایک عظیم تبدیلی کی۔

اسے پھر سن لو سلیم! کہ اشیائے کائنات کی طرف وحی بھیجنے کا طریق یہ ہے کہ ہر شے اور ہر نوع کی طرف خدا کی طرف سے براہ راست وحی کی جاتی ہے۔ مرغی کا بچّہ انڈے سے باہر نکلتے ہی ان قوانین سے واقف ہوتا ہے جس کے مطابق اس نے زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔ وہ خشکی پر رہتا ہے، پانی کے قریب تک نہیں جاتا، آگ سے دُور بھاگتا ہے، دانہ دُنکا چگتا ہے۔ بطخ کا بچّہ انڈے سے باہر آنے کے ساتھ ہی پانی پر لپکتا ہے۔ یہ کچھ اسے خدا کی طرف سے براہ راست وحی کے ذریعے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن انسانی بچّہ خیر و شر سے قطعاً ناواقف ہوتا ہے۔ اسے اس کا علم براہ راست خدا کی طرف سے نہیں ملتا۔ نوعِ انسان کے ہر فرد کی طرف وحی نہیں ہوتی۔ یہ چیز اس کی فطرت میں داخل نہیں ہوتی۔ جیسا کہ میں تمہیں اس سے پہلے ایک[1] خط میں بتا چکا ہوں، انسان کی کوئی فطرت ہی نہیں۔ فطرت جمادات نباتات و حیوانات کی ہوتی ہے جن میں اختیار و ارادہ نہیں ہوتا۔

انسان کے سلسلہ میں خیر و شر کا علم دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے طریق یہ تجویز کیا کہ نوع انسان کے ایک فرد کو اس مقصد کے لئے منتخب کر لیا جاتا اور اسے خیر و شر کا علم بذریعہ وحی دے دیا جاتا۔ پھر اسے کہہ دیا جاتا کہ اس علم کو وہ دیگر افرادِ انسانیہ تک پہنچا دے، اور اسے ان انسانوں پر چھوڑ دے کہ وہ چاہے اس علم کی راہنمائی میں زندگی بسر کریں اور چاہے اس کے خلاف راستہ اختیار کر لیں۔ اس طرح خدا کی وحی بھی انسانوں تک پہنچ گئی

[1] خط ۔۔۔ دیکھئے

اور انسانی اختیار و ارادہ بھی بدستور باقی رہا۔ ان برگزیدہ انسانوں کو جن کے ذریعہ خدا کی وحی باقی افرادِ انسانیہ تک پہنچائی جاتی تھی، نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔ وحی کے اس طریق جدید کے متعلق نوعِ انسان سے کہا گیا کہ (اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۷/۳۵)) "جب ایسا ہوگا کہ تمہارے پاس تم ہی سے پیغامبر آئیں گے، جو ہمارے پیغامات تم تک پہنچائیں گے، سو جو لوگ ان قوانین کی نگہداشت کرینگے اور ان کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں گے تو انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن"۔ جہاں تک انسان کے اختیار و ارادہ کا تعلق تھا اسے کہہ دیا گیا کہ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ "ان سے کہہ دو کہ تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے حق آچکا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے اختیار کرے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے"۔ یہ کہہ دینا تو محض سمجھانے کی غرض سے ہے ورنہ یہ چیز وحی کے اس طریق کا لازمی نتیجہ ہے جو انسان کی صورت میں اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی ان قوانین کے اس کی فطرت کے اندر نہ ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اسے اس کی آزادی حاصل ہے کہ وہ ان قوانین کو اختیار کرے یا اس سے انکار کر دے۔ اگر انسان کو اس امر کی آزادی دینا مقصود نہ ہوتا تو دیگر اشیائے کائنات کی طرح وحی کو اس کی فطرت[1] کے اندر رکھ دیا جاتا۔ یہ مطلب ہے سلیم لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کا۔ یعنی دین کے معاملہ میں کسی قسم کی زبردستی نہیں۔ زبردستی سے لایا ہوا ایمان، ایمان ہی نہیں ہوتا۔ ایمان وہی ایمان ہے جسے انسان خود اپنی مرضی اور ارادہ سے اختیار کرے۔ اپنے اختیار و ارادے کے معنی یہ ہیں کہ انسان خود سوچ سمجھ کر ایک نتیجہ پر پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن غور و فکر اور سوچ بچار کی اس قدر تاکید کرتا ہے۔ اس کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت ہے اور وہ اسے علیٰ وجہ البصیرت ہی اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ تم دیکھو گے کہ قرآن قدم قدم پر تقلید کی مخالفت کرتا ہے۔ یہ اس لئے کہ تقلید میں انسان اپنے غور و فکر سے کام نہیں لیتا بلکہ معاشرے میں جو عقائد و رسوم متوارث چلی آتی ہیں انہیں بلا سوچے سمجھے اختیار کر لیتا ہے۔ یہ درحقیقت معاشرے کو خدا بنا لیتا ہے۔ تقلید کے متعلق یوں سمجھو کہ وہ (SOCIETY DIVINISED) ہوتی ہے، جس طرح جس چیز کو ضمیر کہا جاتا ہے وہ (SOCIETY INTERNALISED) ہوتی ہے۔ اور تو اور، جو شخص خود قرآن کو بھی اندھا اور بہرہ بن کر قبول کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بھی مومن قرار نہیں دیتا۔ اس کا ارشاد ہے کہ مومن وہ ہیں اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا (۲۵/۷۳)۔ جب ان کے سامنے ان کے رب کی آیات بھی پیش کی جاتی ہیں تو

---

[1] اسے حیوانی جبلت یا (INSTINCT) کہتے ہیں۔

وہ ان پر بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے، غور و فکر کے بعد انہیں اختیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کفارِ عرب نبی اکرمؐ سے بار بار معجزات طلب کرتے تھے تاکہ وہ انہیں دیکھ کر ایمان لائیں، اور قرآن کی طرف سے بار بار اس کا انکار ہوتا تھا اور ان سے کہا جاتا تھا کہ تم عقل و شعور کو کام میں لاؤ اور سوچ سمجھ کر اس کا فیصلہ کرو کہ جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ اگر تمہاری عقل و فکر کو ماؤف کر کے تم سے اطاعت کرانی ہوتی تو تمہیں بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح پیدا کر دیا جاتا۔ یعنی اس قانون کو تمہاری فطرت کے اندر رکھ دیا جاتا اور تم مجبوراً اس کی اطاعت کئے جاتے۔

تم نے غور کیا کہ انسان کی تخلیق کس طرح دیگر اشیائے کائنات سے منفرد ہے۔ اور خیر و شر کے علم دینے کا جو طریق اس کے لئے اختیار کیا گیا ہے وہ کس طرح ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن کس قدر تأسف و حیرت ہے کہ خود ہمارے ہاں بھی یہ عقیدہ موجود ہے کہ خیر و شر کی تمیز انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے۔ اور انسان کی فطرت خود خدا کی فطرت پر متفرع ہے۔ اس لئے اسلام دینِ فطرت ہے۔ تم نے غور کیا کہ یہ عقیدہ کس طرح مشیت کے اس سارے پروگرام کی تردید کر دیتا ہے جو اس نے انسانی تخلیق اور وحی بوساطت حضرات انبیائے کرام کی شکل میں اختیار کیا تھا۔ فطرت انسانی کے متعلق یہ عقیدہ قدیم فلسفہ میں موجود تھا جہاں سے اسے مسلمانوں نے مستعار لے لیا اور اسے عین دین بنا دیا۔ اس کے جواز میں جو قرآنی آیات پیش کی جاتی ہیں ان کا صحیح مفہوم میں تمہیں اس خط میں بتا چکا ہوں جو "فطرت انسانی" کے ضمن میں نمہیں لکھا گیا تھا) دورِ حاضر کے فلسفہ میں اسے (TRANSCENDENTALISM) کہتے ہیں۔ یعنی یہ عقیدہ کہ انسان کے دل میں وجدانی طور پر حق و باطل کے امتیاز کا علم موجود ہے جو تجربات و مشاہدات کی رو سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ قریب قریب اسی کی دوسری شکل ہے جسے (ONTOLOGISM) بھی کہا جاتا ہے یعنی یہ عقیدہ کہ خدا اور اس کے تصورات کا علم ہر فردِ انسانیہ کے دل میں براہِ راست موجود ہے۔ یہ عقائد دراصل وحی بوساطت انبیائے کرامؑ (یا بالفاظ دیگر ایمان بالرسل) کے تصور کی مخالفت کے لئے وضع کئے گئے تھے لیکن مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ بھی ان عقائد کو سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ اس سے سلسلۂ رشد و ہدایت بوساطت انبیائے کرام کی ساری عمارت نیچے آ گرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ دین میں جبر و اکراہ کو بھی دینِ اسلام سمجھتے ہیں۔ ذہنی اکراہ کے سلسلہ میں وہ تقلید کو دین کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور قلبی اکراہ کے لئے مرتد کی سزا قتل بتاتے ہیں یعنی جو شخص (کسی وجہ سے) دل سے دین کا قائل نہیں رہتا اسے بزورِ شمشیر دین کا قائل رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ تمام عقائد قرآن کریم کو پس پشت ڈال دینے کا نتیجہ ہیں۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھو۔ ایک اور خصوصیت بھی ہے جس کی بنا پر انسان دیگر اشیائے کائنات سے منفرد ہے، اور وہ ہے عقل و فکر کی صلاحیت۔ کائنات میں عقل و فکر انسان کے علاوہ کسی اور کو نہیں دی گئی۔ اصل یہ ہے کہ جب قانونِ زندگی کو کسی شے کی فطرت کے اندر رکھ دیا جائے اور وہ اس کی اطاعت پر مجبور ہو جائے تو اسے عقل و فکر کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ عقل و فکر کی ضرورت اسے ہوتی ہے جسے کوئی مسلک اپنی مرضی اور ارادے سے اختیار کرنا ہو۔ عقل و فکر کی نشو و نما علم اور تجربہ سے ہوتی ہے۔

. . . . . اور چونکہ دیگر اشیائے کائنات عقل و فکر سے عاری ہیں اور اپنے فطری تقاضوں سے اس راستہ پر چلی جا رہی ہیں جو ان کے لئے تجویز کر دیا گیا ہے اس لئے انہیں اس علم کے علاوہ جو ان کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے۔ کسی اور علم کی ضرورت نہیں۔ ملائکہ کا یہ اعتراف کہ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (۲/۳۲) (ہمیں اس علم کے سوا جو تو نے ہمیں دیا ہے اور کسی بات کا علم نہیں) اسی حقیقت کا ترجمان ہے۔ بکری کا بچہ اپنی پیدائش کے ساتھ ہی وہ سب کچھ جانتا ہے جس کی اُسے آخری عمر تک ضرورت ہوتی ہے۔ اُسے اپنی زندگی کے تقاضوں کا علم حاصل کرنے کے لئے کسی اسکول میں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن انسانی بچہ بالکل کورا پیدا ہوتا ہے اور اسے ساری زندگی علم حاصل کرنا پڑتا ہے۔ جو اس حقیقت سے واقف ہیں ان کے دل میں ہر وقت یہ آرزو موجزن رہتی ہے کہ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (۲۰/۱۱۴)۔ انسانی عقل و فکر علم و تجربے سے پختگی حاصل کرتی ہے۔ انسانی بچہ کو علم ماں باپ سے ورثہ میں نہیں ملتا۔ ایک ایم، اے پاس باپ کے بیٹے کو بھی اسی طرح الف بے سیکھنی پڑتی ہے جس طرح ایک اَن پڑھ باپ کے بچے کو۔ لیکن ہر انسانی نسل (GENERATION) اس علم و تجربہ کی اکتسابًا وارث بن سکتی ہے جو سابقہ نسلوں سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم و تجربہ کے میدان میں ہر نئی نسل سابقہ نسل سے ایک قدم آگے ہوتی ہے۔ مثلاً ہم بیسویں صدی کے انسان ہیں۔ ہم نے اپنی زندگی کو اس مقام سے شروع کیا ہے جس مقام تک اُنیسویں صدی کا انسان پہنچا تھا۔ یعنی اُنیسویں صدی کے انسان کا آخری مقام ہمارے سفرِ زندگی کا نقطۂ آغاز تھا۔ ہم انیسویں صدی کے انسان سے اتنا ہی آگے ہیں جتنا فاصلہ ہم نے بیسویں صدی میں خود طے کیا ہے۔ یعنی ہمارا علم مجموعہ ہے۔ ۱۔ اس علم کا جو اُنیسویں صدی تک سابقہ انسانی نسلوں نے حاصل کیا اور (۲) اس علم کا جو ہم نے بیسویں صدی میں خود حاصل کیا۔ چونکہ انسانی عقل و فکر، علم و تجربہ کی بنا پر پختگی حاصل کرتی ہے اس لئے بالفاظ دیگر یوں سمجھو کہ ہر نئی نسل کا انسان عقل و فکر کے اعتبار سے اپنی سابقہ نسل سے آگے ہوتا ہے بشرطیکہ اس کی قوم حصولِ علم میں متواتر کوشاں رہے (اسے اچھی طرح سمجھ لینا سلیم! کہ یہ کچھ میں نے اکتسابی علم کے متعلق کہا ہے۔ وحی کے متعلق نہیں۔ وحی کو انسان کسب و محنت سے حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ علم نبی کو اسی طرح وہبی طور پر عطا ہوتا ہے جس طرح

خارجی کائنات میں خدا کی وحی وہبی طور پر ہوتی ہے) اب اور آگے بڑھو۔

وحی کا کام یہ ہے کہ وہ عقل انسانی کی راہنمائی کرتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس قدر انسان کی عقل خام ہوگی اسے اسی قدر تفصیلی راہنمائی کی ضرورت ہوگی۔ اگر تمہیں کسی بچّہ کو راستہ بتانا ہو تو اس کے لئے تمہیں بڑی تفصیل سے کام لینا ہوگا۔ لیکن ایک پختہ عقل کے انسان کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہوگا کہ جہاں دوراہا آئے وہاں نشان کا کھمبا (SIGN POST) لگا دیا جائے جس پر یہ اشارہ موجود ہو کہ دائیں ہاتھ کی سڑک کس طرف جاتی ہے اور بائیں ہاتھ کی کس طرف۔ وحیٔ خداوندی نے بھی اسی تقاضا کو سامنے رکھا اور ہر دور کے انسان کو اس کی علمی اور عقلی سطح کے مطابق تفصیلی راہنمائی دی۔ مثلاً حضرت نوحؑ کے زمانہ میں یہ بات بھی بذریعہ وحی بتانی پڑی کہ سیلاب سے بچنے کے لئے کشتی کس طرح بنانی چاہیئے۔ حضرت نوحؑ سے کہا گیا کہ وَ اصۡنَعِ الۡفُلۡكَ بِاَعۡيُنِنَا وَ وَحۡيِنَا (۱۱/۳۷)۔ ہماری زیر نگرانی ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ۔ پھر جوں جوں انسانی علم و عقل میں پختگی آتی گئی ان تفاصیل میں کمی ہوتی چلی گئی۔

اس مقام پر اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ بعض امور وہ ہیں جو انسانی عقل کی حد سے ماوراء ہیں۔ یعنی انسانی عقل خواہ اپنی انتہا تک بھی کیوں نہ پہنچ جائے وہ امور اس کے دائرہ سے باہر رہتے ہیں۔ دوسرے امور وہ ہیں جو ایک زمانہ میں انسانی عقل کی حد سے آگے ہوتے ہیں، لیکن جب انسانی عقل آگے بڑھ جاتی ہے تو وہ امور اس کے دائرے کے اندر آجاتے ہیں۔ اوّل الذکر امور وہ ہیں جو ہر نبی کی طرف نازل شدہ وحی میں یکساں طور پر آتے رہے اور ہر زمانہ کے انسان کو انکی ضرورت رہی اور ضرورت رہے گی۔ لیکن دوسری قسم کے امور وہ ہیں جن کی تفاصیل میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ یعنی جوں جوں انسان کی عقل آگے بڑھتی رہی، ان تفاصیل میں کمی ہوتی چلی گئی۔

یہ سلسلۂ وحی اس طرح مسلسل آگے بڑھتا چلا آیا۔ تاآنکہ مشیت کے پروگرام میں اس دوسرے عظیم انقلاب کا وقت آگیا جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا ہے۔ اب انسانیت کے لئے اس دور میں داخل ہونے کا وقت آگیا جس میں اس کی عقل نے بالغ ہو کر پختگی حاصل کر لینی تھی۔ چنانچہ اس دور کے آغاز میں کیا یہ گیا کہ ان تمام امور کے متعلق، جن تک پہنچنا عقل انسانی کے لئے ممکن نہیں یا جن تک پہنچنے کے لئے اسے قرنہا قرن درکار ہیں، وحی کی راہنمائی اصولی طور پر دے دی گئی۔ اس وحی کو قرآن کی دفتین میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا اور اس کے بعد سلسلۂ وحی بند کر دیا گیا۔ یعنی سلسلۂ نبوّت کو ختم کر دیا۔ یہ ہے سلیم! دوسرا عظیم انقلاب جو اس کارگہ کائنات میں رونما ہُوا۔ یعنی پہلا انقلاب تو یہ تھا کہ وحی کو (اشیائے کائنات کی طرح) انسانی فطرت میں داخل کرنے کے بجائے اسے ایک فرد کے ذریعہ باقی انسانوں تک پہنچانے کا طریق اختیار کیا گیا۔ اور دوسرا انقلاب یہ تھا کہ وحی کی اصولی تعلیم

کو منضبط کر کے، مزید سلسلۂ وحی کو ختم کر دیا گیا۔ سوچو سلیم! کہ سلسلۂ تخلیق کائنات میں یہ انقلاب کس قدر عظیم ہے!

آگے بڑھنے سے پہلے اس مقام پر ایک اور نکتہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ میں نے اوپر کہا ہے کہ بعض امور وہ ہیں جن تک عقلِ انسانی از خود پہنچ ہی نہیں سکتی۔ اس کا مطلب ہے کہ ان حقائق کا دریافت کر لینا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں۔ لیکن عقلِ انسانی اپنے تجرباتی طریق سے ان حقائق کی صداقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی ہے۔ مثلاً خدا کی صفات اور مستقل اقدار کیا ہیں، عقلِ انسانی انہیں از خود معلوم نہیں کر سکتی۔ یہ صرف وحی بتا سکتی ہے۔ لیکن ان صفاتِ خداوندی کا کائنات میں ظہور کس طرح ہوتا ہے اور مستقل اقدار کی رو سے کیا کیا تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں، عقلِ انسانی ان باتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی ہے۔ یہ مطلب ہے قرآن کی اس آیۂ جلیلہ کا جس میں کہا گیا ہے کہ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)۔ ہم انہیں اپنی نشانیاں انفس و آفاق میں دکھاتے جائیں گے تا آنکہ یہ بات نکھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن میں بیان کردہ امور فی الواقعہ حقیقت ثابتہ ہیں۔

اس ضمنی توضیح کے بعد پھر اصل موضوع کی طرف آؤ۔ تم نے غور کیا ہے کہ یہ انقلابات کس حقیقت کا اعلان تھے پہلا انقلاب اس امر کا اعلان تھا کہ انسان اس تمام کائنات میں منفرد اور واجب التکریم واقع ہوا ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ۔ اور دوسرا انقلاب اس بلند حقیقت کا اعلامیہ تھا کہ اب انسانیت، عمرِ بلوغت اور سن رشد و تمیز کو پہنچ رہی ہے۔ اب یہ اس دور میں پہنچ رہی ہے جہاں اس کی عقل پختہ اور اس کا علم محکم ہوتا چلا جائے گا۔ اب اسے بچوں کی طرح ذرا ذرا سی تفاصیل سمجھانے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب بچہ سیانا ہو گیا ہے، اب یہ سمجھ دار ہو گیا ہے، اب اسے صرف اصولی راہنمائی کی ضرورت ہے۔ ان اصولوں کی روشنی میں یہ اپنے لئے ضروری تفصیلات خود مرتب کرے گا اصول ناقابلِ تغیر ہوتے ہیں۔ لیکن تفاصیل ہر دور میں بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے ان تفاصیل کو اس کی سمجھ پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اب یہ بچہ ماشاءاللہ جوان ہو گیا ہے۔

یہ تھا سلیم! ختمِ نبوت کا مفہوم۔ یہ تھا اس کا مقصد۔ اگر تم اس نقطۂ نگاہ سے انسانی تاریخ پر نگاہ ڈالو تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ نبی اکرمؐ شاہراہِ کاروانِ انسانیت پر ایک حدِ فاصل کے طور پر قیام فرما ہیں۔ حضورؐ سے پہلے ادوار کی انسانیت اپنے بچپن کے زمانہ میں تھی۔ اس کے بعد اس کی جوانی کا زمانہ شروع ہو گیا۔ انسانی عقل و علم نے قرآن سے پہلے کے چار پانچ ہزار سال میں اتنی ترقی نہیں کی تھی جتنی ترقی بعد کے تیرہ چودہ سو سال میں کی ہے جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا جا رہا ہے یہ ترقی برق رفتار ہوتی چلی جا رہی ہے۔ تم گزشتہ چالیس پچاس سال پر ایک

طائرانہ نگاہ ڈالو اور پھر سوچو کہ اتنے قلیل سے عرصہ میں ہی دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی ہے۔ کیا یہ سب تبدیلیاں اس حقیقت کی شاہد نہیں ہیں کہ حضورؐ کی بعثت سے انسانیت ایک نئے دور میں داخل ہو گئی ہے؟ کیا یہ تمام شہادات ختم نبوّت ہی کی مؤید نہیں ہیں؟

لیکن سلیم! جس طرح مسلمانوں نے پہلے انقلاب کی اہمیت کو صحیح طور پر نہ پہچانا، اسی طرح یہ اس دوسرے انقلاب کی اہمیت کا بھی اندازہ نہیں لگا سکے۔ ہم نے نظری طور پر تو ختم نبوّت کو اپنا جزوِ ایمان سمجھا، لیکن عملاً قدم قدم پر اس سے انکار کرتے چلے گئے۔ چنانچہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ موجود ہے کہ نبی اکرمؐ کے بعد منتخب افراد کو خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہونے کا سلسلہ جاری ہے۔ کہیں یہ علم بالکل نبیؐ کی طرح وہبی طور پر ملتا ہے (جیسا کہ شیعہ حضرات کے ہاں ائمہ کرام کے متعلق عقیدہ ہے) اور کہیں اسے اکتسابی طور پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جیسے اولیائے کرام کا کشف و الہام[1]۔ اسی امکان کو آگے بڑھا کر ہمارے زمانہ میں مرزا غلام احمد نے وہبی اور اکتسابی ڈانڈے ملا دیئے اور یہ دعویٰ کر دیا کہ میں اکتسابی طور پر مقام نبوت تک پہنچ چکا ہوں۔ اسی امکان سے ہر صدی کے سر پر ایک مجدد کا عقیدہ وضع کیا گیا اور اسی سے مہدی آخر الزمان کا عقیدہ۔ یہ عقائد ختم نبوّت کی حقیقت کبریٰ کا صحیح اندازہ نہ کر سکنے کا نتیجہ ہیں۔ اور مہر نبوت توڑ دینے کا ذریعہ۔ ان کے علاوہ ایک اور عقیدہ بھی ہے جو اس انقلاب عظیم کا صحیح اندازہ نہ لگانے کا نتیجہ ہے جو ختم نبوت کے اعلان سے کائنات میں رونما ہوا تھا۔ تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ ختم نبوّت کا مفہوم یہ تھا کہ اب انسانوں کو صرف اصولی راہنمائی کی ضرورت ہے، ان اصولوں کی روشنی میں تفصیلات وہ خود متعیّن کریں گے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ عقیدہ پیدا ہو گیا (اور اسی عقیدہ پر مسلمانوں کا عمل چلا آ رہا ہے) کہ زندگی کے ہر معاملہ کی ہر تفصیل بھی متعیّن کر دی گئی ہے اور ان تفاصیل میں اب کسی قسم کا رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ یہ عقیدہ اس مقصد

---

[1] جیسا کہ اس سے پہلے بھی بتایا جا چکا ہے انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں موجود ہیں جنہیں نشو و نما دینے سے اسکے اندر خاص قسم کی قوت بیدار ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انسان اس قوت سے ایسی باتیں معلوم کرے جو ان لوگوں کیلئے ممکن نہ ہوں جنہوں نے اپنی ان صلاحیتوں کو (DEVELOP) نہ کیا ہو۔ اس ذریعۂ معلومات کو وجدان یا (INTUTION) کہتے ہیں۔ لیکن یہ علم نہ خدا کی طرف سے براہ راست حاصل شدہ ہوتا ہے نہ اسے وحی یا نبوّت سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ یہ ایک فنی چیز ہے۔ اسے دین سے بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا حتّٰی کہ اس کے لئے مسلمان ہونے کی شرط بھی نہیں ہوتی۔ جو انسان چاہے ان صلاحیتوں کو نشو و نما دے سکتا ہے۔

عظیم کے منافی ہے جس کے لئے ختم نبوت کا انقلاب عمل میں لایا گیا تھا۔ قرآن نے اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی تھی جب یہ کہا تھا کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِیْنَ یُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ۝ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِیْنَ۝ (۵/۱۰۱-۱۰۲)۔ یعنی خدا نے قرآن میں جن تفصیلات کو بیان نہیں کیا تو یہ بھول چوک کی وجہ سے نہیں، ایسا دانستہ کیا گیا ہے۔ ان تفاصیل کا وحی کی رو سے متعیّن کرنا مقصود ہی نہ تھا۔ اس لئے اے جماعت مومنین! تم ان تفاصیل کے متعلق خواہ مخواہ پوچھنا نہ شروع کر دیا کرو۔ اس وقت وحی کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر تمہارے دریافت کرنے پر ان چیزوں کو بیان کیا گیا تو تم مشکل میں پھنس جاؤ گے۔ وحی کا سلسلہ بند ہو جانے کے بعد کوئی اور نبی آئے گا نہیں اور وہ تفاصیل بھی قرآن کے اصولوں کی طرح ہمیشہ ہمیشہ غیر متبدل قرار پا جائیں گی لیکن زندگی کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ تفاصیل ان کا ساتھ نہیں دے سکیں گی۔ اس طرح تم انہیں نباہ نہیں سکو گے۔ تم سے پہلے بھی ایک قوم نے ایسا ہی کیا تھا کہ خواہ مخواہ ایسی تفاصیل پوچھنی شروع کر دیں جن کا غیر متبدل رکھا جانا مقصود نہ تھا)۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ جب وہ تفاصیل، زندگی کے بدلنے والے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکیں تو انہوں نے دین ہی سے انکار کر دیا۔ اللہ کو چونکہ تمہاری حفاظت مقصود ہے۔ اس لئے تمہارے پوچھنے کے باوجود اس نے ان تفاصیل کو بیان نہیں کیا۔ اس کے علم کا یہی تقاضا تھا۔

تم نے غور کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ختم نبوت سے مقصود یہ ہے کہ تم زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کے لئے وحی کی راہنمائی کی طرف آنکھیں لگا کر نہ بیٹھ رہا کرو۔ ان کے متعلق عقل و فکر سے کام لیا کرو۔ اور وحی کے اصولوں کی روشنی میں انہیں خود متعیّن کیا کرو۔ یہی وہ تفاصیل تھیں جن کے متعین کرنے کے لئے خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (۳/۱۵۸)۔ یعنی ان کا فیصلہ اپنی جماعت کے مشورے سے کیا کرو۔ لیکن بعد کے مسلمانوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا اور جن تفاصیل کو خدا نے دانستہ غیر متعین چھوڑا تھا انہیں متعیّن کر کے ہمیشہ کے لئے غیر متبدل قرار دے دیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ وہی جو اُس قوم کی صورت میں ہوا تھا جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔ اسے سمجھنے کیلئے تم اس بات پر غور کرو کہ ہماری شریعت میں (یعنی ان تفاصیل میں جنہیں قرآن نے غیر متعیّن چھوڑا تھا) سینکڑوں باتیں ایسی ہیں جو زمانے کے بدلنے والے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتیں۔ ہمارے ارباب شریعت کا تقاضا ہے کہ وہ زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ دیں یا نہ دیں، انہیں اسی طرح سے ماننا اور ان پر اسی طرح سے عمل کرنا ہو گا۔ کیونکہ (بقول ان کے) وہ شریعت الٰہیہ کے احکام ہیں جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں خود دین کے متعلق طرح

طرح کے شبہات پیدا ہو رہے ہیں اور (اگرچہ وہ ابھی اعلانیہ اس کا اقرار نہیں کرتا لیکن) دل ہیں وہ خود دین کے منجانب اللہ ہونے سے انکار کر رہا ہے۔ تمہیں یاد ہے گذشتہ عید پر خالد نے کیا کیا تھا؟ پچھلی عید پر اسے جو جوتا لے کر دیا گیا تھا وہ اس کے پاؤں ہیں تنگ ہو گیا تھا (اس کا پاؤں ماشاءاللہ دن بدن بڑھ رہا ہے اور جوتا ویسے کا ویسا رہتا ہے) اس کی امّی کا اصرار تھا کہ وہ وہی جوتا پہنے۔ چنانچہ اس نے طوعاً و کرہاً اس وقت تو وہ جوتا پہن لیا۔ لیکن واپسی پر اسے عید گاہ میں کھو آیا۔

میری آنکھیں سلیم! اس خطرے کو دن بدن قریب آتے دیکھ رہی ہیں۔ ہم اپنے نوجوانوں کو تنگ جوتا پہننے پر مجبور کر رہے ہیں۔ یہ نہیں کرتے کہ جوتے کو قلبوت دے کر پاؤں کے مطابق بنا دیں۔ نوجوان اس وقت کسی نہ کسی مجبوری کی بناء پر اس جوتے کو پہنے ہوئے ہے۔ لیکن نمعلوم وہ کس وقت اسے اُتار کر کھڈ میں پھینک دے۔ وہ ایسا کرنے میں سچا ہو گا۔ ایسے جوتے کو جس سے پاؤں ہر وقت شکنجے میں جکڑے رہیں، کوئی کب تک پہنے رکھ سکتا ہے؟ تمہیں یاد ہے تمہاری نانی اماں ایسے موقع پر کیا کہا کرتی تھیں "بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان"۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ کسی دن اس مثل ہی کو نہ دُہرا دے۔ دین اس لئے آیا تھا کہ انسانی زندگی میں آسانیاں پیدا کرے۔ رسول اللہؐ کی بعثت کا مقصد قرآن نے یہ بتایا ہے کہ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ط ($\frac{٧}{١٥٧}$)۔ وہ اس بوجھ کو اُتار دے گا جسکے نیچے انسانیت دبی چلی آ رہی ہے، وہ اُن زنجیروں کو کاٹ کر پھینک دے گا جس میں انسان اپنی خودساختہ شریعت اور نظام کے ہاتھوں جکڑا ہوا ہے۔ ختم نبوّت نے اس مقصد کو پورا کر دیا۔ اس نے انسان کو صرف ان حدود اللہ (BOUNDARY LINES) کا پابند رکھا جو وحی کے غیر متبدل اصولوں نے اس کے معاشرے کے اردگرد کھینچی تھیں۔ ان حدود کے اندر اسے آزاد چھوڑ دیا کہ وہ اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود متعین کرے۔ لیکن ہماری خودساختہ شریعت نے ان ٹوٹی ہوئی زنجیروں کے ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے مژگانِ عقیدت سے چُن لیا اور انہیں پہلے سے بھی زیادہ سخت زنجیروں میں ڈھال کر ملت کو ان میں جکڑ دیا۔ اور اس طرح اس اُمت کو جس نے، اقطار السمٰوات و الارض، سے بھی آگے نکل جانا تھا ایسا زمین گیر بنا دیا کہ اس کی گردن ہی اوپر کو نہیں اٹھ سکتی قرآن کے الفاظ میں اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَی الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ○ وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ○ ($\frac{٣٦}{٨-٩}$) گردن میں طوق و سلاسل اور آگے پیچھے دیواریں جن سے کچھ نظر ہی نہ آئے۔ ہم نے ان زنجیروں میں خود اپنے آپ ہی کو نہیں جکڑا بلکہ قرآن کو بھی اپنی خودساختہ تفاسیر کے تابع رکھ کر اس بُری طرح جکڑ دیا کہ وہ ایک قدم بھی آزادانہ نہیں اُٹھا سکتا۔ تم نے سلیم! اُس دن اس بھینس کو دیکھا تھا جو اس بُری طرح سے چل رہی تھی۔ اُس کے مالک نے کیا یہ تھا کہ ایک چھوٹی سی رسّی ایک طرف

اس کے سینگ سے اور دوسری طرف اس کے پاؤں سے باندھ دی تھی۔ رسی اتنی چھوٹی تھی کہ اس سے اس بیچاری کا سر بالکل پاؤں کے قریب آگیا تھا۔ وہ اس رسی سے اس بُری طرح جکڑ رہی تھی کہ وہ ایک قدم بھی اپنی پوری رفتار سے نہیں اُٹھا سکتی تھی۔ وہ اسی رفتار سے چل سکتی تھی جس رفتار سے اس کا مالک چاہتا کہ وہ چلے۔ اس کی ساری آزادی سلب ہو چکی تھی۔ اس انداز سے جکڑے ہوئے جانور کو عرب "مہجور" کہتے ہیں۔ مہجور کے اس مفہوم کو سامنے رکھو اور پھر قرآن کریم کی اس آیت کا مطلب سمجھو جس میں کہا گیا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ خدا سے فریاد کریں گے کہ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰)۔ اے میرے نشوونما دینے والے میری قوم نے اس قرآن کو مہجور بنا رکھا تھا۔ ایسا کرنے والوں کے متعلق اس سے اگلی آیت میں ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ۔ اور اس طرح ہم نے مجرمین کے طبقہ میں سے ہر نبی کے دشمن بنا دیئے۔ یعنی ایسا کرنے والے مجرم ہیں اور نبوّت کے دشمن۔ اس کا علاج کیا ہے؟ یہ کہ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا (۲۵/۳۱)۔ خدا کی راہنمائی اور نصرت کو کافی سمجھا جائے اور انسانوں کی ان خود ساختہ جکڑ بندیوں کو توڑ کر رکھ دیا جائے جنہیں وہ شریعت خداوندی کے نام سے آگے بڑھاتے ہیں اور جن سے نجات دلانے کے لئے حضور خاتم النبیینؐ تشریف لائے تھے۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی ہوگی سلیم! کہ:

۱۔ کائنات میں ہر شے کی طرف خدا کی وحی براہ راست ہوتی ہے۔ یعنی ہر شے کا قانون زندگی اس شے کے اندر رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ قانون اس شے کی فطرت کہلاتا ہے۔

۲۔ جس شے کی فطرت میں کوئی قانون رکھ دیا جائے وہ اس قانون کی اطاعت پر مجبور ہوتی ہے۔ اسے اس سے سرتابی کا اختیار ہی نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ کائنات میں کسی شے کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں۔

۳۔ انسان کی تخلیق دیگر اشیائے کائنات سے بالکل مختلف انداز میں ہوئی ہے۔ اُسے اختیار و ارادہ دیا گیا ہے اسی وجہ سے اُس کا قانون زندگی اس کی فطرت کے اندر نہیں رکھا گیا۔ اُس کی طرف خدا کی وحی حضرات انبیائے کرامؑ کی وساطت سے آتی رہی ہے۔ یعنی اس نوع کے ایک منتخب فرد کی وساطت سے دیگر افراد تک وحی پہنچائی جاتی رہی ہے۔

۴۔ وحی کے اس منفرد طریق کے علاوہ انسان کو عقل و بصیرت بھی عطا کی گئی ہے۔ وحی کا کام یہ ہے کہ وہ انسانی عقل کی راہنمائی کرے۔

۵۔ جس قدر انسان کی عقل خام تھی اسی قدر وحی خداوندی زیادہ سے زیادہ تفصیلی احکام دیتی تھی۔ جوں جوں اس کی عقل میں پختگی اور علم میں وسعت آتی جاتی تھی یہ تفاصیل کم ہوتی جاتی تھیں۔ تا آنکہ

۶۔ وہ دور آگیا جس میں انسانی عقل بلوغت کی حد میں داخل ہوگئی۔ اس وقت خدا کی طرف سے آخری وحی آئی اور نوع انسان کی مکمل راہنمائی کے لئے جو کچھ دیا جانا مقصود تھا، اُسے اصولی طور پر قرآن کے اندر محفوظ کر کے وحی کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اب کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ قرآن کے اصولوں کی روشنی میں مختلف زمانوں کے تقاضوں کے مطابق تفاصیل کا مرتب کرنا انسان کی عقل و بصیرت پر چھوڑ دیا گیا۔ کیونکہ یہ تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ تمام خارجی کائنات کے مقابلہ میں انسان کی حیثیت منفرد ہے۔ اور ختم نبوّت کے بعد کاروانِ انسانیت ایک نئی منزل میں داخل ہو گیا ہے جس میں انسان کی خود اعتمادی پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور اس کی آزادی کو حدود اللہ کے سوا کسی اور چار دیواری سے محدود نہیں کیا گیا۔ یہ ہے سلیم! تمہارے سوال کا جواب اچھا اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ وہ دیکھو سامنے کی پہاڑی پر سورج کی آخری کرن برف آلود چوٹی کو بوسہ دے کر صبح تک کے لئے رخصت ہو گئی۔ ان چوٹیوں پر شام و سحر کے یہ مناظر کس قدر پُر کیف ہیں، اور جو کچھ غالب نے کہا تھا اس کی کیسی حسین تفسیر کہ

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

پرویز

جون ۱۹۵۶ء

اکیسواں خط

عید میلاد النبیؐ

سلیم بیٹا! اللہ تمہیں خوش رکھے اور تمہارے ذوقِ قرآنی میں برکت عطا فرمائے۔ رفتہ رفتہ تمہاری نگاہ کس قدر صاف اور تمہاری بصیرت کس قدر نورانی ہوتی جاتی ہے۔ قرآن کو غور و فکر سے سمجھنے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ وہ خود نور (روشنی) ہے اور انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے تمہیں ایک مرتبہ پہلے بھی لکھا تھا (اور یہ غالباً شروع ۱۹۵۳ء کی بات ہے)، میرے نزدیک دُنیا کے لئے جشنِ مسرّت کی تقریبات دو ہی ہیں۔ ایک نزولِ قرآن کی عید اور دوسری عید میلاد النبیؐ۔ اور یہ دونوں تقریبات بھی ایک سکہ کے دو رُخ اور ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں، اس لئے کہ نہ رسول اللہؐ کو قرآن سے الگ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی قرآن کو رسول اللہؐ سے جدا۔ قرآن، قلبِ محمدیؐ پر نازل شدہ وحیِ خداوندی کا نام ہے اور رسول اللہؐ قرآنی سیرت کے درخشندہ پیکر۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے صرف احکام و قوانین ہی عطا نہیں کئے بلکہ سیرتِ محمدیہؐ کے اصولی گوشوں کو بھی اپنے دامن میں محفوظ کر لیا ہے۔

تم نے پوچھا یہ ہے کہ رسالتِ محمدیہؐ کا مقصود کیا ہے؟ اس نے نوعِ انسان کو کیا دیا ہے؟ اس کا وہ کونسا کارنامہ ہے جس کی وجہ سے حضورؐ کا اسمِ گرامی محسنینِ عالمِ انسانیت کی فہرست میں سرِ عنوان چمکتا دکھائی دیتا ہے؟ اس سوال کے تفصیلی جواب میں تو ضخیم مجلدات لکھی جاسکتی ہیں (اور خود میری کتاب "معراجِ انسانیت" بھی اسی سوال کے جواب کی کوششِ ناتمام ہے) لیکن قرآن نے ان تمام تفاصیل کو جس حسن و خوبی سے ایک فقرہ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے جب نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو اس پر والہانہ وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ سورۂ اعراف میں بعثتِ محمدیؐ کی غایت و مقصود کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے کہا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي

كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷)۔ وہ نوعِ انسان کے سر سے تمام بوجھ اُتار کر رکھ دے گا جس کے نیچے وہ دبی ہوئی چلی آ رہی ہے اوران تمام زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں وہ جکڑی ہوئی ہے۔ یہ ہے سلیم! بعثت محمدیہ کی وہ عظیم غایت، جسے قرآن نے اس ایجاز و اختصار سے ان چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ تم اگر غور کرو گے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے گی کہ رسالتِ محمدیہ ایک حدِ فاصل ہے، زمانہ قدیم اور دورِ جدید میں۔ اس سے پہلے کی انسانی تاریخ دراصل ایک مسلسل داستان ہے ان گراں بار سلوں کی جن کے نیچے انسانیت بُری طرح دب رہی تھی اوران اطواق و سلاسل کی جن میں اس کا بند بند جکڑا ہوا تھا، بایں نمط کہ وہ اپنی مرضی سے ایک قدم بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ زنجیریں وہ تھیں جن میں انسان کا دل اور دماغ دونوں ماخوذ تھے۔ ان سے نہ اس کے ذہن میں صحیح فکر پرورش پا سکتی تھی، نہ ہی اس کے سینے میں حسین و خوشگوار جذبات کی بالیدگی ممکن تھی۔ قصۂ بنی اسرائیل میں دیکھو، قرآن نے ان مسیطرانِ نوعِ انسانی کا تذکرہ کس شرح و بسط سے کیا ہے جو انسانی قلب و دماغ پر بُری طرح مسلّط رہتے ہیں۔ فرعون، استبداد ملوکیت کا مجسمہ (کہ جس کا نام آج تک بطور ضرب المثل استعمال ہوتا ہے) ہامان، مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا نمائندہ (جس کی سحر کاری کی بنیاد پر قصرِ فرعونیت استوار تھا) اور قارون، سرمایہ داری کی لعنت کا نمائندہ (جس نے خود اپنی قوم کے لہو کا آخری قطرہ تک چوس لیا تھا)۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے ہر سنگِ گراں انسانیت کی ہڈیاں توڑ دینے کے لئے کافی تھا۔ لیکن جس انداز سے مذہبی استبداد اس کے دل و دماغ پر مسلّط ہو رہا تھا اس کی مثال دوسرے شعبوں میں بھی نہیں مل سکتی تھی۔ رسالتِ محمدیہ کا سب سے بڑا معرکہ آرا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فکرِ انسانی کو ان زنجیروں سے آزاد کیا۔ اس مقام پر شائد تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ اسلام تو خود ایک مذہبی تحریک (RELIGIOUS MOVEMENT) ہے۔ اس لئے اس نے انسان کو "مذہب" کے چنگل سے کس طرح چھڑا دیا؟ اگر کوئی دہریہ (ATHEIST) یہ کہے کہ میں نے فکرِ انسانی کو مذہب کی گرفت سے آزاد کرایا ہے تو اس کا یہ دعویٰ قابلِ فہم ہو گا۔ لیکن ایک مذہبی تحریک کا یہ دعویٰ کس طرح قابلِ پذیرائی سمجھا جا سکتا ہے؟ تمہارے دل میں اس خیال کا پیدا ہونا بجا ہے۔ لیکن حقیقت وہی ہے جس کی طرف میں نے اُوپر اشارہ کیا ہے۔ یہ مقام ذرا مشکل ہے۔ اس لئے اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

مذہب کی دنیا میں بنیادی تصوّر خدا کا ہے۔ اس تصوّر کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ کسی قوم میں جس قسم کا خدا کا تصوّر ہو گا اسی کے مطابق اس قوم کی تہذیب و معاشرت اور ذہنیت اور نفسیاتی کیفیت ہو گی۔ (خدا کے صحیح تصوّر کے متعلق میں ایک سابقہ خط میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ اس وقت اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ

رسالتِ محمدیہؐ سے پہلے، مذاہب کی دنیا[1] میں خدا کا تصوّر ایک مستبد اور مطلق العنان حکمران کا سا تھا، جو نہ کسی قاعدے کا پابند تھا نہ قانون کا۔ جس کے ہاں نہ کوئی آئین تھا نہ دستور۔ وہ جو جی میں آئے کرتا تھا اور جس قسم کا جی چاہے حکم دے دیتا تھا۔ دنیا کے عام شاہنشاہوں کی طرح اس کی بھی یہ کیفیت تھی کہ (سعدی کے الفاظ میں) گاہے بہ سلامے بر بخند و گاہے بہ دشنامے خلعت بہ بخشند۔ اس کے ہاں سے بطور استحقاق کچھ طلب کرنا تکبر و نخوت سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے کہ وہ جسے کچھ دیتا تھا اپنی خوشی سے بطور احسان دیتا تھا۔ لہٰذا انسان کی ہر وقت کوشش یہ رہتی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح خدا کو خوش رکھے (انسانی بادشاہوں کی طرح) اسے خوش کرنے کے لئے کبھی اس کی شان میں حمد و ستائش کے قصیدے پڑھے جاتے تھے اور کبھی اس کے حضور گڑگڑا کر رحم کی درخواستیں گذاری جاتی تھیں۔ کبھی اس کی بارگاہ میں نذرانے پیش کئے جاتے تھے اور کبھی اسے قربانیوں سے خوش کیا جاتا تھا۔ پھر دنیاوی بادشاہوں کی طرح، خدا کا دربار بھی ہوتا تھا جس میں "مقربین" اس کے گرد و پیش بیٹھتے تھے۔ باہر، حاجب و دربان ہوتے تھے۔ لہٰذا عام انسان کے لئے اس تک براہ راست پہنچنا ناممکن تھا۔ اسے، خدا تک اپنی بات پہنچانے کے لئے وسیلوں اور سفارشیوں کی تلاش کرنی پڑتی تھی۔ یہ سفارشی وہ مقرب تھے جو خدا کے دربار میں موجود رہتے تھے۔ ان کی سفارش سے عوام کے کام نکلتے تھے۔ عوام کو ان کی سفارش حاصل کرنے کے لئے بھی بہت کچھ کرنا پڑتا تھا۔ غرضیکہ اس قسم کا خدا اور اس کے یہ تمام مقربین، انسان کے لئے مستقل ھوّا بنے رہتے تھے۔

تم غور کرو سلیم! کہ اگر کسی ذی حس انسان کو اس قسم کے بادشاہ کے زیرِ حکومت چار دن بھی گذارنے پڑیں تو اسکے احساس انسانیت کا حشر کیا ہوگا؟ اور اگر اُسے اس دنیا کی پوری زندگی اور اس کے بعد کی زندگی دونوں اس قسم کے خدا کی حکومت میں بسر کرنی پڑیں جس میں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہے کہ 'اب چھری صیاد نے لی، اب قفس کا در کھلا'، تو اس میں اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ یہ تھیں وہ ناقابل برداشت پتھر کی سلیں جن کے نیچے انسانیت دبی چلی آرہی تھی۔ اور یہ تھیں وہ استخوان شکن زنجیریں جن میں انسان جکڑا ہوا تھا۔ رسالتِ محمدیہؐ نے آکر خدا کا ایسا تصوّر دیا جس سے مجبور و مقہور انسان ان تمام اغلال و سلاسل سے آزاد ہو کر شرفِ انسانیت سے ہم آغوش ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ بے شک خدا، لا انتہا قوتوں کا مالک اور اپنے ارادوں اور فیصلوں میں مختار مطلق ہے، لیکن اس نے نظم و نسق

---

[1] اس سے مراد وہ تصوّر ہے جو مذاہب میں رائج تھا ورنہ حضرات انبیائے کرامؑ نے خدا کا صحیح تصوّر ہی دیا تھا۔ اُن کی تعلیم میں تحریف کی وجہ سے یہ صحیح تصوّر باقی نہیں رہا تھا۔

کائنات اور انسانی سعی و عمل کے نتائج کے لئے ایسے اٹل قوانین بنا دیئے ہیں جن میں کہیں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (۲۵/۲)۔ اس نے ہر شے کو پیدا کیا اور پھر اس کے لئے پیمانے مقرر کر دیئے۔ یہ "قدر" یا پیمانے ہی ہیں جنہیں دورِ حاضر کی اصطلاح میں قانون (LAW) کہا جاتا ہے (قانون یا LAW سے مراد وہ قانون نہیں جس کی عدالتوں میں مٹی پلید ہوتی ہے۔ بلکہ وہ قانون جس کے مطابق کارگہ کائنات اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے)۔ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (۶۵/۳)۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے ہر شے کے لئے ایک قانون بنا دیا ہے لہٰذا یہاں کسی مستبد حاکم کی مطلق العنانی کارفرما نہیں۔ یہاں ہر کام قاعدے اور قانون اور آئین و دستور کے مطابق ہوتا ہے۔ جسے ہم "امر اللہ" یا خدا کا حکم کہتے ہیں، جب وہ عالمِ محسوسات میں کارفرما ہوتا ہے تو قوانین کی حدود میں محدود ہو جاتا ہے۔ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا (۳۳/۳۸)۔ ظاہر ہے سلیم! جہاں ہر کام قانون کے مطابق سرانجام پاتا ہو وہاں نہ کسی کی خوشامد درآمد کی ضرورت ہوتی ہے، نہ رشوت اور نذرانے کی، وہاں نہ کسی وسیلے کی احتیاج ہوتی ہے نہ کسی سفارش کی تلاش، وہاں نہ کسی سے بے انصافی ہوتی ہے نہ کسی کی رو رعایت۔ اس اندازِ حکومت میں، لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۲/۴۸)۔ پھر یہ قانون بھی اس طرح نتیجہ خیز ہوتا ہے جس طرح سنکھیا کھانے سے ہلاکت اور پانی پینے سے پیاس کی تسکین ہو جاتی ہے۔ اس میں نہ کسی عدالت میں جانے کی ضرورت پڑتی ہے نہ کورٹ فیس لگانے کی حاجت، نہ گواہ بلانے کا مطالبہ ہوتا ہے نہ دستاویزیں پیش کرنے کا تقاضا۔ ادھر عمل سرزد ہوا، اُدھر اس کا نتیجہ مرتب ہونا شروع ہو گیا۔

سوچو سلیم! کہ اس قسم کی فضا میں انسان کو کس قدر حریت اور آزادی نصیب ہوتی ہے اور اس کی پیشانی میں سربلندیوں اور سرفرازیوں کے کتنے عظیم عرش جھلک اُٹھتے ہیں۔ اس میں قانون کی اطاعت کرنی ہوگی اور بس۔ اس میں کسی فرد کی غلامی اور محکومی کا سوال ہی نہیں ہوگا۔ نہ ہی وہ تذبذب اور اضطراب جو مستبد شہنشاہ قسم کے "خدا" کے تصور کے ماتحت ہر وقت سینۂ آدم میں آتشِ خاموش کی طرح سلگتا رہتا تھا کہ نہ معلوم وہ کس بات سے ناراض ہو جائے اور اس کا نتیجہ کیا ہو؟ اب ہر شے کے پیمانے مقرر ہیں۔ ان پیمانوں (قوانین) کا علم حاصل کیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ فلاں عمل کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس کے بعد آپ کا ہر قدم حتم و یقین کے ساتھ اٹھے گا اس حتم و یقین کے ساتھ کہ دنیا خواہ اِدھر سے اُدھر ہو جائے جس قانون کا سررشتہ آپ نے تھاما ہے وہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ تمہیں سلیم! وہ رسے کا پل (ROPE-WAY) یاد ہے جس میں ہنگوڑا لٹکا کر اتنی گہری کھڈ کو عبور کیا کرتے جب وہ ہنگوڑا نیچ میں جاتا تھا اور نیچے کھڈ کا بھیانک اندھیرا نظر آتا تھا تو وہ سماں کس قدر ہولناک ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود

ہم کس بے فکری اور خوشی سے اِدھر سے اُدھر آیا جایا کرتے تھے۔ یہ اطمینان کس چیز سے حاصل تھا؟ صرف اس سے کہ اس کا رسا اس قدر مضبوط ہے کہ وہ کبھی ٹوٹے گا نہیں۔ وہ درمیان میں جاکر دھوکا نہیں دیگا۔ بس ایسا ہی اطمینان اس قانون کی اطاعت سے ہوتا ہے جسکے متعلق یقین ہو کہ وہ کبھی دغا نہیں دے گا، کبھی ٹوٹے گا نہیں۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶)۔ جس نے ہر غیر خداوندی قانون سے منہ موڑ کر صرف قانونِ خداوندی پر بھروسہ کر لیا تو اس نے ایک مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اور اس "قانون کی اطاعت" بھی کسی تھانیدار کے حکم کی اطاعت نہیں بلکہ ایک ڈاکٹر کی ہدایات کی تعمیل ہے۔ جو ان ہدایات کی تعمیل کرے گا وہ بیماری سے محفوظ رہے گا۔ جو ان کے خلاف جائے گا، اس کی صحت تباہ ہو جائے گی۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲/۳۸)۔

کائنات میں قانون کی کارفرمائی کے تصوّر نے ہر قسم کی توہم پرستی کا خاتمہ کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں کوئی حادثہ یونہی ہنگامی طور پر رونما نہیں ہوتا بلکہ سلسلہ علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کے مطابق ہوتا ہے۔ اس حقیقت نے ہر ذہن کو دعوتِ غور و فکر دی اور اس طرح، خدا کے اس صحیح تصوّر سے سائنٹفک دور کا آغاز ہو گیا اور علم انسانی کے لئے تحقیق و کاوش کے لا انتہا راستے کھل گئے۔

تم نے دیکھا کہ خدا کے تصوّر میں اس بنیادی تبدیلی سے، رسالتِ محمدیہؐ نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور اس کے قلب و اذہان سے کس کس قسم کا بوجھ اتار کر اسے صحیح انسانیت کی آزادی عطا کر دی۔

مذہب کی دنیا میں خدا کے بعد رسولؐ کا درجہ آتا ہے۔ رسالتِ محمدیہؐ سے پہلے، اقوامِ عالم نے اپنے مذہب کے بانیوں کو انسانی سطح سے اٹھا کر، خدائی مسند پر بٹھا دیا تھا۔ ہندو اپنے رشیوں کو پرمیشور کا اوتار مانتے تھے، زرتشتیوں کا مینترا خود خدا مانا جاتا تھا، عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا ہی نہیں بلکہ خدائی میں تیسرے حصے کا شریک قرار دے رکھا تھا۔ علاوہ اس کے کہ یہ چیز علم و حقیقت کے خلاف تھی، ذہنِ انسانی پر اس کا اثر یہ تھا کہ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ بڑے بڑے کارنامے جو اُن بزرگوں سے سرزد ہوئے دوسرے انسانوں سے عمل میں نہیں آ سکتے کیونکہ وہ مافوق البشر قوتوں کے حامل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ اقوام، اپنی نشاۃ ثانیہ (تازہ حیات قومی) کے لئے کسی مافوق البشر "آنے والے" کا انتظار کرتی تھیں۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ کام ہم لوگوں سے ہو ہی نہیں سکتا۔ تم سمجھتے ہو سلیم! کہ اس عقیدہ کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ تو ہیں فکر اور عمل دونوں اعتبار سے قامتِ انسانیت

(HUMAN STATURE) تک پہنچ ہی نہ سکیں۔ ان کے اعصاب پر ہر وقت جذبۂ مرعوبیت (INFERIORITY COMPLEX) سوار رہتا تھا جو ان کے مضمر جوہروں میں بالیدگی پیدا نہیں ہونے دیتا تھا۔

رسالت محمدیہؐ نے آکر اعلان کیا کہ "اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ" اس خصوصیت کو چھوڑ کر کہ نبی کو خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے، وہ تمہارے ہی جیسا انسان ہوتا ہے۔ لہٰذا وحی کے مطابق جو انقلاب اس نے برپا کیا تھا وہ تم بھی کر سکتے ہو۔ اس کے لئے کسی مافوق البشر قوت و استعداد کی ضرورت نہیں۔ رسولؐ کی زندگی تمہارے لئے اس اعتبار سے نمونہ بنتی ہے کہ جو کچھ اس نے کیا تھا وہ تمہارے لئے ناممکن الحصول یا ناممکن العمل نہیں۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ رسولؐ کے تصوّر میں اس تبدیلی نے انسان کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر کس طرح آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا؟ لیکن رسالت محمدیہؐ تو اس سے بھی ایک قدم آگے چلی گئی۔ اس سے پہلے انسان اپنے عہدِ طفولیت میں تھا جہاں اسے قدم قدم پر کسی انگلی پکڑنے والے کے سہارے کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور میں انبیاءؑ کا سلسلہ پیہم و متواتر جاری رہا۔ لیکن رسالت محمدیہؐ نے اعلان کر دیا کہ اب سلسلۂ نبوّت ختم ہو گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب انسانوں کو اپنے معاملات کے فیصلے آپ کرنے ہوں گے۔ صرف یہ دیکھنا ہو گا کہ ان کا کوئی فیصلہ ان غیر متبدل اصولوں کے خلاف نہ جائے جو وحی نے عطا کئے ہیں اور جو اب قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ جیسا کہ ایک سابقہ خط میں بتایا جا چکا ہے۔ انسانیت کی تاریخ میں ختم نبوت کا اعلان ایک بہت بڑا انقلاب ہے۔ اس سے انسانی تاریخ میں نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اور یہ اعلان (معاذ اللہ) کسی منکر نبوّت کی طرف سے نہیں ہوا۔ ختم نبوت کا اعلان خود زبان نبوت سے ہوا ہے۔ یہ اعلان ہے اس حقیقت کا کہ اب انسان، سن شعور کو پہنچ گیا ہے اور اسے صرف اتنی راہنمائی کی ضرورت ہے کہ ہر دوراہے پر معلوم ہو جائے کہ یہ راستہ کس طرف جاتا ہے اور وہ راستہ کس سمت کو۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ رسالتِ محمدیہؐ نے اس باب میں کس قدر حریت فکر و عمل اور خود اعتمادی و خود فیصلگی کی صلاحیت عطا کی ہے۔

مذہب کی دنیا میں تیسری چٹان، بازنجیر در زنجیر کیا پورے کا پورا جیل خانہ، پیشوائیت کی لعنت ہے۔ (وہی جسے انگریزی میں (PRIESTHOOD)، ہندوؤں کے ہاں برہمنیت، اور ہمارے ہاں ملائیت کہا جاتا ہے) یہ زنجیریں وہ ہیں جو انسان کو ایک قدم بھی اپنی مرضی سے اٹھانے نہیں دیتیں۔ یوں بیٹھو، یوں اٹھو، یوں سوؤ، یوں جاگو، یوں چلو، یوں پھرو، یوں کھاؤ، یوں پیو، دایاں پاؤں ادھر رکھو بایاں ادھر سیدھا ہاتھ یوں اٹھاؤ الٹا یوں۔ پوری

کی پوری زندگی ایک مستبد ڈکٹیٹر کی (REGIMENTATION) بنا دی جاتی ہے۔ سوچو سلیم! کہ انسانیت پر یہ بوجھ کس قدر گراں اور یہ زنجیریں کیسی استخواں شکن تھیں۔ رسالتِ محمدیہؐ نے ان تمام زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا اور کہہ دیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہو سکتی۔ قانون کی اطاعت میں پیشوائیت کا کیا کام؟

اس سے آگے بڑھئے۔ مذہب کی دنیا میں "نجات" کا تصوّر سامنے آتا ہے۔ اسے درحقیقت مذہب کا مقصود و منتہیٰ قرار دیا جاتا ہے۔ خود لفظ "نجات" اس کی غمازی کرتا ہے کہ انسان کسی جیل خانے میں محبوس یا سخت زنجیروں میں مقید ہے اور ان زنجیروں سے رہائی حاصل کرنا نجات ہے۔ رسالتِ محمدیہؐ نے اس کا اعلان کیا کہ نجات کا یہ تصوّر غلط ہے۔ انسان کسی مصیبت میں گرفتار نہیں کہ اسے اس سے نجات دلائی جائے۔ اسے کچھ قوتیں اور صلاحیتیں دی گئی ہیں اور ممکنات کی ایک وسیع دُنیا اس کے سامنے رکھ دی گئی ہے۔ اس کے بعد اس سے کہہ دیا گیا ہے یہ اپنی سعی و عمل سے جو کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے، کرے۔ جو جس قدر متاع حاصل کرے گا، اتنا ہی کامیاب و کامران ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے زندگی کا مقصود نجات کی بجائے فلاح و فوز قرار دیا ہے۔ فلاح کے معنی ہیں کھیتی کا پروان چڑھنا۔ محنتوں کا ثمر بار ہونا، اور فوز کے معنی ہیں (ACHIEVEMENT)۔ ان صلاحیتوں کی نشوونما جن سے زندگی اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جائے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ رسالتِ محمدیہؐ نے بیک جنبش ان محکم زنجیروں کو کسطرح تارِ عنکبوت بنا کر رکھ دیا!

مذہب کی دنیا سے آگے بڑھ کر معاملات کی دنیا میں آئیے تو ملوکیت کا استبداد، نوعِ انسان کے سر پہ ہمالیہ سے زیادہ گراں بار پہاڑ تھا جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ رسالتِ محمدیہؐ نے نوعِ انسان کو یہ انقلاب آفریں پیغام دیا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ انسانوں کو اپنے معاملات قوانینِ خداوندی کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔ جو ان میں سے اُن قوانین و ضوابط کی نگہداشت سب سے زیادہ کرتا ہے وہ ان میں سب سے زیادہ واجب التکریم ہے۔ لیکن حقِ حکومت اسے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ خود نبی کو بھی نہیں۔

ملوکیت کی غلامی سے بھی زیادہ کرب انگیز اور انسانیت سوز غلامی، اقتصادی غلامی (ECONOMIC SLAVERY) ہے۔ نوعِ انسانی اس قدر مدت مدید سے اس غلامی میں ماخوذ چلی آ رہی تھی کہ غلاموں کو اپنی غلامی کا احساس تک بھی باقی نہیں رہا تھا۔ رسالتِ محمدیہؐ نے آ کر اعلان کیا کہ خدا نے زمین کے دسترخوان پر رزق کو اس لئے بکھیر رکھا ہے کہ اس سے تمام نوعِ انسان کی پرورش ہو سکے۔ لہٰذا کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ رزق کے سرچشموں پہ

ذاتی قبضہ جما لے۔ یہ معاشرے کی تحویل میں رہنے چاہییں اور معاشرے کو تمام افراد کی ضروریات زندگی کا کفیل ہونا چاہیئے۔

اس مقام پر سلیم! ممکن ہے تمہارے دل میں ایک سوال پیدا ہو جس کا جواب ضروری ہے۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب کوئی قوم رزق کی طرف سے مطمئن ہو جائے تو اس کے قوائے عملیہ مفلوج ہو جاتے ہیں اور وہ رفتہ رفتہ زندگی کی حرارت سے محروم ہو جاتی ہے۔ اگر قرآنی نظام کے ماتحت، افراد معاشرہ کو حصول رزق کی کشمکش سے نجات دلا دی جائے تو کیا ان کی بھی یہی حالت نہ ہو جائے گی؟ یہ اعتراض بڑا معقول نظر آتا ہے اور تاریخ اقوام انسان کو اسی نتیجہ پر پہنچاتی ہے۔ لیکن سلیم! اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نے اپنی زندگی کا مقصود صرف حصولِ رزق قرار دے رکھا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی حیات طبیعی کا نام ہے اور جب اسے اس زندگی کی بقا کا سامان (رزق) میسر آجائے تو اس کے بعد اس کے سامنے کوئی ایسا مقصد نہیں رہ جاتا جس کے حصول کے لئے جدوجہد کرنی پڑے۔ یہ وجہ ہے کہ جب کوئی قوم رزق کی طرف سے مطمئن ہو جاتی ہے تو اس کی قوتوں میں اضمحلال شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن نے طبیعی زندگی کو محض حیوانی سطح کی زندگی قرار دیا ہے۔ اس لئے یہ مقصود و منتہائے انسانیت نہیں۔ اس نے انسان کے سامنے اس سے کہیں بلند اور وسیع مقاصد رکھے ہیں (ان کی تفصیل مختلف مواقع پر بتا چکا ہوں اس لئے ان کے دُہرانے کی یہاں ضرورت نہیں)۔ قرآن نے یہ دیکھا کہ انسان کی یہ کس قدر بدنصیبی ہے کہ اس کی ساری توانائیاں محض حصول رزق میں ضائع ہو جاتی ہیں اور وہ ان سے بلند مقاصد کی طرف توجہ ہی نہیں دے سکتا۔ اس نے اسے روٹی کی طرف سے مطمئن کر کے اس کی تمام توانائیوں کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے محفوظ (CONSERVE) کر لیا اور اس سے کہہ دیا کہ وہ اپنی تمام توجہات کو ان مقاصد پر مرکوز کر دے اور اس طرح "اقطار السموٰت و الارض" سے آگے نکل جانے کی کوشش کرے۔ ذرا غور کرو سلیم! کہ رسالت محمدیہؐ نے اس ایک تبدیلی سے عالم انسانیت میں کتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے انسان کی تمام توانائیوں کو جو حصول رزق جیسے اسفل مقصد ہی میں ضائع ہو جاتی تھیں، محفوظ کر لیا۔ لیکن رزق کی طرف سے اطمینان ہو جانے سے انسان میں جو تعطّل پیدا ہو جاتا تھا اس کے سامنے بلند ترین مقاصد رکھ کر نہ صرف اس تعطّل کو دور کر دیا، بلکہ اس کی زندگی کو جہادِ مسلسل میں تبدیل کر دیا۔ ایسے مسلسل جہاد میں، کہ جانے والی نسل جس حد تک راستہ طے کر جائے آنے والی نسل کے لئے وہ مقام سفر کا نقطۂ آغاز بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ماضی کی طرف نگاہ رکھنے کی بجائے ہمیشہ مستقبل کو سامنے رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ اسی کا نام ایمان بالآخرت ہے اور یہ بجائے خویش بہت بڑا انقلاب ہے جسے رسالت محمدیہؐ نے

انسانی نگاہ میں پیدا کیا ہے۔ یعنی ہمیشہ نگاہ مستقبل پر رکھنی۔ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔ اِس زندگی میں بھی مستقبل پر اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔

خط لمبا ہو گیا ہے لیکن اسے ختم کرنے سے پہلے میں اس خصوصیتِ کبریٰ کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں جو میرے نزدیک رسالت محمدیہؐ کا نوع انسانی پر احسان عظیم ہے۔ تم غور کرو کہ انسان اپنی طبعی دنیا میں نسلاً بعد نسلٍ ترقی کرتا ہوا کس طرح آگے بڑھتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ مثال کے طور پر امراض اور ان کے علاج کے شعبہ ہی کو دیکھو۔ جن امراض کو آج سے چند صدیاں پہلے لا علاج سمجھا جاتا تھا (بلکہ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ امراض ہیں کیا) ان پر انسان کس طرح قابو پاتا چلا جا رہا ہے۔ پھر طریقِ علاج پر غور کرو۔ ابھی پچاس سال پہلے دانت نکلوانا اس قدر کرب انگیز تھا کہ آج اس کے تصور سے کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن آج ایک دانت تو کیا، پورے کا پورا جبڑا اس طرح نکال کر رکھ دیا جاتا ہے کہ آدمی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ کب ہو گیا۔ اسی طرح سرجری (جراحی) کی دوسری مثالوں کو سمجھ لو۔ اب تم غور کرو کہ پچھلی صدی کے انسان کے لئے یہ تصور کس قدر یاس انگیز اور حسرت ناک ہو گا کہ میں یونہی سو سال پہلے پیدا ہو گیا۔ اگر میں بھی بیسویں صدی میں پیدا ہوتا تو اس تمام کرب و درد سے بچ جاتا جس میں مختلف امراض اور ان کے علاج کی وجہ سے مبتلا رہا۔ یہ اس لئے ہے سلیم! کہ انسانی عقل کا طریق تجرباتی ہے۔ وہ مختلف تجارب کے بعد رفتہ رفتہ انکشافِ حقائق کرتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ اس باب میں سابقہ نسل کا انسان، آنے والی نسل کی سطح سے نیچے رہ جاتا ہے۔ یہ اس کی بے بسی ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔

لیکن وحی کا طریق تجرباتی نہیں۔ اس کی رو سے وہ تمام حقائق جو انسانیت کی نشو و نما کے لئے ضروری ہیں، بیک وقت نوع انسانی پر (نبی کے ذریعے) منکشف کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سابقہ اور موجودہ اور آنے والی نسل کے تمام انسان ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں۔ اس میں کسی گزشتہ نسل کے انسان کو اس کا افسوس نہیں ہوتا کہ وہ آنے والی نسل سے پہلے کیوں پیدا ہو گیا؟ وہ بھی اسی مقام پر ہوتا ہے جس مقام پر آنے والی نسل کے انسان نے ہونا ہے۔ لہٰذا اس میں کسی دور کے انسان کے لئے وجہِ مایوسی اور احساس بے بسی نہیں ہوتا۔ وحی کی رو سے عطا فرمودہ پروگرام سب کے لئے یکساں طور پر باعث رحمت ہوتا ہے۔ جو قوم جس دور میں بھی اسے اختیار کرے اس کے سامنے وہی نتائج آ جاتے ہیں۔ چونکہ یہ پروگرام رسالتِ محمدیہؐ میں تکمیل تک پہنچ گیا اور ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا اس لئے رسالتِ محمدیہؐ تمام نوع انسانی کے لئے رحمت ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کا مفہوم یہی ہے۔

کیوں سلیم! کتنا بڑا ہے یہ احسان؟ اس کی سپاس گزاری میں تمام نوع انسانی کی گردن اس رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْن کے حضور جھکنی چاہیئے یا نہیں؟ اب تم سمجھے کہ میں اس تقریب عظیم کو کیوں تمام دنیا کے انسانوں کیلئے سب سے بڑا جشن مسرت قرار دیتا ہوں؟ سلیم! دنیا نے ابھی تک رسالت محمدیہ کی غایت و مقصود کو سمجھا ہی نہیں۔ لیکن اس میں دنیا والوں کا کیا قصور؟ ہم انہیں سمجھاتے تو وہ سمجھتے!

اور اس کے جواب میں تم کہدو گے کہ اس میں ہمارا بھی کیا قصور؟ ہم خود سمجھتے تو دوسروں کو بھی سمجھاتے!

بہرحال اب تو تم سمجھ گئے کہ رسالت محمدیہ کس طرح رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ ہے؟ اس نکتہ کی مزید تشریح دوسرے خط میں کی جائے گی۔ وبیدہٖ التوفیق۔

والسّلام

پرویز

اکتوبر ۱۹۵۵ء

بائیسواں خط

رحمۃ للعالمین

سلیم میاں! دعا

۔ پچھلے خط میں میں نے وعدہ کیا تھا کہ نبی اکرمؐ کی رحمۃٌ للعالمینی کے متعلق مزید تصریحات کسی دوسرے وقت لکھوں گا۔ آج اس کے لئے فرصت مل گئی۔ اس خط کو، اُس سابقہ خط ہی کا ایک حصہ سمجھو۔ اس میں بعض باتیں ایسی بھی آجائیں گی جو سابقہ خط میں لکھی جا چکی ہیں۔ انہیں ان کا تشریحی بیان سمجھو۔

دنیا کی کسی قوم کو لو، اس نے سال میں کچھ دن ایسے تجویز کر رکھے ہوں گے جنہیں وہ بطور قومی تیوہار منائے گی۔ قومی زندگی میں تیوہاروں کی تقریبات ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ تیوہار در حقیقت کسی قوم کے اجتماعی جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں اور اظہارِ جذبات (بشرطیکہ وہ آئین وضوابط اور سنجیدگی و شرافت کی حدود سے تجاوز نہ کرے) انسانی ذات کی نشو ونما کے لئے نہایت ضروری ہے۔

تیوہار عام طور پر کسی اہم واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے جس واقعہ کی یاد میں کوئی قوم اپنا تیوہار مناتی ہے اس سے اس امر کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس قوم کے نزدیک زندگی کے مختلف عناصر کی اہمیت کا معیار کیا ہے۔ مثلاً ہندوستان کی ابتدائی آریہ قوم زراعت پیشہ تھی۔ اس لئے انہوں نے جہاں گنگا جمنا جیسے دریاؤں، بڑ اور پیپل جیسے درختوں کو اپنا دیوتا اور زمین (دھرتی) کو ماتا بنایا، وہاں موسموں کے تغیرات کے اوقات (بسنت، ہولی، وغیرہ) کو قومی تیوہار قرار دے لیا۔ اسلامی زندگی میں سب سے بلند اور عظیم مقام قرآن کریم کو حاصل ہے۔ اس لئے ان کے ہاں نزولِ قرآن سے زیادہ اہم واقعہ اور کونسا ہو سکتا تھا جسے ملّی تیوہار کی حیثیت حاصل ہوتی۔ اس ضمن میں خود اللہ تعالیٰ نے کہدیا کہ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۱۰/۵۸) "ان سے کہدو کہ

(قرآن کا ملنا) اللہ کے فضل اور رحمت سے ہے ۔ انہیں چاہیئے کہ اس پر خوشیاں منائیں ۔ یہ ہر اس شے سے بہتر ہے جسے لوگ جمع کرتے ہیں ۔ (اس نکتہ کی تفصیل کسی دوسرے خط میں لکھوں گا)۔

لیکن قرآن کے بسیط حقائق (ABSTRACT REALITIES) اور نظری قوانین (THEORETICAL LAWS) کو ایک جیتے جاگتے عملی نظام کی شکل میں سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے پیش کیا ۔ اس لئے نزولِ قرآن کی یاد منانے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی حیاتِ طیبہ کو بھی سامنے لایا جائے جس نے قرآنی حقائق کو محسوس پیکروں میں متشکل کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ اس نظام کے نتائج نوع انسانی کے حق میں کس قدر حیات بخش اور انسانیت ساز ہیں ۔ ہمارے ہاں اس حقیقتِ کبریٰ کی یاد تازہ کرنے کے لئے حضورؐ کے یوم پیدائش کو بطور جشن مسرت (ملی تیوہار) منایا جاتا ہے جسے عام طور پر عید میلاد النبیؐ کہا جاتا ہے ۔ یہ تقریب حضورؐ کے یوم پیدائش سے متعین ہوتی یا یوم وفات سے، واقعۂ ہجرت کی یاد میں ہوتی یا تکمیل دین کی مناسبت سے ۔ میرے نزدیک اس سے اصل حقیقت پر کچھ فرق نہیں پڑتا، نہ پڑ سکتا ہے ۔ مقصود و مطلوب، بہر حال، قرآنی حقائق کی روشنی میں حضورؐ کی سیرت طیبہ کو دنیا کی نگاہوں کے سامنے لانا ہے ۔ اگر ہم اس مقصد کے لئے اس تقریب سعید کو مناتے اور اسی انداز و اسلوب سے آپؐ کی سیرت مقدسہ کو دنیا کے سامنے پیش کرتے، تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا ۔ اگر ہم اب بھی اس تقریب کو اس انداز سے منائیں اور دنیا کے سامنے خالص قرآن کی تعلیم اور اس کی روشنی میں حضورؐ کی سیرت کو پیش کریں، تو میں علیٰ وجہ البصیرت، دل کے پورے یقین سے، کہہ سکتا ہوں کہ پوری نوع انسان اس تقریب کو منانے لگ جائے ۔ اس لئے کہ میرے گھر کا دیا میرے صحن خانہ کو روشن کرتا ہے، اس لئے وہ صرف میرا دیا کہلاتا ہے ۔ لیکن سورج ساری دنیا کو روشن کرتا ہے اس لئے وہ پورے عالم انسانیت کا مشترکہ چراغ ہوتا ہے ۔ کسی خاص فرد، خاندان، قبیلہ، قوم یا ملک کا سورج نہیں ہوتا ۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۙ وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝ (۳۳/۴۶) اے نبیؐ! ہم نے تجھے (اقوام عالم کے اعمال کا) نگران، زندگی کی صحیح روش پر چلنے کے خوشگوار نتائج کی خوشخبری دینے والا اور غلط راستے پر چلنے کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے ۔ نیز خدا کے قانون کے مطابق لوگوں کو خدا کی طرف بلانے والا اور دنیا کو روشن کرنے والا سورج ۔

نبی اکرمؐ سے پہلے، حضرات انبیاء کرامؑ مختلف قوموں کی طرف آتے تھے (اس لئے کہ اس وقت

ابھی انسان کی نگاہ اتنی وسیع اور اس کا ذہن اتنا بلند نہیں ہوا تھا کہ وہ تمام نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کے تصوّر کو اپنا سکتا) ۔ لیکن آپ کا ظہور تمام عالمِ انسانیت کے لئے تھا (اور خدا کے آخری نبی کو ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا) ۔ اسی لئے قرآن نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (۳۴/۲۸) " اور ہم نے تجھے تمام نوعِ انسان کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے " اس کی تشریح دوسری جگہ ان الفاظ سے کر دی کہ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (۷/۱۵۸) " عالمِ انسانیت کو مخاطب کر کے کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں ۔ اسی سلسلۂ زرین کی ایک درخشندہ کڑی وہ آیۂ جلیلہ بھی ہے جو اس خط کے موضوع کا عنوان ہے ۔ یعنی :

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱/۱۰۷)

اور ہم نے تجھے اقوامِ عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے ۔

اسلام کا خدا ، رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱/۱) ۔ اس کا ضابطۂ قوانین (قرآن) ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۳۸/۸۸) اور اس کا رسولؐ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱/۱۰۷) اس میں رنگ ، نسل ، خون ، زبان ، وطن کی کوئی تخصیص و تمیز نہیں ۔

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ایک غیر مسلم یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ اپنے رسولؐ کے متعلق جو عقیدہ چاہیں رکھیں ۔ لیکن آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ غیر مسلم اقوامِ عالم کے لئے بھی رحمت ہیں ؟ یہ سوال غور طلب ہے اور اس خط میں اسی کا جواب میرے پیشِ نظر ہے ۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اس موضوع کی طرف آؤں ، یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ رَحْمَةٌ کے معنی کیا ہیں ؟ عام طور پر رحمت اور رحم کو مرادف المعنی سمجھا جاتا ہے اور اس اعتبار سے رحمۃ کا ترجمہ بھی رحم ہی کیا جاتا ہے ۔ یعنی (MERCY) ۔ یعنی تم قرآن کریم کے انگریزی تراجم میں اس لفظ کا ترجمہ (MERCY) ہی دیکھو گے ۔ لیکن اس سے اس لفظ (رَحْمَةٌ) کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آسکتا ۔ اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے لفظ رحم کو سامنے لاؤ جس میں جنین (بچے) کی نشو و نما ہوتی ہے ۔ لہٰذا " رَحْمَةٌ " کے معنی ہوتے ہیں سامانِ پرورش یا وہ قالب (PATTERN) ، جس کے اندر کسی کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما ہو سکے ۔ اس میں نرمی اور لطافت کا پہلو بھی شامل ہوتا ہے ۔ بنا بریں آیت زیرِ نظر کے معنی یہ ہوں گے کہ اقوامِ عالم کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما (DEVELOPMENT) اسی قالب (PATTERN) میں ہو سکتی ہے ، جسے نبی اکرمؐ نے پیش کیا ۔ اسی سے افرادِ انسانیہ کو وہ سامانِ زیست و ارتقاء مل سکتا ہے جس سے ان کی دبی ہوئی ، خوابیدہ صلاحیتیں اُبھر کر توانائی حاصل کر لیں ۔ قرآن نے رَحْمَةٌ کے اس مفہوم کو

ایک مثال کے ذریعے خود واضح کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ (۴۲/۲۸) "اور وہی ہے جو مایوسیوں کے بعد بارش برساتا ہے اور (اس طرح) اپنی رحمت کو پھیلا دیتا ہے"۔ بارش کیا کرتی ہے؟ مردہ زمین کو زندگی عطا کرتی ہے، اس کی دبی ہوئی صلاحیتوں کو نشوونما دیتی ہے۔ اسی کو قرآن رحمۃ سے تعبیر کرتا ہے۔

اس مثال میں قرآن نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت (سامان نشوونما) کو انتہائی مایوسیوں کے عالم میں بھیجتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب حضورؐ رحمۃ للعالمین کا ظہور ہوا تو دنیا کا نقشہ کیا تھا؟ کیا وہ بہار آفریں امیدوں اور مسرتوں کا گہوارہ تھی یا افسردگی خیز مایوسیوں اور نامرادیوں کا حسرت کدہ؟ اس کے متعلق مجھ سے نہیں ایک غیر مسلم مؤرخ کی زبان سے سنو (میں نے شروع میں کہا ہے کہ ایک غیر مسلم یہ سوال کر سکتا ہے کہ نبی اکرمؐ کا ظہور، غیر مسلم اقوام عالم کے لئے کس طرح آیۂ رحمت تھا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے جواب میں جو کچھ کہا جائے، غیر مسلموں کی شہادات سے کہا جائے تاکہ قرآن کے اس دعوے کی صداقت نکھر کر سامنے آجائے)۔ تہذیب کے مؤرخ ڈینی سن (DENISON) نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (EMOTION AS THE BASIS OF CIVILIZATION)۔ اس مصنف کی شہرت اور اس کی تصنیف کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ ایک طرف وہائٹ ہیڈ (WHITEHEAD) جیسا بین الاقوامی پایہ کا مفکر اپنی کتابوں میں اسے (QUOTE) کرتا ہے اور دوسری طرف علامہ اقبالؒ جیسا حکیم الامت اس کا اقتباس اپنے خطبات میں دیتا ہے۔ وہ ظہور نبویؐ کے زمانہ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے :

> اُس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصر مشید، جس کی تعمیر پر چار ہزار سال صرف ہوئے تھے، منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا اور نوع انسان پھر اُسی بربریت کی طرف لوٹ جانے والی تھی جہاں ہر قبیلہ، دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا اور آئین و ضوابط کو کوئی جانتا تک نہیں تھا۔ قدیم قبائلی آئین و مسالک اپنی قوت و احترام کھو چکے تھے، اس لئے اب ملوکیت کے پرانے طریق و انداز کا سکہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن قواعد و ضوابط کو رائج کیا تھا وہ نظم و ضبط اور وحدت و یک جہتی کے بجائے تشتت و افتراق اور بربادی و ہلاکت کا موجب بن رہے تھے۔ غرضیکہ وقت وہ آچکا تھا جبکہ ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند و بالا درخت جس کی سرسبز و شاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں، اور آرٹ، سائنس اور لٹریچر کے سنہری پھلوں سے لدی ہوئی تھیں۔ اب لڑکھڑا رہا

تھا۔ عقیدت و احترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہوچکی تھی اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہوچکا تھا۔ جنگ و جدال کے طوفان نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے جو صرف پرانی رسوم کے بندھن سے یک جا کھڑے تھے اور جن کے متعلق ہر وقت خطرہ تھا کہ اب گرے یا اب۔

کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر پیدا کیا جا سکتا تھا، جو نوع انسان کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دے اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لے؟ اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہیئے تھا، اس لئے کہ پرانی رسومات و آئین سب مردہ ہوچکے تھے اور ان ہی جیسے اور قوانین کا مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔

اس سوال کا جواب وہ خود ہی ان الفاظ میں دیتا ہے:

یہ امر موجب حیرت و استعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر عرب کی سرزمین سے پیدا ہوا اور اس وقت پیدا ہوا جب اس کی اشد ضرورت تھی۔

یہ نیا کلچر (اسلام) کس قسم کا انقلاب لایا، اس کے متعلق کارلائل اپنی مشہور تصنیف (HEROES AND HERO WORSHIP) میں لکھتا ہے:

عربوں کے لئے یہ انقلاب ایک نئی زندگی تھی جو انہیں تاریکیوں سے نور کی طرف لے آئی تھی۔ عرب اس کے ذریعے پہلی دفعہ زندہ ہوا۔ ایک ایسی قوم، جو ابتدائے آفرینش سے گمنامی کے عالم میں ریوڑ چراتی پھرتی تھی، اس کی طرف ایک رسول آیا، جو اپنے ساتھ ایک پیغام لایا، جس پر وہ قوم ایمان لے آئی۔

وہ دیکھو! وہی گمنام چرواہے، دنیا کی ممتاز ترین قوم بن گئے۔ وہ حقیر قوم ایک عظیم الشان ملت میں تبدیل ہوگئی۔ ایک صدی کے اندر اندر عرب ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی تک چھا گئے۔ اس کے بعد سینکڑوں برس ہو چلے ہیں کہ یہ اسی شان و شوکت اور درخشندگی و تابندگی سے کرۂ ارض کے ایک عظیم حصہ پر مسلط ہیں۔ یہ سب ایمان کی حرارت سے ہوا۔ ایمان بہت بڑی چیز ہے۔ ایمان سے زندگی ملتی ہے۔ جونہی کسی قوم میں ایمان پیدا ہوا اس قوم کی تاریخ، اعمال میں نتائج، اور روح میں بالیدگی پیدا کرنے والی بن گئی۔

وہ عرب — یہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم — اور صرف ایک سو سال کا عرصہ! کیا یہ انقلاب ایسا ہی نہیں، جیسے ریت کے کسی گمنام ٹیلے پر آسمان سے بجلی آگرے اور وہ ریت کا تودہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک آتشگیر مادہ میں تبدیل ہو کر اس طرح بھک سے اڑ جائے کہ دہلی سے غرناطہ تک اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آجائے۔

نوعِ انسان خشک نیستاں کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ اس بطلِ جلیل کی صورت
میں آسمان سے آیا اور تمام نوعِ انسان کو شعلہ صفت بنا گیا (کارلائل)

یہ تو اس سرزمین میں ہوا جو اس "جدید کلچر" کا اوّلین گہوارہ بنی اور اس قوم کے لئے ہوا، جس نے اس کلچر" کو سب سے پہلے محسوس پیکر (قرآنی نظام) میں متشکل کیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ "کلچر" باقی دنیا کے لئے کس طرح حیات آفرین ثابت ہوا اور اس سے نوعِ انسان کی دبی ہوئی صلاحیتوں نے کس طرح نشو و نما پائی۔

جیسا کہ میں سابقہ خط میں لکھ چکا ہوں۔ قرآن نے نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷)۔ وہ اُن تمام بوجھوں کو اتار دے گا جن کے نیچے انسانیت دبی ہوئی چلی آرہی تھی اور اُن تمام زنجیروں کو توڑ کر پھینک دے گا جن میں افراد انسانیہ جکڑے ہوئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سے بوجھ تھے جن کے نیچے انسانیت دبی ہوئی تھی اور کون سی زنجیریں تھیں جن میں ان کا بند بند جکڑا ہوا تھا۔ تفصیل اس اجمال کی طول طویل ہے، لیکن اگر اسے مختصراً دو لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ بوجھ اور زنجیریں اربابِ قوت و اقتدار کا استبداد تھا جس نے انسانیت کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ اس استبداد کی نوعیتیں مختلف تھیں لیکن قرآن نے اسے تین بڑی بڑی شقوں میں تقسیم کر کے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ استبداد کی نوعیت کچھ بھی کیوں نہ ہو، وہ اصل کے اعتبار سے ان تینوں شقوں میں سے کسی ایک سے متعلق ہوگا۔ ان شقوں کو اس نے داستانِ بنی اسرائیل میں یک جا بیان کر دیا ہے، یعنی ملوکیت کا استبداد جس کا نمائندہ فرعون تھا۔ پیشوائیت (PRIESTCRAFT) کا استبداد جس کی زنجیریں جسم کو نہیں، بلکہ انسان کے قلب و دماغ کو جکڑ دیتی ہیں، اس کا ترجمان ہامان تھا۔ اور سرمایہ پرستی کا استبداد جو شیروں کو لومڑی بنا دیتا ہے، اس کا مجسمہ قارون تھا۔ تم تاریخ انسانیت پر غور کرو ہر جگہ یہی نظر آئے گا کہ ملوکیت، پیشوائیت اور سرمایہ داری نے اپنے گٹھ جوڑ سے انسانیت کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ ملوکیت انسان کی طبیعی آزادی کو سلب کرتی ہے۔ پیشوائیت اس کی فکری صلاحیتوں کو تباہ کرتی اور سرمایہ داری اس کی اخلاقی جرأتوں کو پامال کرتی چلی آئی ہے۔ یہی تھیں وہ استبداد کی زنجیریں اور توہم پرستی کی سلیں جنہیں اس نظام نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جسے قرآنی اصولوں کی روشنی میں نبی اکرمؐ نے قائم کیا۔ یہی نظام، وہ رحمت (PATTERN) ہے جس کے اندر نوعِ انسان کی دبی ہوئی صلاحیتیں نشو و نما پاتی ہیں۔

ملوکیت کے استبداد کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ محکومی یا اطاعت، قانون کی ہوگی نہ کہ اشخاص کی۔ اور جہاں تک قانون کا تعلق ہے اُس کے غیر متبدل

اصول و حدود خود خدا کے مقرر کردہ ہیں۔ کسی انسان کو اختیار نہیں کہ وہ ان میں کسی قسم کا ردوبدل یا حک و اضافہ کر سکے۔ ان اصولوں کی روشنی میں، انسانوں کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہونگے۔ اس مشاورت میں ساری اُمّت اپنے نمائندگان کی وساطت سے شریک ہوگی۔ ان نمائندگان کے انتخاب میں معیار قلب و دماغ کی صلاحیت ہوگا نہ کہ حسب نسب یا دولت و حشمت۔

پیشوائیت کے استبداد کا خاتمہ یہ کہہ کر دیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی حاجب و دربان نہیں، کوئی وسیلہ اور واسطہ نہیں۔ اطاعت خدا کے اُس قانون کی ہوگی جو اس نے اپنے رسولؐ کی وساطت سے نوع انسان کو دیا۔ اور اطاعت ہوگی اس نظام کی وساطت سے جو اس قانون کو عملاً نافذ کرنے کے لئے وجود میں آئے۔ اس قانون و نظام کی طرف دعوت علیٰ وجہ البصیرت دی جائے گی اور کسی سے کوئی عقیدہ یا نظریہ زبردستی نہیں منوایا جائے گا۔

اُس نے صرف پیشوائیت ہی کو ختم نہیں کیا بلکہ خود سلسلۂ نبوّت کو بھی یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ نوع انسان کی راہنمائی کیلئے جس قدر اصولی تعلیم کی ضرورت تھی اسے مکمّل شکل میں دے کر قرآن کی دفتین میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اب انسان، ان اصولوں کی روشنی میں، زندگی کے بدلنے والے تقاضوں کا حل اپنے علم و بصیرت کی رو سے خود تلاش کرے۔ اب یہ بچّہ جوان ہو گیا ہے۔ اب اسے کسی اُنگلی پکڑ کر چلانے والے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کے سامنے قرآن کے اصول اور ان کی عملی شکل اس نظام کا نقشہ ہے جسے محمد رسول اللہ والذین معہ نے قائم کیا تھا۔ اس کے بعد اسے کسی "آنے والے" کے انتظار کی ضرورت نہیں۔ جسے آنا تھا وہ آخری بار ساری دنیا کے لئے بشیر و نذیر بن کر آگیا۔

علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

> اس نقطۂ خیال سے دیکھئے تو پیغمبر اسلام دنیائے قدیم و جدید کے درمیان بطور حد فاصل کھڑے دکھائی دینگے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ آپؐ کی وحی کا سرچشمہ کیا ہے تو آپ دنیائے قدیم سے متعلق نظر آئیں گے۔ لیکن اگر اس حقیقت پر نظر کی جائے کہ آپؐ کی وحی کی روح کیا ہے تو آپؐ کی ذات گرامی دنیائے جدید سے متعلق نظر آئیگی۔ آپؐ کی بدولت زندگی نے علم کے ان سرچشموں کا سراغ پایا جن کی اسے اپنی نئی شاہراہوں کے لئے ضرورت تھی۔ اسلام کا ظہور استقرائی علم کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوّت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اُس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ کے لئے عہد طفولیت میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اسلام نے دینی پیشوائی اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن کریم غور و فکر

اور تجارب و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ اور فطرت دونوں کو علم انسانی کے ذرائع ٹھہراتا ہے ۔ یہ سب اسی مقصد کے مختلف گوشے ہیں جو ختم نبوّت کی تہ میں پوشیدہ ہیں ۔ (خطبات)

جہاں تک توہم پرستیوں کا تعلق تھا اس نے ان کا خاتمہ یہ کہہ کر کر دیا کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے انسان کے لئے تابع تسخیر کر دیا گیا ہے ۔ "یہ وہ ملائکہ ہیں جو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں "۔ لہٰذا انسان کا مظاہر فطرت میں سے کسی کے سامنے جھکنا یا کسی سے ڈرنا تذلیل آدمیت اور تحقیر شرف انسانیت ہے ۔ انسان کو فوا ئین الٰہیہ کے آستانہٗ عالیہ پر جھک کر دنیا کی چوکھٹ سے بے نیاز سرفرازانہ انداز سے آگے بڑھ جانا چاہیئے ۔

اس نے غلامی کا یہ کہہ کر خاتمہ کر دیا کہ خدا نے ہر انسان کو محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم بنایا ہے اس لئے کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا غلام بنائے ۔ باقی رہے مدارج ، سو ان کا معیار سیرت و کردار کی بلندی اور فرائض شناسی و حسن کارکردگی ہے اور یہ میدان تمام افراد انسانیہ کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے ۔

ہست ایں میکدہ و دعوت عام است ایں جا
قسمت بادہ باندازۂ جام است ایں جا

اس نے انسان اور انسان میں غلط معیاروں کے مطابق تفریق و تقسیم کو کسی خاص معاشرہ ، خاص قوم ، خاص خطۂ زمین ہی میں نہیں مٹایا ۔ اس نے اعلان کر دیا کہ تمام اقوام عالم اصل کے اعتبار سے ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی برادری کے اجزاء ہیں ۔ لہٰذا رنگ ، نسل ، خون ، زبان ، وطن کے خود ساختہ معیاروں کے مطابق نوع انسان کو قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کر دینا اور پھر ایک قوم کا دوسری قوم کے مقابلہ میں محاذ قائم کر لینا اور یوں اس جنت ارضی کو درندوں کا بھٹ بنا لینا ، انسانیت نہیں سبعیت و بہیمیت ہے ۔ انسانوں میں تفریق و تقسیم کا معیار صرف ایک ہے ۔ اور وہ یہ کہ جو لوگ انسانیت کے بلند نصب العین حیات پر یقین رکھیں وہ ایک برادری کے فرد اور جو اس کے برعکس ذاتی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگ کر اس عالمگیر برادری کے تصوّر کی مخالفت کریں ، وہ دوسری قوم کے افراد ۔ بالفاظ دیگر قومیت کا معیار ، آئیڈیالوجی کا اشتراک ہے نہ کہ نسل اور وطن کا اشتراک ۔ سرمایہ پرستی کے قارونی استبداد کو اس نے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ ذرائع رزق اور وسائل پیداوار (ارضی) کو تمام نوع انسان کی پرورش کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے ۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ انہیں ذاتی ملکیت سمجھ کر ان پر سانپ بن کر بیٹھ جائے ۔ جہاں تک دولت کا تعلق ہے ، ضرورت سے زائد دولت کسی شخص کے پاس نہیں رہنی چاہیئے ۔ تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرے (نظام) پر ہونی چاہیئے ۔ جو معاشرہ اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا اسے

حق نہیں کہ وہ زمام کار اپنے ہاتھ میں رکھے۔ انسانی آزادی کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ کوئی فرد اپنی کسی ضرورت کے لئے، کسی دوسرے فرد کا محتاج نہ ہو۔

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبیں این است وبس

یہ تھیں انسانی استبداد کی وہ زنجیریں جنہیں ایک ایک کر کے توڑا گیا۔ لیکن اس استبداد کا ایک گوشہ ایسا ہے جو ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آیا۔ دنیا میں مردوں نے ایک ایسا افسانہ تراشا "کہ آدم کو جنت سے نکلوانے کا باعث اس کی بیوی تھی"، اور اس کے بعد یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ تمام فتنے اور فساد کی جڑ عورت ہے اس لئے اس پر جس قدر سختی کی جائے، کم ہے۔ تم تاریخ انسانیت پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ ظہور نبویؐ سے پہلے دنیا میں عورت کی حالت کیا تھی؟ اس حالت پر غور کرو اور پھر اس اعلان عظیم کو دیکھو کہ پیدائش کے اعتبار سے مرد اور عورت کی حیثیت یکساں ہے اور فطری فرائض کے اعتبار سے اگر مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے تو ویسی ہی فضیلت عورت کو مرد پر بھی حاصل ہے۔ فتنہ و فساد کا سرچشمہ نہ عورت ہے نہ مرد۔ دونوں میں لغزش کا امکان و استقامت کی صلاحیت موجود ہے۔

یہ ہیں عزیزم! وہ چند اہم اصول جن کی بنیادوں پر نبی اکرمؐ نے ایک ایسا معاشرہ استوار کیا جس نے ہر نظام کہن کی بساط اُلٹ کر، استبداد کی ہر اُس زنجیر کو توڑ دیا جو انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما کے راستے میں آہنی دیوار بن کر حائل تھی۔ قرآن نے اس تمام داستان کو چند الفاظ میں اس حسن و خوبی سے سمٹا کر رکھ دیا ہے کہ جب نگۂ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو روح وجد میں آجاتی ہے۔ تم ان آیات کو سامنے لاؤ جن میں نبی اکرمؐ کو رحمت للعالمین کہہ کر پکارا گیا ہے اور پھر دیکھو کہ قرآن نے اس حقیقت کبریٰ کی کس حسین و جمیل انداز سے نقاب کشائی کی ہے۔ قبل اس کے کہ ان آیات کو سامنے لایا جائے تم ایک مرتبہ پھر اس داستان کہن کو دھرا لو کہ حضورؐ کے ظہور قدسی سے پہلے دنیا کا نظام کیا تھا؟ نظام یہ تھا کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"۔ جس نے کسی طرح قوت حاصل کر لی، اقتدار کی مسندوں پر قابض ہو گیا۔ اور پھر یہ قبضہ و اختیار، یہ سطوت و اقتدار، اس کی اولاد میں وراثتاً منتقل ہوتا چلا آیا۔ اس میں نہ استعداد و قابلیت کا کوئی سوال تھا نہ صلاحیت کی کوئی شرط۔ اس پس منظر میں دیکھو کہ وہ نظام جسے اس رحمت للعالمینؐ کے مقدس ہاتھوں نے متشکل فرمایا، اس کا اصل الاصول کیا تھا؟ فرمایا وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۔ "ہم نے ہر آسمانی کتاب میں، اخلاقی اقدار و ضوابط بیان کر دینے کے بعد لکھ دیا تھا (اور اب اُس بنیادی حقیقت کو قرآن میں دھراتے ہیں) کہ زمین کا نظم و نسق صرف ان لوگوں کے ہاتھ میں رہنا

چاہیئے جن میں اس کی صلاحیت ہو" (صلاحیت میں قلب و دماغ دونوں کی صلاحیت آجاتی ہے)۔ تم غور کرو سلیم! کہ قرآن نے اس مختصر سے ٹکڑے میں کتنے بڑے انقلاب کا اعلان کیا ہے جس سے نظم و نسق اور اقتدار و اختیار کے تمام سابق معیار الٹ کر اُن کی جگہ صرف صلاحیت نے لے لی۔ اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ اس انقلاب آفریں اصول میں، اس قوم کے لیئے جو قوانین الٰہیہ کی محکومی اختیار کرے، ایک بڑی دور رس حقیقت پوشیدہ ہے۔ اس کے بعد ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (۲۱/۱۰۵-۱۰۷)

"یوں اے رسول! تمہاری بعثت تمام اقوام عالم کے لیئے وہ قالب، وہ ذریعہ، وہ (PATTERN) بن جاتی ہے جس کے اندر رہتے ہوئے افراد انسانیہ کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکتی ہے۔"

تم نے سلیم! حضور رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ کی بعثت سے پہلے کی ہزاروں سال کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کے بعد تم اُس ظہور قدسیؐ کے بعد کی چودہ سو سال کی تاریخ پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ زندگی کے وہ اصول جنہیں قرآن نے عطا کیا اور جن کی روشنی میں نبی اکرمؐ نے ایک نظام جدید کی بنیاد ڈالی، کس طرح وہ قالب بن گئے جن کے اندر نوع انسان کی دبی ہوئی صلاحیتوں نے انگڑائی لے کر آنکھ کھولی۔ اور پھر یہ سبزۂ نورستہ دیکھتے ہی دیکھتے شادابیوں اور شگفتگیوں کا لالہ زار بن گیا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ورنہ میں مغرب کے غیر مسلم مفکرین، مصنفین اور مؤرخین کے سینکڑوں آراء و اقوال پیش کرتا جن میں انہوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ حضور رحمت للعالمین کا ظہور نہ ہوتا تو اس خاکدان کی رنگینیاں اور رعنائیاں کبھی اس ہجوم و وفور سے تبسم ریز و کیف بار نہ ہوتیں۔ اس وقت میں صرف (BRIFFAULT) کی شہرۂ آفاق کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) کا ایک اقتباس درج کرتا ہوں۔ تم دیکھو کہ یہ نامور مؤرخ اس حقیقت کا اعتراف کن الفاظ میں کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> یورپ کی نشاۃ ثانیہ پندرھویں صدی میں نہیں ہوئی بلکہ اُس وقت ہوئی جب یورپ عربوں کے کلچر سے متاثر ہوا۔ یورپ کی خلقت جدید کا گہوارہ اٹلی نہیں بلکہ اندلس ہے۔ ادھر روما کی تہذیب گرتے گرتے بربریت کی حد تک پہنچ چکی تھی اور اُدھر دنیائے اسلام، تہذیب و ذہنی تحریکات کا مرکز بن رہی تھی۔ انہی شہروں میں وہ نئی زندگی نمودار ہوئی جسے انسانی ارتقاء میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنا تھا۔ جس وقت یہ نئی تہذیب محسوس طور پر سامنے آئی، دنیا حیات نو سے آشنا ہوئی۔ اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی تہذیب کا وجود ہی عمل میں نہ آتا۔ ان کے بغیر یہ یقیناً اس خصوصیت کو حاصل نہ کر سکتا تھا جس نے اسے ارتقائی مراحل میں بلند ترین سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ ویسے

تو مغربی کلچر میں کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں جس میں عربی ثقافت کا رنگ نہ جھلکتا ہو۔ لیکن ایک شعبہ ایسا ہے جس میں یہ اثر بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اور یہی وہ شعبہ ہے جو درحقیقت عصر حاضر کی حقیقی قوت کا باعث اور اس کی فتوحات کا ذریعہ ہے۔ یعنی علم الاشیاء، سائنس کی روح۔ ہماری سائنس صرف اسی حد تک عربوں کی رہین منت نہیں کہ انہوں نے ہمیں عجیب و غریب نظریات و انکشافات سے روشناس کرایا۔ نہیں! بلکہ ہماری سائنس کا وجود ہی ان کا شرمندۂ احسان ہے۔ اسلام سے پہلے دنیا کا زمانہ درحقیقت زمانۂ قبل از سائنس (PRE - SCIENTIFIC) تھا۔ پندرھویں صدی تک یورپ انہی علوم و فنون کو اپناتا رہا جو اسے مسلمانوں نے دئے تھے۔ اس پر کوئی اضافہ نہ کرسکا۔ جب اندلس میں تہذیب و ثقافت نے پھر تاریکیوں کی چادر اوڑھ لی، تو یورپ میں وہ جن نمودار ہوا جسے اندلس کی سرزمین نے پیدا کیا تھا۔ یورپ کو زندگی صرف سائنس نے دی۔ اسلام کے گوناگوں اثرات اس کی حرارت کا موجب بنے۔

سلیم! حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں انسانی صلاحیتوں کی نمود نظر آتی ہے یہ صدقہ ہے اس "رحمت" کا جسے تمام اقوام عالم کے لئے عام کر دیا گیا تھا۔ دنیا قرآنی اصولوں اور اس کی روشنی میں متشکل کردہ قرآنی نظام کے کئی ایک گوشوں کو اپنا چکی ہے۔ بعض گوشوں کو اپنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور باقی گوشے ایسے ہیں جنہیں یہ مستقبل میں جا کر اپنائے گی، اس لئے کہ ان کے بغیر نہ انسانی صلاحیتیں اپنی نشوو ارتقا کی آخری حد تک پہنچ سکتی ہیں، نہ حسنِ کائنات میں نکھار پیدا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بزم ہستی میں جہاں کوئی روشنی کی کرن نظر آتی ہے وہ اسی آفتاب عالمتاب کی ضیا باریوں کے تصدق ہے، اور گلشن عالم میں جہاں کوئی پھول مہکتا دکھائی دیتا ہے وہ اسی جان بہار کی نکہت باریوں کا رہین منت ہے۔

ہر کجا بینی جہان رنگ و بُو　　آنکہ از خاکش بروید آرزُو
یا ز نور مصطفیٰؐ او را بہاست　　یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰؐ است

میں نے جو کچھ ابھی ابھی کہا ہے وہ محض اظہار عقیدت نہیں۔ وہ ایک واقعہ ہے جو ہر اس آنکھ کے سامنے بے نقاب ہو کر آسکتا ہے جس پر تعصب کی پٹی نہ بندھی ہو۔ آخر میں میں (LAMARTINE) کی مشہور تصنیف (HISTORE DE LA TURQUE) کا ایک اقتباس دینا چاہتا ہوں۔ اقتباس طویل ضرور ہے۔ لیکن حضورؐ رحمت للعالمین کی شانِ اقدس میں، ایک غیر مسلم کی زبان سے اس سے بہتر "نعت" کم از کم میری نظر سے نہیں گزری۔ تم اسے غور سے دیکھو اور اس شہادت میں میرے ہمنوا ہو جاؤ۔ وہ لکھتا ہے:

دنیا میں کسی انسان نے برضا و رغبت یا طوعاً او کرہاً، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نصب العین سے بلند نصب العین اپنے سامنے کبھی نہیں رکھا۔ یہ نصب العین عام انسانی سطح سے بہت بلند تھا، مافوق البشر نصب العین۔ یہ نصب العین کیا تھا؟ خدا اور بندے کے درمیان جو توہمات کے پردے حائل ہو چکے تھے انہیں ایک ایک کر کے اٹھا دینا اور اس طرح خدا کو انسان کے سینے میں سمو دینا اور انسان کو خدائی صفات کے رنگ میں رنگ دینا، اور باطل خداؤں کے ہجوم میں ایک منزہ خدا کا مقدس اور معقول تصور پیش کرنا۔ آجتک کبھی کسی انسان نے اس کی ہمت نہیں کی کہ اس قسم کے عظیم الشان کام کا بیڑہ اٹھائے جو اس طرح انسانی مقدرت سے باہر ہو اور اس کے ذرائع اس قدر مسدود ہوں۔ اس لئے کہ نہ اس وقت جب اس نے اس اہم فریضہ کا تصور کیا تھا اور نہ اس وقت جب اس کی عملی تشکیل کے لئے قدم اٹھایا تھا، اس کے پاس اپنی ذات یا صحرا کے ایک گوشے میں بسنے والے مٹھی بھر انسانوں سے زیادہ کوئی ساز و سامان اور ذریعہ اور وسیلہ تھا۔ اس فقدان ذرائع کے ساتھ آجتک کبھی کسی انسان نے دنیا میں اس قسم کا عظیم اور مستقل انقلاب پیدا نہیں کیا۔ وہ انقلاب جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دو سو سال کے اندر اندر، اسلام عملاً اور اعتقاداً تمام عرب پر حکمرانی کر رہا تھا اور اس نے خدا کے نام پر، ایران، خراسان، مغربی ہندوستان، شام، مصر، حبش، شمالی افریقہ کا تمام وہ علاقہ جو اس وقت دریافت ہو سکا تھا، اور بحر روم کے متعدد جزائر اور ہسپانیہ تک کو فتح کر لیا تھا۔

اگر نصب العین کی بلندی، وسائل کی کمی اور نتائج کی درخشندگی، انسانی نبوغ (HUMAN GENIUS) کا معیار ہیں تو وہ کون ہے جو اس باب میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں کسی اور انسان کو پیش کرنے کی جرأت کر سکے۔ دنیا کے اور بڑے بڑے انسانوں نے صرف اسلحہ، قانون یا سلطنتیں پیدا کیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ مادی قوتوں کی تخلیق کر سکے جو اکثر اوقات خود ان کی آنکھوں کے سامنے راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔ لیکن اس انسان نے صرف جیوش و عساکر، مجالس قانون ساز، وسیع سلطنتوں، قوموں اور خاندانوں کو ہی حرکت نہیں دی بلکہ ان کروڑوں انسانوں (کے قلوب) کو بھی جو اس زمانہ کی آباد دنیا کے ایک تہائی حصہ میں بستے تھے۔ اور ان سے بھی کہیں زیادہ اس شخصیت نے قربان گاہوں، دیوتاؤں، مذاہب و مناسک، تصورات و معتقدات، بلکہ روحوں تک کو ہلا دیا۔ اس نے ایک ایسی کتاب کی اساس پر جس کا ایک ایک لفظ قانون کی حیثیت رکھتا ہے، ایک ایسی قومیت کی بنیاد رکھی جس نے دنیا کی مختلف نسلوں اور زبانوں کے امتزاج سے ایک امت واحدہ پیدا کر دی یہ لافانی امت اور باطل کے خداؤں سے سرکشی و تنفر، اور ایک خدائے واحد کے لئے والہانہ جذب و عشق،

یہ ہیں دنیا میں اُس عظیم ہستی کی یادگاریں۔ افسانوی خداؤں کے ہجوم میں، ایک خدا کے تصوّر کا اعلان، بجائے خویش ایک ایسا معجزہ تھا کہ جونہی یہ الفاظ اس منّاد کی زبان سے نکلے، اس نے تمام باطل خداؤں کی عبادت گاہوں کو تہ کر دیا۔ اور ایک تہائی دنیا میں آگ لگا دی۔ اُس کی زندگی، اُس کے مراقبات، توہم پرستی کے خلاف اس کی مجاہدانہ سعی و کاوش اور باطل خداؤں کے غیظ و غضب کو استحقار کی ہنسی سے ٹھکرا دینے کی عظیم جرأت، مکّی زندگی میں متواتر تیرہ برس تک تمام مصائب و نوائب کے مقابلہ میں استقامت و استقلال، مخالفین کی تکذیب و تضحیک کا خندہ پیشانی سے استقبال، یہ تمام مشکلات اور بحران کے بعد اُس کی ہجرت، اُس کی مسلسل دعوت و تبلیغ، اُس کا غیر منقطع جہاد، اپنے مقصد کی کامیابی پر یقین محکم اور نامساعدت حالات میں اُس کی مافوق البشر جمیعت خاطر، فتح و کامرانی میں تحمّل و عفو، سلطنت سازی کی خاطر نہیں، بلکہ اپنے الوہیاتی مقصد کی کامیابی کیلئے اُس کی اُمنگیں اور آرزوئیں۔ وجد و کیف کی دُنیا میں اُس کی متواتر نمازیں اور دعائیں، اپنے اللہ سے راز و نیاز کی باتیں۔ اُس کی حیات، اُس کی ممات، اور بعد از موت اُس کی مقبولیت۔ یہ تمام حقائق کس قسم کی زندگی کی شہادت دیتے ہیں؟ کیا ایک مکذب و مفتری کی زندگی کی یا ایسے انسان کی زندگی کی جسے اپنے دعوے کی حقانیت پر غیر متزلزل ایمان ہو! اُس کا یہی کوہ شکن ایمان تھا جس نے اس میں ایسی لرزہ انگیز اور بے پناہ قوّت پیدا کر دی تھی کہ اُس نے اپنے عقیدہ کو زندہ اور پایندہ بنا کر دکھا دیا۔ یہ عقیدہ کیا تھا؟ خدا کی توحید اور تنزیہہ۔ اوّل الذکر، یہ بتانے کے لئے کہ خدا کیا ہے اور ثانی الذکر، اس کی وضاحت کے لئے کہ خدا کیا نہیں؟ وہ الّا اور یہ لا۔ ایک حصّہ، دنیا سے باطل خداؤں کو مٹانے کے لئے (خواہ اس میں تلوار کی بھی ضرورت کیوں نہ پڑے) اور دوسرا حصّہ خدائے حقیقی کی مسند اجلال بچھانے کے لئے۔

بہت بڑا مفکر، بلند پایہ خطیب، پیغامبر، مقنّن سپہ سالار، تصوّرات و معتقدات کا فاتح۔ صحیح نظریۂ حیات کو علی وجہ البصیرت قائم کرنے کا ذمہ دار۔ اُس نظام کا بانی جس میں باطل خداؤ ہمتوں تک کی دنیا میں دخل نہ پا سکیں۔ دنیاوی سلطنتوں اور اُن کے اُوپر ایک آسمانی بادشاہت کا بانی۔ یہ ہے محمّدؐ۔

اُن تمام معیاروں اور پیمانوں کو اپنے ساتھ لے آؤ جن سے انسانی عظمت و بلندی کو ناپا اور پرکھا جاتا ہے اور اس کے بعد اس سوال کا جواب دو کہ

کیا دنیا میں اس سے بڑا انسان بھی کوئی ہوا ہے؟

تم نے دیکھا ہے سلیم! کہ ایک حقیقت شناس "غیر مسلم" کی نگاہیں کہاں تک پہنچی ہیں اور اس نے اس رحمت للعالمین

کی جھلک کہاں کہاں اور کس کس انداز سے دیکھی ہے؟

اس مقام پر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو گا کہ اس "رحمت" سے دیگر اقوام عالم کی صلاحیتیں تو بیدار ہو گئیں لیکن مسلمانوں کی صلاحیتیں یکسر پژمردہ اور مفلوج ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ خود قرآن نے بیان کر دی ہے، جہاں کہا ہے کہ حضورؐ رحمت تو ضرور ہیں لیکن صرف ان کے لئے جو ایمان لائیں۔ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ (۹/۶۱)۔ اب تم کہو گے کہ مسلمان، قرآن اور صاحبِ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ غور طلب ہے۔ مسلمان، قرآن اور نبی اکرمؐ کے اسم گرامی کے ساتھ اپنی نسبت ضرور رکھتے ہیں لیکن نسبت رکھنے اور ایمان رکھنے میں بڑا فرق ہے۔ ایمان رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کے اصولوں کو زندگی کا نصب العین بنایا جائے اور اس ضابطۂ حیات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے۔ اس کی وضاحت قرآن نے اس مقام پر کر دی ہے جہاں حضورؐ کو رحمت للعالمین کہا ہے۔ فرمایا: قُلْ اِنَّمَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲۱/۱۰۸) ان سے کہہ دو کہ میری طرف یہ وحی ہوئی ہے کہ تمہارا الہٰ، جس کے قوانین کی اطاعت اختیار کرنی چاہیئے۔ صرف ایک (خدائے واحد) ہے۔ اب بتاؤ کہ کیا تم اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہو"؟ سوال یہ ہے کہ ہمارا سر قرآن کے سامنے خم ہے، یا اس سے سرکشی برتتے ہوئے، اپنے خود ساختہ قوانین و ضوابط کے سامنے؟ غیر مسلم تو قرآن کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ:

> اس کی تعلیم کسی مقام پر بھی ناکام ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے تمام نظام ہائے تمدن کے باوجود اس کی حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔
>
> (گوئٹے کا خط ایکرمن کے نام)

لیکن ہم نے اس قرآن کو غلافوں میں لپیٹ کر رکھ چھوڑا ہے اور اپنی راہ نمائی کے لئے دوسرے دروازوں پر جبہ سائی کرتے ہیں۔ کیا ایمان اسی کو کہتے ہیں؟ لہذا، اگر ہماری صلاحیتیں نشو و نما نہیں پاتیں تو اس میں قصور کس کا ہے؟ سورج اسی کو روشنی دے سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھول کر رکھے۔ بارش اسی زمین کے لئے نفع بخش ثابت ہو سکتی ہے جو اس کے قطروں کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے اپنی آغوش وا کر دے۔ ہم نے اس سحاب کرم کی طرف سے اپنے لب بند کر کے، دنیا کے ہر چشمۂ تہذیب و تمدن کو آزما کر دیکھ لیا۔ کیا کہیں سے آبِ حیات کی ایک بوند بھی ہمارے لئے وجہ سیرابی ہوئی؟ کیا اس کے بعد بھی وقت نہیں آیا کہ ہم پھر اسی ابر نیساں کی طرف رجوع کریں جس کی گہرافشانیوں نے ایک بار ہماری زمین مردہ کو اس طرح زندگی اور شادابی عطا کی تھی کہ اس سے ساری دنیا پہ بہار آ گئی تھی۔ یاد رکھو سلیم!

جیسا کہ میں معراج انسانیت میں لکھ چکا ہوں:

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرف انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دئے گئے۔ اب اس کے بعد انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعل راہ کی ضرورت اور کسی ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراط مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے نقوش قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر جبیر و بصیر پکار اٹھتا ہے کہ

مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہ مصطفیؐ رو

ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس قرآنی نظام کے سوا جسے حضور رحمت للعالمینؐ نے ساری دنیا کے لئے وجہ شادابی قلب و نگاہ بنایا تھا، انسان کے لئے نجات و سعادت کی کوئی راہ نہیں۔ یہی وہ مساعد فضا ہے جس میں ہر تخم صالح بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے۔ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء۔ اگر صحن عالم اس کی نسیم سحری سے محروم ہو جائے تو اس کی تمام سرسبزیاں اور شادابیاں جھلس کر رہ جائیں۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسّم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

والسلام

پرویز

اکتوبر ۱۹۵۸ء

تیئیسواں خط

درُود کا مفہوم

اس میں بھائی! بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں کہ میں نے طاہرہ کے خط کا جواب پہلے دیا اور تمہارے خط کا جواب بعد میں دے رہا ہوں۔ بات صاف ہے اور اس میں مجھے کسی اخفاء کی ضرورت نہیں کہ جب بھی بیٹی اور بیٹے میں موازنہ ہوگا تو میری میزان میں بیٹی کا پلڑا ہمیشہ جھکے گا۔ اسے تم "جذبات" کہہ کر اپنے دل کو تسکین دے لو تو اور بات ہے۔ ورنہ میرے نزدیک تو یہ زندگی کی اٹل حقیقت ہے کہ ؏

از امومت پختہ تر تعمیرِ ما　　　درخطِ سیمائے او تقدیرِ ما

جو بات تم نے پوچھی ہے اس تک پہنچنے سے پہلے اگر تم قرآن کی دو آیتوں کو سامنے لے آؤ تو مسئلہ بہت آسان ہو جائے گا۔ سورۂ ابراہیم کی پہلی آیت یہ ہے کہ کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (۱۴/۱) یہ قرآن ہم نے تیری طرف اس لئے نازل کیا ہے کہ اس کے ذریعے تو نوعِ انسان کو ظلمت (تاریکیوں) سے نکال کر نور (روشنی) کی طرف لے آئے (اور) ان کے نشو و نما دینے والے کے قانون کے مطابق انہیں زندگی کے اس توازن بدوش راستے پر ڈال دے جو جلال و جمال، غلبہ و قوت، اور حسن و تزئین سب کچھ عطا کر دیتا ہے، کیونکہ وہ اس خدا کی طرف لے جانے والا راستہ ہے جو ان تمام صفات کا مالک ہے اس آیۂ جلیلہ میں قرآن کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے ذریعے نوعِ انسان ظلمت سے نور کی طرف آسکتی ہے۔

اس میں لفظ ظلمات (تاریکیاں) جمع کے صیغے میں آیا ہے، جس سے مراد ہر قسم کی تاریکیاں ہیں۔ عقائد و تصورات کی تاریکیاں رسوم و مناسک کی تاریکیاں۔ تمدن و معاشرت کی تاریکیاں۔ سیاست و معیشت کی تاریکیاں۔ غرضیکہ زندگی کے ہر گوشے کی تاریکی سے روشنی کی طرف لے آنے والی کتاب۔ ان تاریکیوں کی تفصیل قرآن کے مختلف مقامات میں دی گئی ہے۔ لیکن

خود اسی سورہ میں تین ہی آیات کے بعد، ایک ایسا ٹکڑا آتا ہے جس نے ساری بات کو واضح کر کے رکھ دیا اور نکھار کر سمجھا دیا ہے کہ ظلمات کسے کہتے ہیں اور نور کیا ہوتا ہے۔ فرمایا وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴/۵) - ہم نے موسیٰ کو اپنے احکام و قوانین دے کر بھیجا اور اس سے کہا کہ وہ اُن کے ذریعہ اپنی قوم کو ظلمات سے نور کی طرف لے جائے۔ قرآن کی اس آیت نے خود بتا دیا کہ قوموں کی زندگی میں ظلمات کسے کہتے ہیں اور وہ نور کی وادی میں کسطرح داخل ہوتی ہیں - فرعون کی محکومیت میں قوم بنی اسرائیل جس قسم کی زندگی بسر کر رہی تھی اسے ظلمات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں کہ اس دور میں بنی اسرائیل کی حالت کیا تھی۔ تورات اور قرآن دونوں میں اس داستان الم انگیز کی تفاصیل ملتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ ضابطۂ خداوندی کے مطابق اس قوم کو فرعون کی محکومیت سے نکال کر سینا کی اُن وادیوں میں لے آئے جہاں ان کے اور اُن کے خدا کے درمیان کوئی دوسری قوت حائل نہ تھی اور جہاں انہیں اس امر کی پوری پوری آزادی حاصل تھی کہ وہ اپنے خدا کے قوانین کے ماتحت زندگی بسر کریں۔ اس کو قرآن نے نور سے تعبیر کیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ ایک قوم (بنی اسرائیل) کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے آئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کے متعلق کہا ہے کہ ان کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ وہ قرآن کے ذریعے پوری کی پوری نوع انسان کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے آئیں گے۔ یعنی جو قومیں قرآن کا اتباع کریں گی وہ دنیا میں ہر قسم کی غلامی سے نجات حاصل کر کے ایسی آزادی کی نورانی منزل میں پہنچ جائیں گی جہاں ان پر صرف خدا کے قوانین کی حکومت ہوگی۔ ظاہر ہے کہ قرآن کے اس دعویٰ کا عملی تجربہ نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں سے ہوا۔ آپ نے اپنی قوم کی تربیت قرآن کی روشنی میں کی اور ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ قوم کسطرح ظلمات سے نکل کر نور کی طرف آگئی۔ یہ کچھ کیسے ہوا تھا؟ قرآن اور تاریخ میں اس کی تفاصیل موجود ہیں۔ ان کا ماحصل یہی ہے کہ محمد رسول اللہؐ والذینؓ معہ نے اپنے یقین محکم اور عمل پیہم سے باطل کی ہر قوت کا مقابلہ کیا۔ اور اسے شکست دے کر فاتح و منصور آگے بڑھتے چلے گئے تاآنکہ عہد جاہلیت کی تمام انسان سوز تاریکیاں ایک ایک کر کے چھٹ گئیں اور "زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھی"۔ اس جہاد مسلسل میں قوانین خداوندی کی تائید و نصرت اس جماعت کے ساتھ تھی۔ یعنی جب ان کا ہر قدم اُس قانون کے مطابق اُٹھتا تھا تو اُس قانون کے اتباع سے جس قدر درخشندہ نتائج مرتب ہونے تھے وہ سب مرتب ہوتے چلے جاتے تھے۔ قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ جو قوم قوانین خداوندی کے مطابق چلتی ہے کائناتی قوتیں (جنہیں قرآن ملائکہ کہہ کر پکارتا ہے) بھی اس کا ساتھ دیتی ہیں۔ کائناتی قوتوں میں کچھ تو وہ ہیں جو طبعی دنیا سے متعلق ہیں اور جن کی تسخیر سے انسان، حدود فراموش قوتیں حاصل کرتا چلا جاتا

ہے۔ کچھ قوتیں اس کی تفسیاتی دنیا سے متعلق ہیں۔ قانون خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے یہ قوتیں بھی انسان کا ساتھ دیتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا سینہ تضادات (CONTRADICTIONS) کی رزمگاہ بننے کے بجائے سکون و طمانیت کی جنت بن جاتا ہے۔ تم تو سلیم! علم النفس (PSYCHOLOGY) کے طالب علم ہو۔ اس لئے تم اس حقیقت کو خوب سمجھ سکتے ہو کہ جس انسان کے دل میں تضادات کی کشمکش جاری ہو وہ ہمیشہ وقفِ اضطراب رہتا ہے۔ اور اس کی توانائیاں اسی کشمکش کی نذر ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جو شخص ان تضادات میں توافق پیدا کر لے، اس کی تمام توانائیاں اس کے پیش نظر مقصد کے حصول میں صرف ہوتی ہیں۔ اسے قرآن ملائکہ کی تائید کہتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ۔ جن لوگوں نے اس حقیقت کا اقرار کر لیا کہ ہماری نشوونما کا مالک اللہ ہے یعنی یہ اسی کے قانون ربوبیت کے مطابق مل سکتی ہے۔ اور پھر اس ایمان پر جم کر بیٹھ گئے اس طرح کہ کوئی چیز ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ پیدا کر سکے۔ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ان پر ملائکہ کا "نزول" ہوتا ہے۔ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا جو ان سے آکر کہتے ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کرو۔ نہ افسردہ خاطر ہو۔ یعنی ملائکہ کے نزول کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل سے خوف و حزن جاتا رہتا ہے۔ اور صرف اتنا ہی نہیں (کیونکہ خوف و حزن کا جاتے رہنا تو محض منفی نتیجہ (NEGATIVE RESULT ہے)۔ بلکہ مثبت (POSITIVE) کامرانیاں اپنی انتہائی درخشندگی و تابناکی سے ان کے سامنے آجاتی ہیں۔ وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۴۱/۳۰)۔ اور اُن سے کہتے ہیں کہ تم اس جنت کی خوشخبری لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (۴۱/۳۱)۔ ہم دنیاوی زندگی میں بھی تمہارے رفیق و دمساز ہیں اور مستقبل کی زندگی میں بھی۔ یہی تھی ملائکہ کی وہ تائید جو جماعت مومنین کو بدر کے میدان میں حاصل ہوئی تھی اور جس کے متعلق سورۂ انفال میں ہے اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ (۸/۱۲)۔ جب تیرے نشوونما دینے والے نے ملائکہ کو حکم دیا کہ تم جماعت مومنین کو ثابت قدم رکھو، اُن کے پائے استقامت میں لغزش نہ آنے پائے۔ اس میں مَیں خود بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ میں اُن کے مخالفین کے دل میں اُن کا رعب طاری کر دوں گا۔

یہ ہے سلیم! خدا اور ملائکہ کی تائید و نصرت جو جماعت مومنین کو حاصل ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے جہادِ مسلسل سے "ظلمات سے نور" کی طرف آجائیں۔ اسی کو سورۂ احزاب کی اس آیت میں (جس کا مطلب تم نے دریافت کیا ہے) ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا (۳۳/۴۳)۔ اے جماعت مومنین! خدا اور اس کے ملائکہ تم پر تحسین و آفرین کے پھول برساتے ہیں۔ ان کی تائید و نصرت تمہارے

ساتھ ہے۔ تاکہ وہ تمہیں ظلمات سے نور کی طرف لے جائے۔ مومنین پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ وہ ان کی پوری پوری نشوونما کرتا ہے۔ اور ان کی کوششوں کو بھرپور نتائج سے نوازتا ہے۔ یہ کچھ کس طرح ہوتا ہے؟ اس کا جواب اس سے پہلی دو آیات میں ہے جہاں کہا کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا ۙ وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا ۝ (۳۳/۴۲-۴۱)

جماعت مومنین! تم قوانینِ خداوندی کو ہر وقت اپنی نگاہوں کے سامنے رکھو۔ اس طرح کہ وہ کبھی تمہاری نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائیں۔ اور اس کے متعین فرمودہ پروگرام کی تکمیل میں صبح و شام (ہمیشہ اور مسلسل) سرگرم عمل رہو۔ تم ایسا کرو تو اس کے بعد تم دیکھو گے کہ خدا اور اس کے ملائکہ کی تائید و نصرت کس طرح تمہارے ساتھ رہتی ہے۔ اور تم کس طرح ظلمات پر قابو پا کر اپنی زندگی کو نورانیت میں لے آتے ہو۔

یہ کچھ تو جماعت مومنین کے لئے کہا۔ اور اسی چیز کو نبی اکرمؐ کے لئے خصوصیت سے دہرایا جہاں فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓىِٕكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِیِّ۔ اللہ اور اس کے ملائکہ نبی پر بھی تحسین و آفرین کے پھول برساتے ہیں۔ ان کی تائید و نصرت رسول اللہؐ کے ساتھ ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ۔ اے جماعت مومنین! تم بھی ایسا کرو کہ تمہاری تائید و نصرت رسولؐ کے ساتھ رہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے دوسری جگہ ان الفاظ میں کہا گیا کہ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ (۷/۱۵۷)۔ وہ لوگ جو اس رسول پر ایمان لائیں اور عظمت مندانہ انداز سے اس کی تائید و نصرت کریں۔ سورہ فتح میں ہے وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ (۴۸/۹)۔

اب سوال یہ ہے کہ جماعت مومنین صَلُّوْا عَلَیْهِ کا فریضہ ادا کس طرح سے کرے؟ اس کا جواب خود قرآن نے اس مقام پر دے دیا جہاں فرمایا کہ صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (۳۳/۵۶)۔ وہ اپنی تائید و نصرت رسول کے ساتھ رکھیں یعنی اس کی کامل اطاعت کریں۔ یہ ہے سلیم! صلوا علیہ کا عملی مفہوم۔ اس مقام پر قرآن نے اطاعت کے لئے سلموا تسلیما کہا ہے۔ اس کی تشریح دوسرے مقام پر اس طرح کر دی کہ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (۴/۶۵) تیرا نشوونما دینے والا اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ اپنے دعویٰ ایمان میں کبھی سچے نہیں ہو سکتے جب تک ان کی عملاً یہ حالت نہ ہو کہ اپنے تمام متنازعہ فیہ امور میں تمہیں (اے رسولؐ) حکم بنائیں اور پھر جو فیصلہ تو دے اس کے متعلق اپنے دلوں کے اندر بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں۔ اور اس طرح تیری پوری پوری اطاعت کریں۔ یہ ہے مفہوم سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا کا۔ اس مقام پر یہ کہا اور سورۂ اعراف کی جس آیت کا ایک حصہ اوپر نقل کیا گیا ہے یعنی عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ اس کا باقی حصہ یہ ہے وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ (۷/۱۵۷)۔ مومنین پر لازم ہے کہ وہ اس رسول کی تائید و نصرت کریں۔ یعنی اس کتاب کی اتباع کریں جو اس کے

ساتھ نازل کی گئی ہے۔

اب تم سلیم! ان مختلف ٹکڑوں کو ملاؤ تو بات بالکل صاف ہو جائے گی کہ

١۔ رسول اللہؐ کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ حضورؐ قرآن کے ذریعے نوع انسان کو ظلمت سے نور کی طرف لے آئیں (١٤/١)۔

٢۔ ظلمت سے نور کی طرف لے آنے کا عملی مفہوم وہ ہے جو حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے ساتھ کیا۔ یعنی اس قوم کو انسانوں کی محکومی سے نکال کر خالص قوانین خداوندی کی اطاعت میں لے آنا (١٤/٥)۔

٣۔ اللہ اور اس کی کائناتی قوتیں اپنی تائید و نصرت جماعت مومنین کے ساتھ رکھتی ہیں۔ تاکہ وہ ظلمت سے نکل کر نور کی طرف آجائیں (٣٣/٤٣)۔

٤۔ اللہ اور اس کی کائناتی قوتوں کا یہی عمل خود رسول اللہؐ کے ساتھ بھی ہے (٣٣/٥٦)۔

٥۔ اور مومنین کو خدا کا حکم ہے کہ وہ بھی رسولؐ کے ساتھ یہی عمل رکھیں۔ یعنی اپنی تائید و نصرت اس کے ساتھ شامل رکھیں۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ رسولؐ کی پوری پوری اطاعت کریں (٣٣/٥٦)۔

٦۔ رسولؐ کی اطاعت سے مفہوم قرآن کی اطاعت ہے (٧/١٥٧)۔

اس سے تم نے سلیم! سمجھ لیا ہوگا کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ایک بہت بڑا عملی پروگرام ہے جس سے مراد ہے جماعت مومنین کی طرف سے پوری پوری اطاعت، اور اس سے مقصود یہ ہے کہ یہ جماعت خود بھی ظلمات سے نکل کر نور کی طرف آجائے۔ اور اس کے بعد تمام نوع انسان کو نور کی طرف لے آئے۔ ظاہر ہے سلیم! کہ یہ پروگرام چند الفاظ کے دُہرا دینے سے تو پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو مسلسل جہاد چاہتا ہے۔

تم نے سلیم! یہ دیکھ لیا ہے کہ سورۂ ابراہیم میں جہاں قرآن کا مقصود یہ بتایا گیا ہے کہ وہ انسانیت کو ظلمات سے نور کی طرف لانے کا ذریعہ ہے وہاں اس کی عملی وضاحت، حضرت موسیٰؑ اور قوم بنی اسرائیل کی مثال سے دی گئی ہے (١٤/٥)۔ اب تم یہ دیکھو کہ جہاں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (٣٣/٥٦) اس سے اگلی آیت میں ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ (٣٣/٥٧) "جو لوگ اللہ اور رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں، وہ دنیا اور آخرت میں نعمائے خداوندی سے محروم رہ جاتے ہیں"۔ یہاں "سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا" کے بالکل برعکس "یُؤْذُوْنَ" آیا ہے۔ لہذا خدا اور رسولؐ کو ایذا دینے کے معنی ہیں ان کی سرکشی اور معصیت، عدم اطاعت، یہ بعینہ وہ چیز ہے جو بنی اسرائیل نے

کی تھی۔ چنانچہ چند ہی آیات آگے جاکر اُس کی تشریح کر دی جہاں فرمایا کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِیۡنَ اٰذَوۡا مُوۡسٰى (۳۳/۶۹) اے جماعت مومنین! دیکھنا کہیں تم اُس قوم کی طرح نہ ہوجانا جس نے موسیٰؑ کو اذیت پہنچائی تھی۔ قوم بنی اسرائیل نے کس کس طرح حضرت موسیٰؑ کے احکام و ہدایات کی نافرمانی کی تھی، اسکی تفصیل قرآن کے مختلف مقامات میں موجود ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡهِ وَ سَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا سے مراد پوری پوری اطاعت ہی ہے۔

سورۂ احزاب کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جماعت مومنین کو صلوا علیہ کا حکم دیا ہے۔ لیکن سورۂ توبہ میں خود رسول اللہ سے کہا گیا ہے کہ خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً ...... وَصَلِّ عَلَیۡهِمۡ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ (۹/۱۰۳) یعنی جب یہ لوگ اس مقصد عظیم کے لئے مال و دولت لے کر آئیں تو ان کی یہ پیش کش قبول کیا کرو۔ اس کے بعد ہے، وَصَلِّ عَلَیۡهِمۡ، ان الفاظ کا مفہوم ظاہر ہے۔ جب کسی جماعت کے افراد اپنے فرائض کی ادائیگی میں اس حسن کارانہ انداز سے جد و جہد کریں گے تو مرکز جماعت کی زبان پر بے ساختہ تحسین و آفرین کے الفاظ آجائیں گے۔ وہ اُنہیں شاباش دے گا، اُن کے حق میں نیک دعائیں مانگے گا، اُن کے حسن عمل کو سراہے گا، اور ان کی پیش کش کو تبریک و تہنیت کے جذبات سے قبول کرے گا۔ قرآن نے اس تمام کیفیت کو صَلِّ عَلَیۡهِمۡ کی جامع اصطلاح میں بیان کر دیا ہے اور اس کے بعد اس نفسیاتی کیفیت کا بھی اظہار کر دیا ہے کہ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ کہ تیری طرف سے تبریک تہنیت اور تحسین و آفرین کا اظہار اُن کے لئے سکونِ قلب کا باعث ہوگا۔ جماعت کے جانفروش مجاہدین کو جب یہ معلوم ہو کہ اُن کے اعمال کو شرفِ قبولیت عطا ہو رہا ہے۔ اُن کا قائد ان کی تصویب (APPROVE) کرتا ہے۔ صرف تصویب ہی نہیں بلکہ اس کی تحسین (APPRECIATION) بھی ان کے ساتھ ہے۔ تو اس سے ان کے حوصلے بہت بڑھ جاتے ہیں۔ وہ اور والہانہ انداز سے اپنے فرائض کی تکمیل میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے رسولؐ کی وہ صلوٰۃ جو جماعت کے لئے وجہِ سکونِ قلب بنتی ہے۔

لیکن یہ ظاہر ہے سلیم! کہ اس حوصلہ افزائی (یا تبریک و تحسین) سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، اسے ہماری تائید (SUPPORT) حاصل ہے۔ ہم اس کام میں تمہارے ساتھ ہیں۔ اس مفہوم کے پیش نظر بھی جب ہم سورۂ احزاب کی زیر نظر آیات کو دیکھتے ہیں تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ ایک طرف جماعت مومنین سے کہا گیا کہ هُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡكُمۡ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ یعنی جس گرم جوشی اور سرفروشی سے

تم اُس پروگرام کی تکمیل میں مصروف سعی و عمل ہو، اسے دیکھ کر ہماری اور کائناتی قوتوں کی زبان پر بے ساختہ تہنیت و تبریک اور تحسین و آفرین کے الفاظ آجاتے ہیں۔ ہم تمہارے اس عمل کو بے حد پسند کرتے ہیں جس سے مطلب یہ ہے کہ ہماری تائید تمہارے ساتھ ہے۔ دوسری طرف خود رسول اللہؐ کے متعلق فرمایا کہ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ اس مقصد کے حصول میں خود رسولؐ بھی جس مجاہدانہ سعی و عمل کا مظاہرہ کر رہا ہے اس سے خدا اور اس کی کائناتی قوتیں اس پر تہنیت و تبریک کے پھول برساتی ہیں جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اسے ہماری پوری پوری تائید حاصل ہے۔ اس کے بعد ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ۔ اے جماعت مومنین! اس رسولؐ کی اس جدوجہد پر تم بھی غلغلہ ہائے تبریک و تحسین بلند کرو۔ اور اس طرح اسے بتادو کہ تمہاری تائید بھی اس کے ساتھ ہے۔ لیکن اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (۳۳/۵۶) تم اس کا پورا پورا ساتھ دو۔ اس کی کامل اطاعت کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ظلمت سے نور کی طرف آجاؤ گے۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ دونوں صورتوں میں مفہوم ایک ہی ہے۔ یعنی

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (۳۳/۵۶)

یعنی جسے "درود" کہا جاتا ہے وہ مجاہدانہ سعی و عمل اور جانفروشانہ اطاعت و فرماں پذیری کا ایک عملی پروگرام ہے۔ اس حقیقت کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھو سلیم! کہ خدا کی کتاب جماعت مومنین کو کچھ کرنے کا پروگرام دینے کے لئے آئی تھی۔ جب قوم سے قوت عمل جاتی رہی تو رفتہ رفتہ کرنا، پڑھنے میں بدلتا چلا گیا۔ اور اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ

واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

اُمید ہے۔ ان اشارات میں تمہیں اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں علالت کی وجہ سے ابھی اس سے زیادہ مفصل خط نہیں لکھ سکتا۔

والسلام

پرویز

اکتوبر ۱۹۵۵ء

چوبیسواں خط

اطاعت رسولؐ

ہاں سلیم! یہ بات سمجھنے کی ہے اور اچھی طرح سے سمجھنے کی۔

دین کا مقصود و مطلوب یہ ہے کہ انسان کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے نکال کر قوانین خداوندی کی اطاعت میں لایا جائے۔ اس کے لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ (۳/۷۸)

کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اللہ اسے کتاب اور حکومت اور نبوت دے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میری محکومی اختیار کرو۔ اسے یہی کہنا چاہئے کہ تم سب ربّانی بن جاؤ۔

اسی حقیقت کو اس نے دوسری جگہ ان الفاظ میں دہرایا ہے کہ

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۱۲/۴۰)۔

(یاد رکھو) حکومت صرف اللہ کے لئے ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرو۔ یہی دین محکم ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

اس مقام پر اس حقیقت کو بھی سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن کی رُو سے خدا کی محکومیت اور خدا کی عبادت سے مراد

ایک ہی ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کی اطاعت۔ مندرجہ بالا آیت میں دیکھو، پہلے کہا کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ حکومت صرف اللہ کے لئے ہے۔ اور اس کے بعد کہا کہ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت مت کرو۔ اب ظاہر ہے کہ اگر عبادت سے مراد پرستش لی جائے، تو آیت کے کچھ معنی ہی نہیں بنتے۔ یعنی حکومت صرف اللہ کے لئے ہے، تم صرف اسی کی پرستش کرو۔ خدا کی پرستش تو ہر حکومت میں ہوسکتی ہے۔ اقوام متحدہ نے "بنیادی حقوق انسانیت" کا جو منشور شائع کیا ہے اس میں "پرستش کی آزادی" کو انسانوں کا بنیادی حق قرار دیا ہے۔ اور اسے تمام اقوام عالم نے تسلیم کیا ہے۔ اس لئے پرستش کے لئے خدا کی حکومت کا موجود ہونا ضروری نہیں۔ خدا کی پرستش تو ہم انگریز کے عہد حکومت میں بھی کرتے تھے۔ اور آج ہندوستان کا مسلمان بھی خدا کی پرستش کرتا ہے۔ اس لئے قرآن کی رو سے خدا کی عبادت سے مراد ہی اس کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے سورۂ کہف کی دو آیات میں یوں واضح کیا ہے۔ ایک جگہ ہے:

لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۱۱۰)۔

اسے چاہئے کہ خدا کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرے۔

اور دوسری جگہ ہے:

لَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶)

خدا اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

دیکھو! ایک جگہ عبادت کا لفظ آیا ہے اور اسی مفہوم کے لئے دوسری جگہ حکومت کا لفظ۔

اس مقام پر اس نقطہ کی وضاحت اس لئے بھی ضروری سمجھی گئی ہے کہ ذرا آگے چل کر اس سے "مذہب" اور "دین" کا فرق سمجھ میں آسکے گا۔

ہاں تو بات یہ ہو رہی تھی کہ اطاعت اور محکومیت صرف خدا کی ہوسکتی ہے کسی انسان کی نہیں۔

لیکن خدا تو ہمارے سامنے محسوس شکل میں نہیں آتا۔ ہم اس کے احکام کو براہ راست سن نہیں سکتے۔ اس لئے اس کی اطاعت کسطرح کی جائے؟ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ یہ اطاعت اس کتاب کی رو سے کی جائے جسے اس نے نازل کیا ہے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ط (۶/۱۱۴)۔

کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو حاکم بنالوں۔ حالانکہ اس نے تمہاری طرف اپنی وہ کتاب نازل کر دی ہے جو ہر بات

کو نکھار کر بیان کر دیتی ہے۔

اس کتاب کے علاوہ اور کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ کیونکہ وہ غیراللہ کی اطاعت ہو جائے گی:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۷/۳)۔

تم اس کتاب کا اتباع کرو جو تمہارے خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے۔ اور اس کے سوا کسی کارساز کا اتباع نہ کرو۔ (لیکن) بہت کم لوگ ہیں جو اس اہم حقیقت کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔

یہی کفر اور ایمان کا نقطۂ امتیاز ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ٥ (۵/۴۴)۔

جو اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

اگر خدا کی اطاعت سے مقصود محض خدا کی پرستش (WORSHIP) پوجا پاٹ، بندگی ہوتا تو ہر شخص اپنی اپنی جگہ خدا کی کتاب کی اطاعت کر سکتا تھا۔ کوئی مندر میں، کوئی مسجد میں، کوئی صومعہ میں، کوئی کلیسا میں، کوئی خانقاہ میں، کوئی زاویہ میں۔ "مذہب" کی رو سے خدا کی اطاعت کا یہی مفہوم ہے۔ اس کی رو سے "مذہب" خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جسے عملی زندگی سے کچھ واسطہ نہیں۔ لہٰذا "مذہب" میں ہر انسان اپنے اپنے طور پر خدا کی اطاعت کرتا ہے۔

لیکن "دین" کی رو سے حقیقت یہ نہیں۔ اس کی رو سے خدا کی اطاعت سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اور انسان کے مابین جس قدر متنازعہ فیہ امور ہوں اُن کا فیصلہ قوانین خداوندی کی رو سے کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کوئی ایسا مقام نہ ہو جہاں سے دو فریق اپنے متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ کرائیں۔ اس کے لئے کسی حکم کی ضرورت ہوگی۔ بالفاظ دیگر، مذہب میں ہر شخص خدا کی اطاعت انفرادی طور پر کرتا ہے۔ لیکن دین میں خدا کی اطاعت اجتماعی طور پر کرائی جاتی ہے۔ لہٰذا مذہب میں اطاعت کے لئے صرف خدا کی کتاب کافی ہوتی ہے۔ لیکن دین میں خدا کی اطاعت کے لئے کتاب کے علاوہ کسی جیتی جاگتی شخصیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام، دین (نظام) ہے، مذہب نہیں۔ اس لئے اس میں تنہا کتاب کافی نہیں، اس کتاب کے مطابق اطاعت خداوندی کرانے والا بھی ضروری ہے۔ یہ مرکزی شخصیت خدا کا رسول ہوتا ہے۔ جو لوگ رسول کی اطاعت ضروری نہیں سمجھتے اور اطاعت کیلئے مجرد قرآن کو کافی سمجھتے ہیں وہ دین اسلام کو اس "مذہب" کی سطح پر لے جاتے ہیں جو دیگر اقوام عالم میں رائج ہے۔

یہ وجہ ہے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ خدا نے کتاب کے ساتھ ہمیشہ رسول کو بھیجا، جس کی اطاعت خدا کی اطاعت ہوتی ہے کیونکہ رسول، خدا کی اطاعت کراتا ہے۔ لہٰذا

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴/۸۰)۔

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔

لیکن یہ اطاعت رسول کی ذات کی اطاعت نہیں ہوتی۔ کیونکہ (جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں کہدیا ہے کہ کسی نبی کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ اس لئے خود رسول اللہؐ سے کہدیا گیا کہ تم نے لوگوں کے متنازعہ فیہ امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرنے ہیں:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)

تم ان کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔

اب بات یوں ہوئی کہ خدا کی اطاعت براہ راست نہیں کی جاسکتی۔ اس کی اطاعت رسول کی وساطت سے کی جاسکتی ہے۔ لیکن رسول چونکہ بشر ہوتا ہے، اور کسی بشر کی اطاعت جائز نہیں، اس لئے رسول کی اطاعت اس کی اطاعت نہیں بلکہ خدا کی اطاعت ہوتی ہے، اگرچہ بظاہر اطاعت اسی (رسول) کے فیصلوں ہی کی ہورہی ہوتی ہے۔ انسان اور خدا کے قانون کی اطاعت کا یہ فرق اتنا لطیف اور باریک تھا کہ آج سے چودہ سو سال پہلے جب لوگ اشخاص (بادشاہوں) کی اطاعت ہی کے خوگر تھے اور نظام (قانون) کی اطاعت کو (APPRECIATE) نہیں کرسکتے تھے، اس فرق کو سامنے لانا قرآن ہی کا اعجاز تھا۔ وہ ایک جگہ اللہ کی اطاعت کا ذکر کرتا ہے تو اس خیال سے کہ اس سے لوگ اپنے اپنے طور پر "خدا پرستی اور نیک عملی" کی زندگی نہ سمجھ لیں، ساتھ ہی رسول کی اطاعت کا بھی ذکر کر دیتا ہے۔ لیکن پھر اس خیال سے کہ اس سے کہیں ایک شخص کی اطاعت نہ سمجھ لی جائے (جیسا کہ بادشاہوں کی اطاعت ہوتی تھی) توجہ کو اللہ کی طرف منعطف کرا دیتا ہے اور یوں اللہ سے رسول اور رسول سے اللہ کی طرف لے جاتا ہوا اس اہم حقیقت کو اچھی طرح سے ذہن نشین کراتا چلا جاتا ہے۔ سورۂ نساء کی مندرجہ ذیل آیات میں دیکھو کہ اس لطیف نکتہ کو کس حسن و خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ پہلے اس اصول کو بیان کیا کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ ہم نے ہر رسول کو اس لئے بھیجا تھا کہ اللہ کے حکم کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔

اس اصولی حقیقت کو بیان کرنے کے بعد اس کے عملی پہلو کو سامنے لایا گیا اور کہا وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ ان لوگوں سے جب قانون شکنی ہوگئی تھی۔ انہوں نے حکم خداوندی کی خلاف ورزی کی تھی تو اس کے ازالے کی شکل یہ نہیں تھی

کہ یہ اپنی اپنی جگہ "توبہ استغفار" کر لیتے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ جَاءُوْكَ یہ تیرے پاس آتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دین (نظامِ خداوندی) میں کسی ایسی شخصیت کا ہونا ضروری ہے جس کی طرف لوگ رجوع کریں۔

لیکن اس سے ذہن اس طرف جاسکتا تھا کہ اس باب میں صاحبِ اختیار (خدا نہیں بلکہ) وہ شخصیت ہے جس کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اس لئے اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ جَآءُوْكَ۔ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ " آتے تو تیرے پاس لیکن اپنے جرم کی پاداش سے حفاظت (PROTECTION) (جسے عرفِ عام میں معافی یا بخشش کہتے ہیں) اللہ سے مانگتے"۔ اس سے پھر ذہن اس طرف جاسکتا تھا کہ اگر اللہ ہی سے حفاظت طلب کرنی تھی تو یہ اپنے اپنے ہاں براہِ راست خدا سے معافی مانگ لیتے۔ اس کے لئے رسول کے پاس آنے کی ضرورت کیا تھی؟ اس کے لئے اس کی وضاحت کر دی وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ۔ یہ حفاظت طلبی اور عفو خواہی، خدا اور بندے کے درمیان انفرادی طور پر (براہِ راست) نہیں ہوسکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ رسول بھی بیچ میں ہو اور وہ ان کے لئے حفاظت طلب کرے۔

اب ظاہر ہے کہ یہ معافی رسول ہی کی زبان سے عطا ہوئی۔ لیکن اس خیال سے کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس میں خدا کا تو کوئی واسطہ ہی نہیں رہا ہے پھر دُھرایا کہ اگر وہ ایسا کرتے کہ اپنی حفاظت طلبی اور عفو خواہی کے لئے رسول کے پاس آتے اور رسول (حالات کے مطالعہ اور ان کی بات سننے کے بعد) مطمئن ہو جاتا کہ اُن کا جُرم (قانونِ خداوندی کی رو سے) قابلِ معافی ہے تو وہ اُنہیں معافی دے دیتا۔ لیکن یہ معافی درحقیقت قانونِ خداوندی کی رو سے معافی ہوتی لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (۴/۶۴) تو یہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور سامان رحمت عطا کرنے والا پاتے۔

اس کے بعد، اگلی آیت میں بات صاف کر دی کہ دین میں متنازعہ فیہ امور میں خدا کے احکام کی اطاعت کی عملی شکل کیا ہے۔ فرمایا کہ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ " نہیں! یہ بات نہیں (جیسا کہ یہ لوگ مذہب کے پرانے تصور کے مطابق اپنے دل میں سمجھے بیٹھے ہیں)۔ بات یہ ہے کہ تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ (خدا کا مطیع ہونا تو ایک طرف) مومن بھی نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے متنازعہ فیہ امور میں تجھے (کہ) اپنا حکم نہ بنائیں۔ (پہلی آیت میں "جَآءُوْكَ" کہا گیا تھا۔ اس سے مراد یہی تھی) یہ تجھے حکم بنائیں۔ تو فیصلہ دے اور یہ تیرے فیصلہ کی اطاعت کریں۔ لیکن کیسی اطاعت؟ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۴/۶۵)۔ پھر جو کچھ تو فیصلہ کرے اس کے خلاف اپنے

دل میں بھی کسی قسم کی گرانی محسوس نہ کریں اور اس کی پوری پوری اطاعت کریں۔ اس لئے کہ انسان کسی فیصلہ کے خلاف دل میں گرانی اس وقت محسوس کرتا ہے جب وہ سمجھے کہ یہ شخص اپنا حکم منوا رہا ہے۔ لیکن جب حقیقت یہ ہو کہ وہ قانون کی اطاعت کرا رہا ہو تو پھر اُس اطاعت سے دل میں کبیدگی پیدا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اس قانون کی صداقت پر ایمان نہیں۔ اس لئے شروع میں کہا گیا تھا کہ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ......

۴۔ تصریحات بالا سے واضح ہے کہ خدا کی اطاعت درحقیقت قوانین خداوندی (کتاب اللہ) کی ایسی اطاعت ہے جو اس رسول کی وساطت سے کی جائے جو اُس قانون کو نافذ کرتا ہے۔ اسی کو قرآن میں "اللہ اور رسول کی اطاعت" کہا گیا ہے۔ اگر اس سے خدا اور رسول کی الگ الگ اطاعتیں مراد لی جائیں تو یہ چیز خود قرآن کے اس واضح اصول کے خلاف چلی جائے گی کہ کسی بشر کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے خدا نبوّت وکتاب ہی کیوں نہ عطا کر دے کہ وہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے (۳/۷۸) اور خدا نے رسول کو بار بار بشر (بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ) کہا ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو (کہ یہ دو الگ الگ اطاعتیں نہیں بلکہ ایک ہی اطاعت ہے) نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا ہے اور وہ اس طرح کہ "اللہ اور رسول" کا ذکر کر کے، اس کے بعد ضمائر (PRONOUNS) واحد لائی گئی ہیں۔ اور فعل کے صیغے بھی واحد (حالانکہ عربی قاعدے کی رو سے ان مقامات میں ضمائر اور صیغے تثنیہ کے آنے چاہئیں تھے) مثلاً

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ (۸/۲۰)

اے جماعت مومنین! تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی مت کرو۔ درآنحالیکہ تم سُن رہے ہو۔

دیکھو! یہاں "اللہ اور رسولؐ" (دو) کا ذکر ہے اور عَنْهُ میں ضمیر واحد ہے۔ (نیز وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُونَ سے یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ اطاعت اس کی کی جاتی ہے جس کی بات سنی جا سکے، جو محسوس طور پر درمیان میں موجود ہو۔ جو محسوس طور پر موجود نہ ہو، عملی معاملات میں اس کی اطاعت کی ہی نہیں جا سکتی)۔

اسی طرح سورۂ انفال میں دوسری جگہ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (۸/۲۴)

اے جماعت مومنین! تم اللہ اور رسولؐ کی دعوت کا جواب دو۔ جب وہ تمہیں اس بات کی طرف

بلائے جو تمہیں (موت سے نکال کر) زندگی عطا کر دے۔

یہاں بھی "اللہ اور رسولؐ" کا ذکر ہے اور صیغہ (دَعَاکُمْ) واحد کا ہے۔ اسی طرح سورۂ نور میں ہے:

وَاِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْۤا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ (۲۴/۴۸-۴۹)

اور جب ان لوگوں کو "اللہ اور رسولؐ" کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ اُن کے متنازعہ فیہ امور میں فیصلہ کرے تو اُن میں کا ایک فریق اس سے گریز کرتا ہے اور اگر ان کا کوئی حق کسی پر واجب ہو (جس سے وہ سمجھ لیں کہ فیصلہ اُن کے حق میں جائے گا تو) وہ اس کی طرف سر جھکائے چلے آتے ہیں۔

یہاں بھی "اللہ اور رسولؐ" کی طرف بلائے جانے کا ذکر ہے۔ لیکن لِيَحْكُمَ میں صیغہ واحد ہے اور اِلَيْهِ میں ضمیر واحد کی۔ اسی طرح کی اور مثالیں بھی ہیں۔ اس انداز بیان کا سمجھ لینا ہمارے دور میں کچھ مشکل نہیں۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں بھی گورنمنٹ (حکومت) یا نظامِ اجتماعی (ORGANISATION) کے لئے واحد ہی کے صیغے استعمال ہوتے ہیں۔ یہی مفہوم قرآن کے ان مقامات میں ہے۔

۵۔ یہ حقیقت کہ "اللہ اور رسولؐ" سے مراد وہ نظام یا نظام کا مرکز (امام، امیر) ہے جو اللہ کے قانون کو عملاً نافذ کرتا ہے؛ قرآن کے دیگر مقامات سے بھی واضح ہے۔ مثلاً سورۂ انفال میں ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ (۸/۱)

تجھ سے مالِ غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ مالِ غنیمت "اللہ اور رسولؐ" کا ہے۔

اس آیت میں ذرا آگے چل کر ہے:

وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ....... (۸/۴۱)

اور جان رکھو کہ جو کچھ تمہیں مالِ غنیمت سے ملے اس کا پانچواں حصہ "اللہ اور رسولؐ" کے لئے ہے۔

ان تمام مقامات میں (نیز ۵/۳۳) میں جہاں "اللہ اور رسولؐ" کے خلاف جنگ، بغاوت کرنے کے جرم کی سزائیں لکھی ہیں)" اللہ اور رسولؐ" سے مراد امام یا امیر یا اسلامی نظام ہے۔ یہ مفہوم انوکھا نہیں، بلکہ شروع ہی سے ایسا سمجھا جاتا رہا ہے اور اب بھی ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس پر خود ہمارے دور کی تفسیریں شاہد ہیں۔

۶۔ ان تصریحات کی روشنی میں اس آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جس میں اللہ اور رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (۴/۵۹)۔

اے ایمان والو! تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اپنے میں سے صاحب اختیار لوگوں کی۔ پھر اگر کسی معاملہ میں تمہیں اختلاف (منازعت) ہو تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف لے آؤ۔

اس آیت میں اسلامی نظام کا پورا نقشہ دے دیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے "اللہ اور رسولؐ" کی اطاعت اس نظام خداوندی کی اطاعت ہے جسے سب سے پہلے رسول اللہؐ نے متشکل فرمایا۔ اس نظام میں تمام متنازعہ فیہ امور کے فیصلوں کے لئے رسولؐ کے پاس آنے کا حکم تھا۔ لیکن جب یہ نظام مدینہ سے آگے بڑھا تو یہ عملاً ناممکن تھا کہ دور دراز کے لوگ اپنے مقدمات کے فیصلوں کے لئے مرکز کی طرف آتے۔ اس کیلئے مختلف مقامات میں ماتحت افسر (صاحبان امر) مقرر کرنے پڑے۔ ان افسروں (یا عدالتوں) کی اطاعت خود مرکزی حکومت کی اطاعت تھی۔ لیکن ایک فرق کے ساتھ۔ اور وہ یہ کہ مرکزی حکومت کے فیصلوں کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا فیصلہ حرف آخر تھا۔ لیکن ان ماتحت عدالتوں کے فیصلہ کے خلاف مرکز میں اپیل ہو سکتی تھی۔ یہ مطلب ہے اس سے کہ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ۔ اگر تم میں اور اولی الامر (صاحبان امر۔ افسران ماتحت) میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو تم ایسے معاملہ کو مرکز کی طرف (REFER) کرو۔ وہاں سے جو فیصلہ صادر ہو اس کی اطاعت تم پر فرض ہو جائے گی۔

۷۔ رسول اللہؐ کے ذمے اس ضمن میں دو کام تھے۔ ایک تو متنازعہ فیہ امور میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرنا اور دوسرے کتاب اللہ نے جن قوانین کو محض اصولی طور پر بیان کیا تھا اور جن کی جزئیات کو دانستہ چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ وہ بھی اصولوں کی طرح، ہمیشہ کے لئے غیر متبدل نہ قرار پا جائیں (جیسا کہ ۵/۱۰۱ سے ظاہر ہے) اپنے حالات کے مطابق ان کی جزئیات متعین کرنا۔ سوال یہ ہے کہ حضورؐ ان امور کو کس طرح سرانجام دیا کرتے تھے۔ کیا یہ وحی کے ذریعہ ہوتا تھا یا حضورؐ اپنے طور پر کرتے تھے؟ جہاں تک مقدمات میں فیصلہ کرنے کا تعلق ہے بخاری کی ایک حدیث اس سوال کا جواب واضح طور پر پیش کرتی ہے۔ اس کی جلد دوم کتاب الشہادت میں ہے کہ:

حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ؐ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ تم لوگ میرے سامنے اپنے جھگڑے پیش کرتے ہو۔ سو ایسا ہو سکتا ہے کہ تم میں سے بعض لوگ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل پیش کرنے میں زیادہ تیز واقع ہوں (الحن بحجتہ من بعض) (اور میں اس سے سمجھ لوں کہ وہ سچا ہے اور اس کے حق میں فیصلہ دے دوں) سو اگر میں کسی شخص کو اس کے بیان کے مطابق اس کے بھائی کا حق دے دوں تو اسے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ میں اسے آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں۔ اسے چاہیئے کہ اسے نہ لے۔

اس سے ظاہر ہے کہ حضورؐ مقدمات کے فیصلے اپنی ذاتی بصیرت کے مطابق کیا کرتے تھے، جس کا مدار اُن بیانات اور شہادات پر ہوتا تھا جو آپ کے سامنے بحیثیت جج کے پیش کی جاتی تھیں۔ لہٰذا ان میں اس کا بھی امکان تھا کہ حقدار کے خلاف فیصلہ صادر ہو جائے۔ اگر یہ فیصلے وحی کی رو سے ہوتے تو ان میں اس قسم کا امکان ہو نہیں سکتا تھا۔ ہم اس حدیث کو اس لئے صحیح تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ قرآن کی اس آیت کے مطابق ہے جس میں حضورؐ سے کہا گیا ہے کہ:

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِىْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِىْٓ اِلَىَّ رَبِّىْ ۭ (۳۴/۵۰)

ان سے کہدو کہ اگر میں کسی معاملہ میں غلطی کرتا ہوں تو وہ غلطی میری اپنی وجہ سے ہوتی ہے (اس کا ذمہ دار میں خود ہوتا ہوں۔ لہٰذا اس کا وبال بھی مجھ پر ہی پڑے گا) اور اگر میں صحیح راستہ پر ہوتا ہوں تو وہ اس وحی کی بنا پر ہے جو میرے رب کی طرف سے میری طرف آئی ہے۔

یہ آیت اور وہ روایت ایک ہی حقیقت کو پیش کرتی ہیں۔

اب رہا جزئیات کا متعین کرنا تو اس کے لئے قرآن نے حضورؐ کو حکم دے دیا تھا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ (۳/۱۵۸) تم معاملات میں ان (جماعت مومنین) سے مشورہ کیا کرو۔ اس حکم کے تحت یہ تمام امور باہمی مشاورت سے طے پاتے تھے۔ چنانچہ کتب روایات و سیر میں کئی واقعات مندرج ہیں جن سے ظاہر ہے کہ حضورؐ، صحابہؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ مثلاً قرآن میں ہے اِذَا نُوْدِىَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ ...... (۶۲/۹)۔ (جب نہیں جمعہ کی صلوٰۃ کے لئے پکارا جائے) اس میں صلوٰۃ کے لئے ندا (پکارنے) کا تو ذکر ہے۔ لیکن قرآن نے اس ندا کے طریق (اذان) کو متعین نہیں کیا۔ اب یہ دیکھئے کہ اذان کس طرح سے متعین ہوئی تھی۔ مشکوٰۃ کتاب الاذان میں ہے کہ:

عبداللہ بن زید بن عبد ربہ نے کہا کہ جب رسول اللہ ؐ نے ناقوس بجانے کا حکم دیا تاکہ اسے بجا کر لوگوں کو نماز کے لئے جمع کریں تو مجھ کو خواب میں ایک شخص دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں ناقوس تھا۔ پس میں نے خواب ہی میں اس سے

پوچھا۔ اے اللہ کے بندے کیا فروخت کرتا ہے ناقوس کو؟[1] اُس نے کہا تو ناقوس کا کیا کرے گا۔ میں نے کہا ہم اس سے لوگوں کو نماز کے لئے بلائیں گے۔ اُس نے کہا کیا میں تجھ کو ایسی چیز نہ بتادوں جو اس سے بہتر ہے میں نے کہا ہاں۔ اُس نے کہا اللہ اکبر، اللہ اکبر الخ۔ اور اسی طرح تکبیر۔ پس جب صبح ہوئی میں رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا خواب بیان کیا۔ پس فرمایا آپ نے تحقیق یہ خواب حق ہے۔ جو خدا چاہے۔ پس کھڑا ہو تو بلالؓ کے ساتھ اور جو خواب میں دیکھا ہے اس کو بتلا اور وہ اذان کہے اس لئے کہ وہ بلند آواز ہے۔ پس کھڑا ہوا میں بلالؓ کے ساتھ اور اس کو اذان کے کلمے بتانے لگا۔ اور وہ اذان کہتے رہے۔ راوی کا بیان ہے کہ جب عمر بن الخطابؓ نے اپنے گھر میں اذان کی آواز سُنی تو چادر گھسیٹتے ہوئے گھر سے نکلے اور رسول اللہؐ سے عرض کیا یا رسول اللہؐ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے۔ میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا ہے جیسا کہ دکھایا گیا عبداللہ کو۔ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ پس خدا ہی کے لئے تعریف ہے۔

(ابو داؤد ۔ دارمی ۔ ابن ماجہ)

اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان جزئیات کو رسول اللہؐ وحی کے ذریعے متعین نہیں فرمایا کرتے تھے۔

۸۔ رسول اللہؐ کی زندگی میں یہ نظام (دین) اس نہج سے قائم رہا۔ جب حضورؐ نے وفات پائی تو کیفیت یہ ہوگئی کہ خدا کی کتاب تو موجود تھی لیکن وہ محسوس شخصیت جس نے کتاب اللہ کی اطاعت کرانی تھی موجود نہ رہی۔ یہ تو الگ بات ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنی حدیث کا کوئی مجموعہ مرتب فرما کر امت کو نہیں دیا تھا۔ لیکن اگر کوئی ایسا مجموعہ موجود بھی ہوتا تو بھی مشکل وہی رہتی کہ کتابیں موجود تھیں لیکن مرکزی شخصیت موجود نہ تھی۔ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ کتابوں کی از خود اطاعت کرنا "مذہب" میں تو ممکن ہے دین میں ممکن نہیں۔ دین میں کتاب اللہ کی اطاعت کرائی جاتی ہے۔ اور اس کیلئے محسوس شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دین کو رسول اللہؐ کی زندگی تک ہی باقی رہنا تھا اور حضورؐ کے بعد اسے پھر "مذہب" بن جانا تھا؟ یعنی کیا رسول اللہؐ کے بعد "خدا اور رسولؐ کی اطاعت لوگوں نے از خود (انفرادی طور پر) کرنی تھی۔ یا یہ اطاعت کسی مرکزی شخصیت کے ذریعے کرائی جانی تھی؟ قرآن نے اس کے متعلق پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ سلسلہ

---

[1] چونکہ میں ان احادیث کا ترجمہ خود نہیں کر رہا اس لئے جس طرح شائع شدہ ترجمہ موجود ہے اسے اسی طرح پیش کیا جا رہا ہے۔

رسول اللہؐ کی زندگی تک ہی نہیں۔ حضورؐ کے بعد بھی بدستور جاری رہے گا۔ سورۂ آل عمران میں ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (۳/۱۴۳)۔

محمدؐ بجز اس نیست کہ اللہ کا رسولؐ ہے۔ اس سے پہلے بہت سے رسولؐ گزر رہے ہیں۔ سو اگر یہ وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم اس کے بعد پھر الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔

ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد دین کے باقی رہنے کی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ رسولؐ کا ایک جانشین ہوتا جو محسوس شخصیت کی حیثیت سے رسولؐ کی جگہ لے لیتا۔ اسے خلیفۃ الرسول (رسول کا جانشین) کہا جاتا ہے۔ چونکہ قرآن نے جماعت مومنین سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) ان کے معاملات باہمی مشوروں سے طے پائیں گے۔ اس لئے صحابہؓ نے باہمی مشورے سے خلیفۃ الرسول کا انتخاب کر لیا۔ اور یوں دین کا سلسلہ علیٰ حالہٖ قائم رکھا۔ اب یہ مومنین کا منتخب کردہ خلیفہ مومنین کے مشورے سے کتاب اللہ کے مطابق تمام امور کے فیصلے کرتا تھا۔ لہٰذا اس کی اطاعت وہی حیثیت رکھتی تھی جو رسول اللہؐ کی اطاعت کی حیثیت تھی۔ اب اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی عملی شکل خلیفۃ الرسول کی اطاعت تھی۔ اسی لئے رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ:

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِىْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ

(مشکوٰۃ۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

تم پر میرے طریقے اور میرے خلفائے راشدین مہدیین کے طریقے کی پیروی لازمی ہے۔

حضورؐ کا یہ ارشاد دین کی روح کے عین مطابق اور قرآن کی اس آیت کی عملی تعبیر تھا جس میں کہا گیا ہے کہ:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (۴/۱۱۵)

اور جو شخص رسولؐ کی مخالفت کرے۔ بعد اس کے کہ اس پر خدا کی ہدایت ظاہر ہو چکی ہو اور مومنین کے راستہ کے سوا کوئی اور راستہ اختیار کر لے۔ تو ہم اس کا تعلق اس سے جوڑ دیں گے جس سے وہ اپنا تعلق قائم کرتا ہے۔ اور اسے جہنم میں داخل کر دیں گے اور وہ بُری جگہ ہے۔

امت کے باہمی مشورے سے نصب امامت اور اس امام (امیر المومنین) کی اطاعت سبیل المومنین تھی جس کی اتباع کا حکم قرآن نے دیا تھا۔ اسی کو خلافت علیٰ منہاج نبوت کہتے ہیں۔

۹۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ رسول اللہ ؐ کا فریضہ یہ تھا کہ (الف) حضورؐ لوگوں کے متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کرتے تھے اور (ب) قرآن کے اصولی احکام کی جزئیات متعین فرماتے تھے۔ جہاں تک پہلی شق کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ خلیفۃ الرسولؐ اس فریضہ کو بدستور انجام دیتا تھا۔ اب فلا وربك لا یومنون حتّٰی یحکموك فیما شجر بینھم (تیرے رب کی قسم یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے متنازعہ فیہ امور میں تجھے حکم نہ بنائیں) میں لكَ (تجھے) سے مراد خلیفۃ الرسولؐ تھا۔ اب تمام متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ خلیفہ کی طرف سے ہوتا تھا۔ باقی رہی دوسری شق (یعنی جزئیات کا تعین BY LAWS کا بنانا) سو اس کے متعلق کتب روایات و آثار میں ایسی شہادات موجود ہیں جن سے واضح ہے کہ خلیفۃ الرسولؐ ان فرائض کو بھی سرانجام دیتا تھا۔ اس کی شکل یہ تھی کہ:

۱۔ جن امور کی جزئیات پہلے متعین نہیں ہوئی تھیں ان کی جزئیات متعین کی جاتی تھیں۔ مثلاً شراب کی سزا نبی اکرمؐ کے زمانے میں مقرر نہیں ہوئی تھی (ایسا کوئی واقعہ ہی سامنے نہیں آیا ہوگا) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس کی سزا چالیس کوڑے مقرر فرمائی (حضرت عمرؓ نے اسے اسّی کوڑے کر دیا تھا)۔

۲۔ جو جزئیات پہلے متعین ہو چکی تھیں اور ان میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی، انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جاتا تھا۔ ایک آئینی حکومت کا یہی انداز ہوتا ہے۔ اس میں سابقہ حکومت کے فیصلے بدستور نافذ العمل رہتے ہیں تا آنکہ تغیر حالات سے ان میں تبدیلی نہ کر دی جائے۔

۳۔ جن جزئیات میں اقتضائے حالات کے مطابق، کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی، ان میں تبدیلی کر دی جاتی تھی۔ اس لئے کہ یہ جزئیات ابتدا میں بھی وحی کی رو سے متعین نہیں ہوئی تھیں کہ ان میں وحی ہی کوئی تبدیلی کر سکتی۔ یہ باہمی مشورہ سے طے پائی تھیں۔ اب اسی مشاورت کی رو سے ان میں تغیر و تبدّل کیا جا سکتا تھا۔ اس کی متعدد مثالیں کتب روایات و آثار میں موجود ہیں مثلاً:

۱۔ نبی اکرمؐ کے زمانہ سے لے کر عہد صدیقیؓ تک، ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک شمار کر کے طلاق رجعی قرار دیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اسے تین شمار کر کے طلاق مغلظ قرار دے دیا۔ چنانچہ فقہ کی رو سے امت کا عمل اسی کے مطابق ہو رہا ہے (ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں کہ قرآن کی رو سے صحیح طلاق کی پوزیشن کیا ہے۔ ہم یہاں صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہماری کتب روایات و سیر میں ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے کے فیصلے حضورؐ کے خلفاء کے عہد میں بدلے جا سکتے تھے۔ اور چونکہ ایسا کیا جاتا

قرآن کے منشا اور نظام دین (نظام اسلامی) کے اقتضاء کے عین مطابق ہے اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی تبدیلیاں ضرور ہوئی ہوں گی)۔

۲۔ نبی اکرمؐ نے جنگ کے قیدیوں کا فدیہ ایک دینار فی کس مقرر فرمایا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے مختلف ممالک میں مختلف شرحیں مقرر فرمائیں۔

۳۔ نبی اکرمؐ نے زمین کی پیداوار کی مختلف اجناس کی شرح خراج بالتفصیل مقرر نہیں فرمائی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں ہر جنس کے متعلق خراج کی شرح (کہ فلاں چیز پر اتنا خراج ہوگا، اور فلاں پہ اتنا) متعین فرمائی۔

۴۔ حضورؐ کے زمانے میں مؤلفۃ القلوب کو صدقات کی مد سے امداد دی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اسے ختم کر دیا۔

۵۔ نبی اکرمؐ کے زمانے میں بعض مفتوحہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اس سسٹم کو ختم کر دیا۔

۶۔ رسول اللہؐ نے لوگوں کے وظائف ضروریات کے مطابق مقرر فرمائے تھے۔ یہی طریق حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں رائج رہا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے انہیں خدمات کے تناسب سے بدل دیا۔

۷۔ نبی اکرمؐ کے زمانے میں تجارتی گھوڑوں اور سمندر سے برآمد شدہ چیزوں پر زکوٰۃ نہیں لی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے ان پر زکوٰۃ قائم کی۔

۸۔ حضرت عمرؓ نے فیصلہ دیا کہ جنگ کے دوران میں کسی پر حد جاری نہ کی جائے۔ اور قحط کے زمانے میں چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔

یہ چند واقعات محض بطور مثال درج کر دیئے گئے ہیں۔ انہی میں حضرت عمرؓ کی اوّلیات کو بھی شامل کر لیا جائے (جن کی تعداد مؤرخین نے چالیس پچاس سے کم نہیں بتائی) تو ان کی تعداد اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ لیکن سوال تعداد کا نہیں، اصل سوال یہ ہے کہ عہد خلفائے راشدین میں اس اصول کو تسلیم کیا جاتا تھا کہ اگر زمانے کے تقاضے اسکے خواہاں ہوں تو نبی اکرمؐ کے زمانے کے فیصلوں میں مناسب رد و بدل کیا جا سکتا ہے۔ اور ایک خلیفہ کے فیصلے کو خلیفۂ مابعد بھی بدل سکتا ہے۔ مثلاً حضرت عثمانؓ کے زمانے تک اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کا رواج تھا۔ (اس کی اجازت قرآن میں موجود ہے) لیکن حضرت علیؓ نے بعض خدشات کے پیش نظر اسے بند کر دیا۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جن امور کی قرآن نے اجازت دی ہوئی ہے اگر حالات کا تقاضا ایسا ہو تو مرکزِ ملت انہیں وقتی طور پر

بند بھی کر سکتا ہے۔

ان واقعات سے اس حقیقت کی مزید تصدیق ہو جاتی ہے کہ نبی اکرمؐ کے زمانہ میں یہ جزئیات وحی کی رو سے متعین نہیں ہوتی تھیں۔ کیونکہ اگر یہ وحی سے متعین ہوتیں تو حضورؐ کے خلفائے راشدین میں سے کسی کو بھی اس کا حق نہیں پہنچ سکتا تھا کہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی (یا حک و اضافہ) کر سکتا کیونکہ ان میں سے کوئی بھی صاحب وحی نہیں تھا۔ وحی کا سلسلہ حضورؐ کی ذات پر ختم ہو گیا۔ اس باب میں حضورؐ کو صحابہؓ سے مشورہ لینے کا حکم تھا۔ اور خلفائے راشدین بھی اپنے اپنے زمانہ میں باہمی مشاورت سے ان میں تبدیلیاں کر دیتے تھے۔ وحی کی رو سے متعین شدہ جزئیہ میں کوئی بھی تبدیلی کرنے کا مجاز نہیں۔ مثلاً قرآن نے کہا ہے کہ وضو میں ہاتھ کہنیوں تک دھونے چاہئیں۔ اب کسی کو اس کا اختیار نہیں کہ یہ کہدے کہ نہیں! ہاتھ پہنچوں تک ہی دھونے چاہئیں۔ بہرحال یہ تھی صورت جزئیات میں تبدیلی کی خلفائے راشدین کے زمانے تک، جن کی اطاعت خدا اور رسولؐ کی اطاعت تھی۔

۱۰۔ دین کا یہ سلسلہ خلفائے راشدین تک قائم رہا۔ اس کے بعد منقطع ہو گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر یہ سلسلہ بدستور قائم رہتا تو (مثلاً) چوتھے خلیفہ کے بعد پانچویں خلیفہ کی اطاعت بھی "اللہ اور رسول" کی اطاعت کی حیثیت رکھتی۔ اور وہ بھی وہی فرائض انجام دیتا جو رسول اللہؐ اور بعد کے خلفاء سرانجام دیتے تھے۔ اس کے بعد چھٹا، ساتواں، آٹھواں۔ ہر خلیفہ کی یہی پوزیشن ہوتی۔ اور اگر یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے ہم تک پہنچ جاتا تو ہمارے وقت کے خلیفہ راشد کی وہی حیثیت ہوتی جو پہلے خلفائے راشدین کی تھی۔ اس کے طریقہ کی پیروی بھی رسول اللہؐ کے طریقہ (سنت) کی پیروی کی طرح لازم ہوتی۔ اس وقت یہ سوالات ہی پیدا نہ ہوتے کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کا مفہوم کیا ہے۔ رسولؐ کی اطاعت کیسے کی جاتی ہے۔ دین میں کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہؐ کی ٹھیک ٹھیک حیثیت کیا ہے۔

یہ سوالات اس وقت پیدا ہوئے جب دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ یعنی کتاب تو موجود رہی لیکن وہ محسوس اتھارٹی باقی نہ رہی جس نے کتاب اللہ کی اطاعت کرانی تھی۔ اب اطاعت انفرادی ہو گئی۔ اب یہ سوال سامنے آیا کہ "اللہ اور رسولؐ کی اطاعت" میں اللہ کی اطاعت تو کتاب کی رو سے کی جا سکتی ہے۔ رسولؐ کی اطاعت کسطرح کی جاوے؟ اس کے لئے کہا گیا کہ یہ اطاعت رسول اللہؐ کی احادیث کی رو سے کی جائے گی۔ اس کے سوا اس کی کوئی دوسری شکل ہی ذہن میں نہیں آ سکتی تھی۔ لہذا اب رسول اللہؐ کی احادیث کے جمع اور مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چونکہ یہ چیز ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ ہر معاملہ کے متعلق جانتا کہ اس کے متعلق خدا کی کتاب اور رسول اللہؐ کی احادیث میں کیا لکھا ہے اس لئے عوام کو لامحالہ صاحب علم لوگوں کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اس طرح امت میں

پیشوائیت وجود میں آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی مختلف فرقے پیدا ہو گئے۔

یہ کچھ انفرادی طور پر ہو رہا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی حکومت بھی قائم تھی۔ وہ اپنے دائرے میں اپنے قوانین و احکام کی اطاعت کراتی تھی۔ چونکہ دو متوازی حکومتیں بیک وقت چل نہیں سکتی تھیں، اس لئے ان اختیارات کی تقسیم یوں ہوتی کہ ذاتی معاملات (PERSONAL LAWS) کے متعلق علماء وفقہا اتھارٹی قرار پائے اور امور سلطنت کے متعلق اتھارٹی سلاطین کی تسلیم کی گئی۔ اس طرح اسلام میں وہ ثنویت (DUALISM) آگئی جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ یہ ثنویت آج تک جاری ہے۔ جہاں مسلمان غیر مسلموں کی حکومت میں رہتے ہیں، وہاں دنیاوی امور میں حکومت کے قوانین کی اطاعت کی جاتی ہے اور ذاتی معاملات (PERSONAL LAWS) میں شریعت کی جس کے فیصلے علماً اور مفتی حضرات کرتے ہیں۔ جہاں ان کی اپنی حکومتیں ہیں وہاں بھی علماء حضرات کتاب وسنت کی تعبیر کا حق اپنے پاس رکھتے ہیں حکومت کو نہیں دیتے۔

آپ نے غور کیا کہ ایک محسوس اتھارٹی (مرکز ملت) کے باقی نہ رہنے سے اُمت کی زندگی کے ہر گوشے میں کس طرح انتشار ہی انتشار (CHAOS) پیدا ہو گیا۔ یہ انتشار اس وقت تک چلا آرہا ہے۔

۱۱۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ اس کا جواب صاف اور واضح ہے۔ جس محسوس اتھارٹی (مرکز ملت) کے گم ہو جانے سے یہ سارا انتشار پیدا ہوا ہے اُسے پھر سے قائم کر دیا جائے۔ جہاں سے خلافت علیٰ منہاج نبوت کا سلسلہ منقطع ہوا تھا وہیں سے اسے پھر سے جوڑ دیا جائے۔ اس وقت اسلام، دین کی شکل کو چھوڑ کر مذہب کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اسے پھر سے دین میں تبدیل کر دیا جائے۔ پھر وہ مرکز سامنے آجائے جسے ہم تمام متنازعہ فیہ امور میں اپنا حکم بنائیں اور اس طرح خدا کے اس حکم کی اطاعت کر سکیں۔ فلا وربک لا یومنون حتٰی یحکموک فیما شجر بینھم (۴/۶۵)۔ ہم میں جو یہ خیال پیدا کر دیا گیا ہے کہ اب خلافت راشدہ کا سلسلہ قائم ہی نہیں کیا جا سکتا، تو یہ نا امیدی (FRUSTRATION) کا نتیجہ ہے۔ اسلام نے قیامت تک زندہ رہنا ہے۔ اس لئے اس میں خلافت کا سلسلہ بدستور سابق قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ خلافت علیٰ منہاج نبوت ہوگی:

۱۔ جو امت کے تمام متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ کرے گی۔

۲۔ جو کچھ اس وقت ہمارے پاس شریعت کے نام سے موجود ہے، کتاب اللہ کی روشنی میں اس کا جائزہ لیگی۔ جو کچھ اس میں غلط ہو گا اسے محو کر دے گی۔ جس بات میں موجودہ حالات کے مطابق کسی تبدیلی کی ضرورت ہوگی اس میں مناسب تبدیلی کر دے گی۔ باقی علیٰ حالہ رہنے دے گی۔

لیکن سلیم! جب تک خلافت کا یہ سلسلہ قائم نہیں ہو جاتا، کسی فرد کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اُمّت کے امور شریعت (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کی جزئیات) جس طریق پر چلی آ رہی ہیں اس میں کوئی تغیر و تبدل کرے۔ وہ صرف اتنا کر سکتا ہے کہ یہ بتا دے کہ فلاں معاملہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ قرآن کے مطابق نہیں۔

۱۲۔ میری کوشش یہ ہے کہ ہم میں پھر سے خلافت علیٰ منہاج نبوت کا سلسلہ قائم ہو جائے، تاکہ ہم پھر "اللہ اور رسولؐ" کی اطاعت کر سکیں۔ اسی طرح جس طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں "اللہ اور رسولؐ" کی اطاعت کی جاتی تھی۔ اس کے لئے میرا طریق کار یہ ہے کہ (بغیر کسی قسم کی فرقہ سازی کے) قوم کے صاحب فکر طبقہ کے سامنے یہ حقیقت لائی جائے کہ دین کا صحیح مفہوم کیا ہے اور "خدا اور رسولؐ" کی اطاعت کی عملی شکل کیا؟

والسلام

پرویز

اکتوبر ۱۹۵۷ء

پچیسواں خط

اسلامی قانونِ شریعت کے مآخذ

عزیزم سلیم میاں! تمہارا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اس بات کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ میں اتنے عرصہ تک تمہیں خط نہ لکھوں۔ لیکن غور کرو تو خود یہی چیز تمہاری شکایت کا جواب بھی ہے حالات کچھ ایسے ہی تھے جنہوں نے مجھے اتنی بھی فرصت نہ دی کہ میں تمہیں خط لکھ سکتا! ؎

نہ آسماں بگردش و ما درمیانہ ایم
غالب دگر مپرس کہ برما چہ می رود

لیکن اتنے لمبے عرصہ تک خط نہ لکھنے کے معنی یہ نہیں کہ میں تمہیں بھول گیا تھا۔ ؎

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

تمہارے اور طاہرہ دونوں کے کئی ایک جواب طلب خطوط میرے سامنے ہیں۔ ان میں سے غیر ضروری امور کو چھوڑ کر، باقی استفسارات کے متعلق کوشش کروں گا کہ ایک ایک کر کے جواب لکھتا جاؤں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تمہارا سوال تو دو ایک فقروں میں ختم ہو جاتا ہے اور مجھے جواب میں سطحوں کے صفحے لکھنے پڑتے ہیں۔ مگر اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے ع

دست تہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

تمہارا سوال یہ ہے کہ اسلامی قانون شریعت کے مآخذ کیا ہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ گزشتہ کچھ

عرصہ سے ملک میں آئین سازی کے سلسلہ میں ایسی فضا پیدا ہو چکی ہے جس میں اس قسم کے سوالات زور و کر سامنے آتے ہیں۔ اگرچہ مملکت کا آئین اب منظور ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے بعد قانون سازی کے مراحل شروع ہوں گے اس لئے اس سوال کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی۔ بات اہم ہے اس لئے ذرا توجہ سے سنو۔

تم جس سے یہ سوال پوچھو، اس کا جواب یہی ملے گا کہ اسلامی قانون شریعت کے مآخذ چار ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔ ان عناصر اربعہ نے ایسے مسلّمہ کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے جس پر کسی غور و فکر کی ضرورت اور بحث و نظر کی گنجائش ہی نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن تم میرے مسلک سے واقف ہو، میں ان امور پر بھی غور و فکر کرتا ہوں اور دوسروں کو بھی ان میں تدبّر و تفکّر کی دعوت دیتا ہوں جو عام طور پر بطور مسلّمات مانے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ میرے نزدیک کسی بات کے صحیح ماننے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اسے غور و فکر کے بعد، دلائل و براہین کی رو سے صحیح مانے۔

قرآن نے تو اس باب میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مومن وہ ہیں کہ اِذَا ذُكِّرُوا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۲۵/۷۳) "جب ان کے سامنے آیات خداوندی پیش کی جائیں تو وہ اُن پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے"۔ جب قرآن کی خود اپنی آیات کے متعلق یہ تاکید ہے تو عام مسلّمات کے متعلق اس کی روش ظاہر ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھو کہ ان اصطلاحات کا مروّجہ مفہوم کیا ہے؟ واضح رہے کہ یہ موضوع فنّی اور اصطلاحی ہے، لیکن میں کوشش کروں گا کہ تمہیں فنّی اصطلاحات میں اُلجھائے بغیر، عام فہم الفاظ میں بات سمجھا دوں۔

پہلے قیاس کو لو۔ اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ جب اسلام دُور دراز ملکوں تک پہنچا اور مسلمانوں کا ربط و ضبط مختلف اقوام سے ہوا، تو اس قسم کے معاملات سامنے آئے جن کے متعلق نہ قرآن میں کوئی تفصیلی حکم موجود تھا اور نہ ہی احادیث میں ایسا حکم ملتا تھا۔ اس لئے فقہاء نے عقل اور رائے سے کام لے کر قرآن اور حدیث کے ملتے جلتے احکام سے زیرِ نظر معاملات کے متعلق نئے احکام مستنبط کئے، اس کا نام قیاس ہے۔ یعنی ایک بات سے دوسری بات کا اندازہ کرنا انگریزی میں اسے (ANALOGICAL REASONING) کہتے ہیں۔ اسے ایک مثال سے یوں سمجھو کہ قرآن کی رو سے خمر (شراب) ممنوع ہے۔ لیکن بھنگ کے متعلق قرآن اور حدیث میں بالصراحت کوئی حکم نہیں ملتا۔ اب ایک فقیہہ جو قیاس سے کام لے گا، وہ کہے گا کہ شراب اس لئے ممنوع ہے کہ اس میں نشہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر بھنگ میں نشہ ہے تو وہ بھی ممنوع ہے۔ اور اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ ہر نشہ آور شے ممنوع ہے۔ اس طرح استنباط مسائل کو اجتہاد بھی کہتے ہیں۔ جس کے معنی کوشش کرنا (TO EXERT) ہیں۔

قیاس کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں بھی دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ اسے قطعاً ناجائز قرار دیتا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم ایک مکمل کتاب ہے جس میں ہر بات کا حکم موجود ہے۔ لہٰذا شریعت کے معاملات میں قرآن نے قیاس کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ متقدمین میں ظاہری فرقہ کے مسلمان اسی خیال کے تھے[1] اور متاخرین میں پنجاب کے فرقہ، اہل قرآن نے اسی مسلک کو اختیار کیا تھا۔ لیکن نہ ظاہری مسلک زمین گیر ہو سکا، اور نہ ہی اہل قرآن کا فرقہ آگے بڑھ سکا۔ اس لئے کہ ان کا بنیادی تصور خود منشائے قرآنی کے خلاف تھا۔ اسی خیال کا ایک دوسرا گروہ وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ تنہا قرآن نہیں بلکہ قرآن اور حدیث دونوں کو اکٹھا کر لیا جائے تو ان میں معاملات کے احکام مل جاتے ہیں اور کوئی بات ایسی نہیں رہ جاتی جس کے لئے کسی نئے فیصلہ کی ضرورت پڑے۔ چنانچہ تمہیں یاد ہوگا کہ فسادات پنجاب کی تحقیقاتی عدالت میں محترم ابوالحسنات صاحب نے یہی کہا تھا کہ اسلام میں ہر معاملہ کے متعلق پہلے سے احکام موجود ہیں۔ اس لئے اس میں قانون سازی کی گنجائش ہی نہیں۔

جو لوگ قیاس کے حق میں ہیں وہ قرآن اور حدیث دونوں سے اپنے مسلک کی تائید پیش کرتے ہیں۔ البتہ ان میں اس باب میں اختلاف ہے کہ قیاس کی کہاں ضرورت پڑتی ہے اور وہ کس حد تک قابل اعتماد ہے۔ اہل حدیث حضرات کا عام طور پر یہ عقیدہ ہے کہ حدیث خواہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو، اسے قیاس پر ترجیح دی جائے گی۔ لہٰذا ان کے نزدیک قیاس کے ذریعہ اجتہاد کی وسعت بہت محدود ہے۔ ان کے برعکس، دوسرا گروہ (جنہیں اہل الرائے کہا جاتا ہے اور جن کے سرخیل امام ابوحنیفہ رح ہیں)۔ قیاس کو بڑی وسعت دیتا ہے۔ یہ مشہور ہے کہ امام ابوحنیفہ رح نے اپنی فقہ مرتب کرتے وقت احادیث سے بہت کم مدد لی ہے۔ اتنی کم کہ ان کے ہاں سترہ اٹھارہ حدیثوں سے زیادہ ملتی ہی نہیں۔ وہ قرآن کو سامنے رکھتے تھے اور اسی کی روشنی میں نئے نئے معاملات کے متعلق استنباطِ احکام کرتے تھے۔ اہل حدیث اور اہل الرائے حضرات میں یہی بنیادی وجۂ اختلاف ہے۔ چونکہ امام اعظم رح کوفہ کے رہنے والے تھے (اور کوفہ عراق میں ہے) اس لئے ان کے مسلک کو اہلِ عراق کا مذہب بھی کہتے ہیں (مذہب کے معنی (RELIGION) نہیں بلکہ (SCHOOL) کے ہیں) اہلِ حدیث اور اہل الرائے کے اس بنیادی اختلاف کے علاوہ خود اہل الرائے (اہلِ فقہ) کے مختلف مذاہب فکر (SCHOOLS OF THOUGHT) میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی وجہ ان کے ائمہ کے قیاس میں اختلاف ہے چنانچہ ہارٹن (HORTON) کی تحقیق کے مطابق نویں اور بارھویں صدی عیسوی کے دوران میں، مسلمانوں میں کم و بیش

---

[1] ظاہری فرقہ کا حدیث کے متعلق بھی یہ مسلک تھا (پرویز)

ایک سو فقہی مذاہب پیدا ہو چکے تھے اور علامہ اقبالؒ کی تصریح کے مطابق پہلی صدی ہجری کے وسط سے چوتھی صدی تک قریب انیس فقہی مذاہب وجود میں آچکے تھے۔ یہ تفاصیل علامہ اقبالؒ کے خطبات میں ملیں گی۔

لیکن تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ یہی اہل الرائے اور اہلِ قیاس حضرات، جنہوں نے اہلِ حدیث حضرات سے اس بنیادی نقطہ پر اختلاف کیا تھا کہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے نت نئے مسائل (PROBLEMS) سامنے آتے رہتے ہیں جن کے لئے فکر اور قیاس ہی سے احکامات مستنبط کئے جا سکتے ہیں، اس لئے اجتہاد ناگزیر ہے خود کچھ عرصہ کے بعد اس عقیدہ کے ہو گئے کہ اب آئندہ کے لئے اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ جو کچھ سوچا جانا تھا سوچا جا چکا۔ جتنا کچھ قیاس کیا جانا تھا کیا جا چکا۔ اب آنے والی نسلوں کے لئے اُنہی فیصلوں کی پابندی لازمی ہے جو ان کے ائمہ اسلاف کر چکے ہیں، وہ اُن سے اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتے۔ تم نے سلیم! اپنے ہاں "مقلد اور غیر مقلد" کی بحثیں سُنی ہوں گی۔ ان کے مناظرے دیکھے ہوں گے۔ مقلد یہی لوگ کہلاتے ہیں جو ائمہ اسلاف کے فیصلوں کی تقلید ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ غیر مقلد وہ ہوں گے جو اجتہاد کا دروازہ کھلا سمجھتے ہیں۔ بالکل نہیں۔ اجتہاد کا دروازہ تو ان میں سے کوئی بھی کھلا نہیں سمجھتا۔ نہ مقلد، نہ غیر مقلد۔ مقلد وہ ہیں جو ائمہ فقہ کے فیصلوں کی تقلید کرتے ہیں اور غیر مقلد وہ جو حدیث کی پیروی کرتے ہیں۔ اجتہاد کا سوال نہ اُن کے ہاں ہے نہ ان کے ہاں۔ یعنی اس اعتبار سے دونوں کا مقام ایک ہی ہے۔ دونوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جو فیصلے ہونے تھے ہو چکے۔ اب قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے انہی فیصلوں کا اتباع لازمی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ فیصلے فقہ کی کتابوں میں درج ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ یہ احادیث کے مجموعوں میں ہیں۔ ان مقلدین میں بھی مختلف گروہ ہیں۔ بعض صرف مطلق اجتہاد کے بند ہونے کے قائل ہیں اور بعض بہر نوع تقلید کے قائل۔ لیکن یہ فنی اور فروعی باتیں ہیں جن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بنیادی چیز وہی ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

تم یقیناً اس مقام پر پوچھو گے کہ اجتہاد کا دروازہ کھولنے والوں نے اُسے خود اپنے ہاتھوں سے بند کیوں کر دیا؟ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ لیکن سب سے بڑی (اور یوں سمجھو کہ آخری) وجہ زوالِ بغداد تھا۔ ملتِ اسلامیہ کا دینی مرکز تو مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا۔ بغداد کی تباہی کے بعد (جو تیرھویں صدی عیسوی میں ہوئی تھی) ان کی سیاسی مرکزیت بھی تباہ ہو گئی تھی اور اُمت میں ہر طرف انتشار ہی انتشار پھیل گیا تھا۔ ان حالات میں (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں)۔

اُمت کو مزید انتشار سے بچانے کے لئے جو سیاسی زوال کا فطری نتیجہ ہوتا ہے، قدامت پسند مفکرین نے

یہی سوچا کہ قوم میں معاشرتی وحدت کو قائم رکھا جائے اور اس کا یہی طریقہ تھا کہ شرعی مسائل کے متعلق جو فیصلے فقہائے اسلام پہلے کر چکے تھے، سب پر انہی کی پابندی لازم قرار دے دی جائے اور نئے فیصلوں کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ یعنی ان کے پیش نظر ملت کا معاشرتی نظم تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس باب میں کسی حد تک حق بجانب بھی تھے۔ اس لئے کہ جماعتی نظم زوال آور عناصر کی کچھ نہ کچھ روک تھام تو کر ہی دیتا ہے[1]۔

اُس وقت کے ارباب شریعت کے پیش نظر یہی مصلحت ہوگی۔ لیکن تم نے غور کیا سلیم! کہ اس وقتی مصلحت نے اسلام اور مسلمانوں کو کس قدر مستقل نقصان پہنچایا ہے؟ اس نے فکر کا دروازہ بند کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اُمّت میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی مفقود ہوگئی اور اسلام جو ایک حرکت (MOVEMENT) کا نام تھا منجمد اور متحجر (FOSSILISED) رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ مندرجہ بالا اقتباس کے تسلسل میں لکھتے ہیں:

(اس وقت کے ارباب شریعت نے اس مصلحت کو تو پیش نظر رکھا) لیکن انہوں نے اس حقیقت کو نہ سمجھا اور نہ ہی اسے ہمارے موجودہ علماء سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کے مستقبل کا انحصار ان کے جماعتی نظم پر اتنا نہیں ہوتا جتنا افراد کی قوت اور صلاحیت پر ہوتا ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں، جس میں جماعتی نظم پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے فرد کی انفرادیت کچل کر رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کے معاشرتی فکر کی دولت کا مالک تو بن جاتا ہے، لیکن اس کی اپنی روح مردہ ہو جاتی ہے۔ (یاد رکھئے) قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا۔

سلیم! ان الفاظ کو یوں ہی سرسری طور پر پڑھ کر آگے نہ بڑھ جانا۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے جسے حضرت علامہ اقبالؒ چند الفاظ میں بیان کر گئے ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے تم خود اپنے زمانے کی ان مذہبی جماعتوں پر غور کرو جو اسلام کے احیاء اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا دعویٰ لے کر اُٹھتی ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ:

۱۔ ان کی دعوت کا مرکزی نقطہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں اسلاف کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے۔ ہمیں اپنے ماضی کو دوبارہ زندہ کرنا چاہیئے ہماری ترقی کا راز اتباع سلف میں ہے۔ اور

۲۔ اگر کوئی شخص قوم کو غور و فکر کی دعوت دے تو اُن کی طرف سے فوراً یہ آواز بلند ہو جاتی ہے کہ اس

---

[1] خطبات صفحہ ۱۴۴-۱۴۳۔

فتنہ کو کچل دو۔ یہ اُمّت میں انتشار پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک نیا اسلام ایجاد کرنا چاہتا ہے۔

یعنی وہ اپنے جماعتی نظم کو اسلاف کے نام کی غلط تقدیس اور اُن کے مسلک کی متشدد تقلید کے زور پر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ تم اس قسم کے جماعتی نظم پر گہری نگاہ ڈال کر دیکھو، تمہیں نظر آجائے گا کہ اس میں افراد کی سوچنے کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ وہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت اسی میں سمجھتے ہیں کہ اپنے قائدین کے ہر حکم کی اطاعت کی جائے اور ان کے کسی فیصلے پر تنقیدی نگاہ نہ ڈالی جائے۔ وہ اپنے جماعتی تعصب کو مذہب سے والہانہ شیفتگی سمجھتے ہیں اور اور اس مقدس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہمارے اس جہاد سے ملّت کو عروج اور اسلام کو ترقی نصیب ہوگی۔ یہ وہ رجحان تھا جو زوالِ بغداد کے بعد پیدا ہوا اور ابھی تک بدستور چلا جا رہا ہے۔ بلکہ پاکستان میں بدقسمتی سے اسے اور بھی شدّت کے ساتھ اُبھارا جا رہا ہے۔ اسی کو علامہ اقبالؒ نے جماعتی نظم پر ضرورت سے زیادہ زور، ماضی کا جھوٹا احترام اور اس کا مصنوعی احیاء قرار دیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے کہا ہے "تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔ لہٰذا زوال آور عناصر کی روک تھام کا مؤثر طریقہ صرف یہ ہے کہ قوم میں بخود خریدہ (SELF CONCENTRATED) افراد کو پیدا کیا جائے۔ یہی وہ افراد ہیں جو زندگی کی گہرائیوں کے سربستہ راز کھولتے ہیں۔ وہ ایسے نئے معیارِ زیست سامنے لاتے ہیں جن کی روشنی میں ہم یہ دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہمارا ماحول ایسا غیر متبدّل نہیں کہ اسے چھوا تک نہ جائے تیرھویں صدی اور اُس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی غلط تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا (۱۴۸)

تصریحات بالا سے تم نے سلیم! دیکھ لیا ہوگا کہ قیاس، درحقیقت شرعی قوانین کی تدوین کا ایک طریقہ (PROCESS) تھا۔ اُن قوانین کا ماخذ (SOURCE) نہیں تھا۔ لیکن جب ہمارے دورِ انحطاط میں، فکر و تدبّر کا دروازہ بند ہو گیا تو یہی چیز قانونِ شریعت کا ماخذ قرار پا گئی یعنی اس وقت عقیدہ یہ پیدا کر لیا گیا کہ اسلاف نے اپنے قیاس (اجتہاد) سے جو مسائل مستنبط کئے تھے، وہ اخلاف کے لئے غیر متبدل قوانین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا فقہ کی کتابیں ہمارے قوانینِ شریعت کا سرچشمہ ہیں۔

قیاس کے بعد قوانینِ شریعت کا دوسرا ماخذ اجماع قرار دیا جاتا ہے۔ قیاس کے متعلق تو مختلف گروہوں کے

اختلاف ایسے شدید اور وسیع نہیں تھے لیکن اجماع کے متعلق صورت عجیب تر ہے۔ اوّل تو آج تک یہی طے نہیں پا سکا کہ اجماع سے مراد کیا ہے؟ اور جو کچھ طے پایا ہے اس میں مختلف گروہوں کا اختلاف بڑا گہرا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عہد حضرت عمرؓ تک اُمّت میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے نظام میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مسئلۂ خلافتِ حضرت علیؓ کے نام پر اُمّت میں سب سے پہلا اختلاف رونما ہوا۔ غیر شیعہ حضرات اس اختلاف کو سیاسی کہتے ہیں، لیکن شیعہ حضرات کے نزدیک یہ دینی مسئلہ تھا اور بڑا بنیادی۔ بہر حال مسئلہ سیاسی تھا یا دینی، اس کی وجہ سے جو اختلاف پیدا ہوا وہ غیر مندمل تھا۔ اس اختلاف کے بعد کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہو سکتا جس کے متعلق کہا جائے کہ اس پر پوری اُمّت کا اجماع تھا۔ لہٰذا اجماع سے مراد ساری اُمّت کا اجماع نہیں۔ فقہاء کے نزدیک کسی حکم شرعی پر کسی زمانہ میں مسلمان مجتہدین کا متفق ہو جانا اجماع کہلاتا ہے۔ واضح تر الفاظ میں اجماع کی فنی تعریف یہ ہے کہ:

> رسول اللہؐ کی وفات کے بعد کسی بھی دور میں اُمّتِ محمدیہ کے مجتہد کسی پیش آمدہ حادثہ پر خوب بحث و تمحیص کر کے ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پر ایک ہی جیسے الفاظ میں اعلان کریں۔ اس میں اگر کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا تو یہ اجماعِ حقیقی کہلائے گا۔

اس قسم کے اجماع کے شرعی دلیل ہونے یا نہ ہونے میں اختلافات تو ایک طرف، علماء کے ایک گروہ نے اسکے وجود کے امکان ہی سے انکار کر دیا ہے۔ اور بات ہے بھی ٹھیک۔ وہ کونسا مسئلہ ہے جس کے متعلق یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اُمّت میں اس قسم کا اجماع کبھی ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ائمہ نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اس قسم کے اجماع کا مدعی جھوٹا ہے۔

اجماع کی دوسری شکل یہ بیان کی جاتی ہے کہ چند مجتہد ایک بات کہہ کر اس دور کے تمام مجتہدوں میں مشتہر کر دیں۔ اگر کسی نے اس کے خلاف یا تائید میں کچھ نہیں کہا تو اسے اجماع سکوتی کہا جاتا ہے۔ یعنی اس کا چپ رہنا اس کی دلیل ہے کہ وہ اس سے متفق ہیں۔ ایک گروہ نے اس کے حجتِ شرعی ہونے سے انکار کیا ہے۔ دوسری طرف اس کے موافقین کا گروہ ہے کہ وہ منکرینِ اجماع کو کافر تک کہہ دیتے ہیں۔ بعض کے نزدیک صرف اہلِ مدینہ کا اجماع شرعی دلیل بن سکتا ہے، بعض کے نزدیک صحابہؓ کا اجماع۔ ان علماء کی بحثوں سے قطع نظر تم سیدھے سادے طور پر یہ سوچو کہ اُمّت میں فرقہ بندی کے بعد اگر کبھی کسی مسئلے میں اجماع ہو گا بھی تو وہ ایک فرقہ کے اندر ہی ہو گا۔ دوسرے فرقہ کا الگ وجود خود اس کی شہادت ہے کہ وہ ان کے کسی فیصلے کو حجت شرعی نہیں مانتا۔ اصل یہ ہے کہ جب

امّت میں پہلا تفرقہ (شیعہ اور غیر شیعہ کا) پیدا ہوا تو شیعہ قلیل تعداد میں تھے (اور ہمیشہ قلیل تعداد میں رہے ہیں) اور سُنیوں کی اکثریت تھی۔ پھر جب سُنیوں میں مختلف گروہ پیدا ہوئے تو ان میں اہل فقہ کی اکثریت تھی۔ اہلِ فقہ میں حنفیوں کی اکثریت تھی، ان کی اکثریت ہر دور میں رہی ہے اور آج بھی یہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا قریب دو تہائی حصّہ ہیں۔ اس لئے ان کی طرف سے اس قسم کی احادیث تائیداً پیش کی جاتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری اُمّت کا سوادِ اعظم کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگا۔[1] یہی جذبہ درحقیقت اجماع کے سرچشمۂ قانون قرار دئیے جانے کا محرک بھی ہے۔ اس اعتبار سے اجماعِ اُمّت سے مفہوم ہوگا اُمّت کے گروہِ عظیم کا فیصلہ یعنی حنفی مسلمانوں کا مسلک۔ یہ ظاہر ہے کہ ان کا ہر فیصلہ (غیر سُنّی تو ایک طرف خود سُنیوں میں بھی) نہ اہلِ حدیث کے نزدیک قانونِ شریعت قرار پاسکتا ہے نہ دیگر ائمہ فقہ، امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے متبعین کے نزدیک۔

یہ ہے اجماع کا مروجہ مفہوم اور اس کی عملی حیثیت۔

قیاس اور اجماع کے بعد، قوانینِ شریعت کا تیسرا ماخذ حدیث قرار دیا جاتا ہے۔ ویسے تو احادیث کے متعلق شروع ہی سے بڑی طول طویل بحثیں چلی آرہی ہیں، لیکن ہمارے زمانہ میں (بالخصوص پاکستان میں) اس سوال نے خاص اہمیّت حاصل کر لی ہے کیونکہ یہاں یہ عملی سوال سامنے آگیا ہے کہ اسلامی مملکت کی قانون سازی میں حدیث کا مقام کیا ہے؟ اس سوال کا ملّت کے سامنے آنا بڑی نیک فال تھا۔ لیکن جیسا کہ تم نے دیکھا ہے، بجائے اس کے کہ اس کے متعلق خالص علمی اور دینی انداز سے گفتگو کی جاتی، اسے سطحی جذبات میں اُلجھا دیا گیا اور (جیسا کہ میں قیاس کے عنوان میں بتا چکا ہوں) سرے سے اس سوال ہی کو ملّت میں مزید انتشار پیدا کرنے والا فتنہ قرار دے دیا گیا۔ بہرحال اس کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ملخص (مختصر الفاظ میں) یہ ہے کہ:

۱۔ حدیث، اسلامی قوانینِ شریعت میں ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو فیصلے احادیث میں آچکے ہیں وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدّل ہیں۔ ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ بعض حضرات حدیث کے ساتھ سنّت کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ سنّت کا مفہوم کیا ہے اور اس میں اور حدیث میں کچھ فرق ہے یا دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ان میں فرق ہے

---

[1] اجماع کے متعلق تفصیلی بحث اور اس حدیث پر تنقید کے لئے طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۵۴ء دیکھئے۔

حدیث ہر اس قول یا فعل کو کہتے ہیں جو رسول اللہؐ کی طرف منسوب ہو اور سنت حضورؐ کے ان ارشادات و اعمال کو کہا جائے گا جنہیں حضورؐ نے بہ حیثیت رسول اللہ ادا کہا یا کیا ہو۔ اسے حضورؐ کا ثابت شدہ طریقہ بھی کہا جاتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ ان میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں مرادف المعنیٰ ہیں۔

۳۔ سنت میں صرف رسول اللہؐ کی سنت ہی داخل نہیں بلکہ سنت خلفائے راشدینؓ بھی شامل ہے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ خلفائے راشدینؓ میں کون کون شامل ہیں۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ان سے صرف اوّلین چار خلفائے رسول اللہؐ مراد ہیں۔ دوسرے گروہ نے کہا ہے کہ نہیں! ان میں تمام وہ حکمران شامل ہیں جنہوں نے اُمّت کو اسلامی طریقہ پر چلایا یا جو آئندہ اسے اسلامی طریق پر چلائیں گے۔

۴۔ پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا رسول اللہؐ کا ہر قول یا فعل شرعی حیثیت رکھتا ہے یا ان میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ رسول اللہؐ اپنی رسالت سے پہلے دن سے زندگی کے آخری سانس تک بہرحال اور بہرحیثیت میں رسول تھے اس لئے حضورؐ کا ہر قول یا عمل شرعی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ نہیں! رسول اللہؐ نے جو کچھ بہ حیثیت رسولؐ فرمایا یا کیا تھا وہی دینی حیثیت رکھتا ہے۔ جو کچھ آپ نے اپنی بشری حیثیت یا تاریخ کے ایک خاص دور میں عرب کے باشندہ ہونے کی حیثیت سے کہا یا کیا تھا، وہ شرعی حیثیت نہیں رکھتا۔

۵۔ اس سے یہ سوالات پیدا ہوئے کہ

الف۔ کیا رسول اللہؐ کی سنت (یعنی آپ کا ثابت شدہ طریق) کسی کتاب میں منضبط ہے اور وہ کتاب تمام مسلمانوں کے نزدیک ایسی صحیح اور قابلِ اعتماد ہے کہ اس پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی؟

ب۔ کیا احادیث کی کوئی ایسی کتاب ہے جس کی ایک ایک حدیث بلاشک و شبہ رسول اللہؐ کی حدیث تسلیم کی جائے؟

ج۔ کیا کسی کتاب میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہؐ نے فلاں بات بہ حیثیت رسول فرمائی تھی اور فلاں بات عام بشری یا تاریخی فرد ہونے کی حیثیت سے کہی تھی؟

ایک گروہ نے یہ کہا کہ ہاں! ایسی کتاب (یا کتابیں) ہیں جن کی ایک ایک حدیث یقینی طور پر صحیح ہے اور (چونکہ رسول اللہؐ کی دو حیثیتیں تھیں ہی نہیں اس لئے) ہر حدیث، رسول ہی کی حیثیت سے ہے۔ لیکن دوسرے گروہ نے کہا کہ نہیں! جسے تم سب سے زیادہ صحیح اور قابلِ اعتماد مجموعہ (یعنی بخاری شریف) بھی قرار دیتے ہو اس میں صحیح اور غلط دونوں قسم کی احادیث موجود ہیں۔ اس لئے اس کی بھی ہر حدیث کو بلا تنقید صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ

۶۔ صحیح اور غلط حدیثوں کے پرکھنے کا معیار کیا ہے؟ ایک گروہ نے کہا کہ اسلاف ان معیاروں کو مقرر کر چکے ہیں اور ان کے مطابق حدیثوں کی جانچ پرکھ بھی کر چکے ہیں۔ لیکن دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ اُن معیاروں کے علاوہ ایک معیار یہ بھی ہے کہ بعض لوگوں میں اسلام اور سیرت نبویؐ کے مطالعہ سے ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ رسول اللہؐ کے مزاج شناس ہو جاتے ہیں۔ ان کی نگاہ فوراً بتا دیتی ہے کہ فلاں حدیث صحیح ہے اور فلاں غلط۔ حتیٰ کہ اگر کسی معاملہ میں کوئی حدیث نہ ملے تو بھی وہ بتا سکتے ہیں کہ اگر یہ معاملہ رسول اللہؐ کے سامنے پیش ہوتا تو حضور اس کے متعلق یہ فرماتے۔

۷۔ اس آخری بات سے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا زندگی کے تمام معاملات کے متعلق احادیث میں احکام مل جاتے ہیں یا ایسے معاملات بھی ہو سکتے ہیں جن کے متعلق احادیث میں پہلے سے احکام موجود نہیں۔ (جیسا کہ تم "قیاس" کے عنوان میں دیکھ چکے ہو) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ احادیث کے ذریعے دین مکمل ہو چکا ہے۔ اب کوئی معاملہ ایسا ہو نہیں سکتا جس کے متعلق پہلے سے فیصلہ موجود نہ ہو۔ لیکن دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ایسے معاملات ہو سکتے ہیں جن کے لئے پہلے سے فیصلہ موجود نہ ہو۔ ایسے امور کا فیصلہ اجتہاد سے کیا جائے گا۔

۸۔ یہ سوال بھی اُٹھا کہ احادیث میں جو فیصلے مذکور ہیں (خواہ انہیں بالکل صحیح بھی کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے) کیا وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے یا ان میں بہ تقاضائے حالات ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ نے یہ کہا کہ ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ نہیں! ان میں ایسے فیصلے بھی ہو سکتے ہیں جن میں تغیرِ حالات سے ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے۔

یہ ہے سلیم! مختصر طور پر خلاصہ ان مباحث کا جو حدیث کے متعلق ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ تمام باہمدگر مختلف خیالات، جن کا ذکر اُوپر کیا جا چکا ہے، ان حضرات کے ہیں جو اپنے آپ کو حدیث کے ماننے والے کہتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ شامل نہیں جنہیں "منکرین حدیث" کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ان تمام متضاد خیالات کے ماننے والے (جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے) "حدیث ماننے والے" تسلیم کئے جاتے ہیں تو "منکرین حدیث" صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی کے تمام معاملات کے متعلق تفصیلی فیصلے قرآن کریم کے اندر موجود ہیں۔ اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فلاں معاملہ کے متعلق رسول اللہؐ نے کیا فیصلہ فرمایا تھا۔ یہ گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اپنے آپ کو "اہلِ قرآن" کہتے ہیں (یعنی ان کے اصطلاحی معنوں میں اہلِ قرآن۔ ورنہ عام معنوں میں اہلِ قرآن تو ہر مسلمان ہے)۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ حدیث کے متعلق یہ بحثیں ہمارے زمانہ کی پیدا کردہ نہیں، یہ بہت پہلے سے چلی آ رہی ہیں۔

حنفیؒ کہ امام شافعیؒ (پیدائش ۱۵۰ھ ۔ وفات ۲۰۴ھ) نے اپنی مشہور کتاب (کتاب الام) میں ایک گروہ سے اپنے ایک مناظرے کی روئداد لکھی ہے جنہیں وہ "منکرین حدیث" کہتے ہیں۔

نیز یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ گزشتہ صفحات میں جن مختلف گروہوں کا میں نے ذکر کیا ہے یہ اہلِ سنّت والجماعت کے مختلف الخیال گروہ ہیں جو جمہور مسلمان کہلاتے ہیں۔ (ان میں مخصوص معتقدات کے فرقے مثلاً شیعہ یا احمدی[1] شامل نہیں)

حدیث کے متعلق جو مباحث تمہارے سامنے آچکے ہیں، ان سے تم نے سلیم! اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اس عقیدہ کو محض نظری طور پر متفقہ علیہ کہا جاسکتا ہے کہ حدیث قوانینِ شریعت کا ماخذ ہے۔ ورنہ عملاً آج تک متفقہ طور پر متعین ہی نہیں ہوسکا کہ کون سی احادیث قوانینِ شریعت کا ماخذ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان حضرات سے یہ سوال کیا جائے تو یہ اس کے متعین۔ واضح اور قطعی جواب سے ہمیشہ پہلوتہی کرتے ہیں اور "کتاب وسنت" کی غیر متعین اصطلاح سے آگے نہیں بڑھتے اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ جو تصریح ایک گروہ پیش کرے گا وہ دوسرے کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ آج تک تو یہ معاملہ مساجد اور مدارس کی چار دیواری تک محدود تھا۔ اس لئے کہ وہاں ہر گروہ اپنے اپنے مسلک کو حق قرار دیتا اور اس کی تبلیغ کرتا تھا۔ لیکن اب جب یہ سوال سامنے آیا کہ "ملک کا کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا"، تو لازماً یہ سوال بھی سامنے آنا چاہیئے تھا کہ سنت سے مراد کیا ہے۔ اس کے لئے دشواری یہ تھی کہ اس کا جو جواب ایک گروہ دے وہ دُوسرے گروہ کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ اس کا جواب ہی نہ دیا جائے۔ لیکن سلیم! تم سوچو کہ عملی دنیا میں کسی سوال کے جواب سے چشم پوشی کرنے سے کیسے کام چل سکتا ہے؟ اس سوال کا تعلق مملکت کی قانون سازی سے ہے۔ شخصی معاملات کی حد تک تو یہ کر دیا گیا ہے کہ "کتاب وسنت"، کی وہی تعبیر صحیح تسلیم کی جائے گی جو اس فرقے کے نزدیک قابلِ قبول ہوگی۔ لیکن جس معاملہ کا تعلق پورے ملک سے ہوگا، اس میں تو "کتاب وسنت" کی ایک ہی تعبیر قابلِ عمل ہوگی۔ سوچو سلیم کہ اس مقام پر کیا ہوگا؟

میں نے اس تفصیلی گفتگو کی ضرورت اس لئے سمجھی ہے کہ تم نے اپنے سوال کو اس ضمن میں پوچھا ہے۔ بہرحال اب آگے بڑھو۔

---

[1] اب احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا جاچکا ہے۔ (طلوع اسلام ۱۹۸۲ء)

قوانین شریعت کا چوتھا اور آخری ماخذ قرآن کریم ہے۔ تم یہ سمجھتے ہوگے کہ کم از کم قرآن کی حد تک تو تمام مسلمان (یعنی کم از کم سُنّی مسلمان) متفق ہوں گے۔ لیکن واقعۃً ایسا نہیں۔ ہماری بدقسمتی کی حد یہ ہے کہ ہمارے ہاں کتاب اللہ بھی اختلافی عقائد سے بلند نہیں رہی۔ یہ اختلافات مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہیں:-

۱۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہے۔ انہیں ثواب کی خاطر پڑھا جاتا ہے۔ لیکن دوسرے گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اس میں کوئی آیت منسوخ نہیں۔ ہر آیت اپنے مقام پر واجب العمل ہے۔

۲۔ ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ ایسی آیات بھی ہیں جن پر عمل تو ہوتا ہے لیکن وہ قرآن کے اندر موجود نہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس قسم کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔ ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں وحی پر مبنی ہیں۔ حدیث قرآن کے مجمل احکام کی تفصیل بیان کرتی ہے۔ دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ وحی صرف قرآن کے اندر ہے۔ احادیث، رسول اللہؐ کی خود متعین فرمودہ تفاصیل ہیں۔

۴۔ ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ احادیث، قرآنی آیات کو منسوخ کرسکتی ہیں۔ اس لئے کہ احادیث بھی قرآن کی طرح وحی پر مبنی ہیں۔ اسی طرح اگر کسی معاملہ میں قرآن اور حدیث میں تضاد نظر آئے تو حدیث کے فیصلہ کو ترجیح دی جائے گی لیکن دوسرا گروہ اس عقیدہ کو صحیح نہیں سمجھتا۔

۵۔ احکام کے علاوہ قرآن کی دیگر آیات کے متعلق بھی ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ ان کا جو مفہوم روایات میں بیان ہوا ہے وہی مفہوم صحیح اور حرف آخر ہے۔ اس سے کوئی الگ مفہوم لیا ہی نہیں جاسکتا۔ لیکن دوسرا گروہ کہتا ہے کہ جوں جوں زمانہ علم و انکشافات میں آگے بڑھتا جائے گا قرآن کے معانی کھلتے چلے جائیں گے۔ اس لئے اس میں ہر زمانہ میں تفکر و تدبّر کی ضرورت ہے۔

۶۔ ایک گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآنی احکام کی جو تفاصیل فقہ کی کتابوں میں آچکی ہیں وہی قابلِ قبول اور قیامت تک کے لئے واجب العمل ہیں۔ دوسرا گروہ اس عقیدے سے اختلاف رکھتا ہے۔

۷۔ چونکہ "اہل قرآن" کا ذکر پہلے آچکا ہے اس لئے اُن کے اس عقیدہ کا دُہرا دینا بھی ضروری ہے کہ تمام معاملات کی جملہ تفاصیل قرآن کے اندر آچکی ہیں۔ اس لئے قرآنی احکام کی تفاصیل کے لئے کسی اور طرف رجوع کرنا صحیح نہیں۔

ان تصریحات سے تم اندازہ کرلو سلیم! کہ اس عقیدہ کو، کہ "قرآن قوانینِ شریعت کا ماخذ ہے"، جب عملی آئینہ میں دیکھا جائے تو اس کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟

اس وقت تک میں نے یہ بتایا ہے کہ اس مسئلہ کی حقیقت کیا ہے کہ قوانین شریعت کے چار ماخذ ہیں - قرآن ، حدیث ، اجماع اور قیاس اور ان اربعہ عناصر کا مروجہ مفہوم کیا ہے - اب تمہیں یہ بتاؤں گا کہ جہاں تک میری قرآنی بصیرت میری راہ نمائی کرتی ہے ، اس مسئلہ کا صحیح مفہوم کیا ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی کا ٹھیک ٹھیک مقام کیا - ذرا غور سے سننا کہ اس کا تعلق اسلامی قوانین شریعت کے ایک ایسے بنیادی سوال سے ہے جس کے صحیح حل کے سامنے نہ ہونے سے اُمت اس قدر ذہنی انتشار اور عملی خلفشار میں مبتلا رہی ہے اور اب بھی ہے -

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے جس سے وہ زندگی کے معاملات کے فیصلے کرتا ہے ، لیکن جب دو انسانوں کے مفاد میں تصادم ہوتا ہے تو ہر ایک کی عقل اپنے حق میں فیصلہ دیتی ہے - یہی چیز دو افراد سے آگے بڑھ کر دو گروہوں میں ، اور پھر دو قوموں میں پیدا ہو جاتی ہے ، اور قوموں سے آگے بڑھ کر اقوام کے مخالف جتھوں میں - اس قسم کے معاملات کے تصفیہ کے لئے ، اور یہ بتانے کے لئے کہ انسانی زندگی کا مقصود و منتہٰی ، اور اس کا نصب العین کیا ہے ، اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ راہ نمائی دی ہے - یہ راہ نمائی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اور اس سے باہر اور کہیں نہیں - قرآن کی راہ نمائی چونکہ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے ہے ، اس لئے اس میں (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) صرف اصول بیان کئے گئے ہیں ، تاکہ ہر دور کے انسان اپنے اپنے زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان اصولوں کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل خود متعین کرتے رہیں -

ان جزئیات کے متعین کرنے کے طریق کے متعلق بھی قرآن نے راہ نمائی دے دی ہے اور وہ یہ کہ اُمت باہمی مشورے سے اس اہم فریضہ کو سرانجام دے - اس طریق پر سب سے پہلے رسول اللہؐ نے عمل فرمایا (واضح رہے کہ قرآن نے رسول اللہؐ کو خصوصیت سے اس کی تاکید کی تھی) حضورؐ کے بعد آپ کے خلفاء (جانشینوں) نے ایسا ہی کیا - اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ رسول اللہؐ نے قرآن کے اصولوں کے مطابق ایک حکومت قائم کی تھی - اور یہی حکومت آپ کے جانشینوں کی طرف منتقل ہوئی تھی - اس تصوّر کے ماتحت یہ حقیقت تمہاری سمجھ میں آجائے گی کہ کوئی حکومت ، اپنی پیشرو حکومت کی سنت (طرزِ عمل) سے مستغنی ہو نہیں سکتی - جب کوئی حکومت مسلسل قائم رہے تو سابقہ حکومتوں کے فیصلے آنے والی حکومتوں میں مسلسل نافذ العمل رہتے ہیں - یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ہر نیا حاکم ، سابقہ حاکم کے فیصلوں کو منسوخ کر کے تمام احکام از سرِ نو جاری کر دے - ایک نئی حکومت جو سابقہ حکومت کا تختہ اُلٹ کر قائم ہو ، اس طرح کرتی ہے ، لیکن ایک ہی انداز کی حکومت سابقہ فیصلوں کو علیٰ حالہٖ قائم رکھتی ہے تاآنکہ اُن میں کسی تبدیلی کی ضرورت پڑ جائے -

اُس وقت وہ اس میں مناسب تبدیلی کر دیتی ہے۔ بعینہٖ یہی انداز ہے جسے ہم رسول اللہؐ کے خلفاءؓ کے زمانے میں دیکھتے ہیں۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ حضورؐ کے جانشین (خلیفہ) مقرر ہوئے تو آپ نے اعلان کیا کہ میں قرآن کریم اور سنتِ رسول اللہؐ کا اتباع کروں گا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میں کسی نئی حکومت کی طرح نہیں ڈال رہا۔ میری حکومت سابقہ حکومت ہی کا تسلسل ہے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں سنت رسول اللہؐ اور سنت حضرت ابوبکرؓ کا اتباع کروں گا، اس سے بھی مقصود وہی تھا۔

اس حد تک تو بات صاف ہے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حضرات کو اگر کسی سابقہ فیصلے میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی تو کیا اُنھوں نے ایسی تبدیلی کی؟ تاریخ میں ہمیں متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں جن میں حضرت عمرؓ نے عہد رسالت مآبؐ کے اور عہد صدیقیؓ کے فیصلوں میں ضروری تبدیلیاں کیں (ان تبدیلیوں کی کچھ مثالیں سابقہ خط میں بیان کی جا چکی ہیں)۔ اس طرح یہ سلسلہ ماضی سے وابستہ بھی رہا اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ بھی دیتا چلا گیا۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے کوئی قوم جو تسلسلِ حیات چاہتی ہے اپنے ماضی سے اپنے آپ کو یکسر منقطع نہیں کر سکتی۔ لیکن ماضی سے وابستہ رہنا اور بات ہے اور ماضی کی زنجیروں میں جکڑے رہنا اور بات۔ ماضی سے وابستہ رہنے کا مفہوم یہ ہے کہ ہم اپنے سابقہ ادوار کے تجربوں سے مستفید ہوتے رہیں۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ جہاں زمانے کے تقاضے کسی تبدیلی کے متقاضی ہوں وہ تبدیلی بھی روا نہ رکھی جائے۔ یاد رکھو سلیم! غیر متبدل صرف وہ راہ نمائی ہے جسے خدا نے ہمیشہ کے لئے اور تمام نوعِ انسان کے لئے شمعِ راہ بنایا ہے۔ اس راہ نمائی کا مقصود یہ ہے کہ انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما کر کے اُنہیں تکمیل تک پہنچایا جائے۔ یہ اُسی صورت میں ممکن ہے کہ اُنہیں مواقع بہم پہنچائے جائیں کہ وہ علم و بصیرت اور غور و تدبر سے زمانہ کے بڑھتے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا حل خود تلاش کریں۔ اگر اُنہیں زندگی کے ہر مسئلہ کے متعلق بنے بنائے قوانین دے دیئے جائیں اور اُنہیں قیامت تک کے لئے غیر متبدل قرار دیدیا جائے تو اُنہیں اپنی فکری صلاحیتوں کی نشو و نما کا موقع کہاں ملے گا؟ نبوت کا دروازہ بند کرنے سے مقصد ہی یہ تھا کہ ذہنِ انسانی کی کھڑکیاں کھول دی جائیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں سلیم! ایک مرتبہ پھر اس نقشے کو سامنے لاؤ جس کے مطابق عہد رسالتمآبؐ اور عہد خلفاء راشدین میں معاملات زندگی کے متعلق فیصلے مرتب اور صادر ہوتے تھے۔ اس نقشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ:

۱۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں جب کوئی معاملہ پیش ہوتا تو یہ دیکھا جاتا کہ قرآن کریم نے اس کے متعلق کیا ہدایت دی ہے۔ اس ہدایت کی روشنی میں حضورؐ اپنے صحابہؓ کے مشورے سے معاملہ کی جزئیات طے فرماتے۔

۲۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں جب کوئی معاملہ پیش ہوتا تو دیکھا جاتا کہ حضورؐ کے زمانہ میں اس کے متعلق کوئی فیصلہ ہوا تھا؟ اگر کوئی فیصلہ موجود ہوتا اور اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تو اُسے اختیار کر لیا جاتا، ورنہ طریق بالا کے مطابق اس کی جزئیات خود طے کر لی جاتیں۔ اس کا نام اتباع کتاب وسنت تھا۔

۳۔ یہی انداز حضرت عمرؓ کے زمانہ میں رہا۔ اس میں رسول اللہؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کے فیصلوں کی طرف رجوع کیا جاتا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ بڑھا، دوسری قوموں سے ربط وضبط پیدا ہوا، معاملات کی نوعیت بدل گئی، بعض حالات میں تغیرّ واقع ہو گیا۔ اس لئے آپ کو بکثرت نئے فیصلے بھی کرنے پڑے اور کئی ایک سابقہ فیصلوں میں ترمیمات بھی کرنی پڑیں۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ اس اندازِ حکومت میں کس طرح قرآن، سنت، اجماع اور قیاس چاروں اپنے اپنے مقام پر آجاتے ہیں۔ کتاب اللہ کی اصولی راہ نمائی۔ سابقہ حکومت کے فیصلے (سنت)، ان کی روشنی میں نئے معاملات کے لئے ازروئے قیاس نئے فیصلے، یا سابقہ فیصلوں میں تبدیلی، اور امت کے مشاورتی نظام کے تحت ان فیصلوں کا اجراء (اجماع)۔ یہ تھا اُس وقت صحیح مفہوم کتاب وسنت، اجماع اور قیاس کا۔

جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں جب ایک انداز کی حکومت مسلسل آگے چلتی جائے تو اس میں سابقہ فیصلوں سے مستغنی ہوا ہی نہیں جا سکتا۔ اس میں سابقہ فیصلے بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان میں نئے فیصلوں کا اضافہ بھی ہوتا جاتا ہے اور عندالضرورت سابقہ فیصلوں میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اگر خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ بدستور جاری رہتا تو حکومت کا یہی نقشہ آگے بڑھتا چلا جاتا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی حکومت تو آگے چلی لیکن اس کا انداز مختلف ہو گیا۔ یہی انداز مختلف اسلامی ممالک میں اسوقت تک چلا جا رہا ہے۔ اب اگر کسی خطۂ زمین کے مسلمان چاہیں کہ اپنے ہاں اُسی پہلے انداز کی حکومت (خلافت علیٰ منہاج رسالت) قائم کریں تو ان کے ہاں قانون سازی کی وہی صورت پیدا ہو جائے گی جو اس زمانہ میں تھی۔ اس میں کتاب اللہ کی راہ نمائی کو مستقلاً سامنے رکھا جائے گا۔ پھر یہ دیکھا جائے گا کہ معاملہ پیش نظر کے لئے سابقہ دور کے تاریخی نوشتوں میں کوئی نظائر (PRECEDENTS) ملتے ہیں یا نہیں۔ اگر ملتے ہوں اور زمانہ کے اتنے بُعد کے باوجود ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہو تو انہیں علیٰ حالہ اختیار (ADOPT) کر لیا جائے گا۔ اگر ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہو گی تو تغیرّ حالات پر قیاس کر کے، مناسب تبدیلی سے اسے (ADOPT) کر لیا جائے گا۔ یا عندالضرورت کوئی نیا فیصلہ کر لیا جائے گا۔ اور جب اس فیصلہ کو مرکز ملت (اسلامی نظام یا حکومت) کی طرف سے نافذ کیا جائے گا تو اس پر سب کا اجماع بھی ہو گا۔ یہ عملی مفہوم ہو گا سلیم! کتاب وسنت

اجماع اور قیاس۔ اس میں تم دیکھو گے کہ نہ کسی قسم کی کوئی اُلجھن پیش آتی ہے نہ سلوٹ، نہ فرقہ بندی کی گنجائش رہتی ہے نہ مختلف فقہی مذاہب کی ضرورت۔ سب کی راہ نمائی کے لئے ایک کتاب۔ نمائندگان ملت پر مشتمل ایک پارلیمان جو قیاس اور اجتہاد کے فرائض سرانجام دے۔ اس نظام کی مرکزی اتھارٹی کی طرف سے جاری شدہ فیصلے سب کیلئے واجب التسلیم! اور ثبات و تغیر کے اس حسین امتزاج کو لئے ہوئے اسلامی نظام اُمت کا، رواں دواں آگے بڑھتے جانا۔

تصریحات بالا سے تم نے دیکھ لیا ہو گا کہ جہاں تک قانون شریعت کے ماخذ کا تعلق ہے اُس کا درحقیقت ماخذ ایک ہی ہے یعنی کتاب اللہ۔ باقی تینوں شقیں دراصل قانون کی تدوین یا تنفیذ کے طریقے ہیں۔ کتاب اللہ کی روشنی میں کئے ہوئے سابقہ فیصلوں کو علیٰ حالہٖ نافذ کر دینا، اتباعِ سنت کہلائے گا۔ نئے معاملات پر غور و خوض کرنا اجتہاد یا قیاس ہو گا۔ اور اُمت کے مشورے سے فیصلوں تک پہنچنا اور اُنہیں نافذ کرنا اجماع کہلائے گا۔ لہٰذا اسلامی قانونِ شریعت کا ماخذ صرف قرآن ہے اور یہی مفہوم ہے حسبنا کتاب اللہ کا۔

والسلام

پرویز

جون ۱۹۵۶ء

چھبیسواں خط

پاکستان میں قانون سازی کا اُصول

سلیم! مجھے پہلے ہی اس کا احساس تھا کہ تم اس ضمن میں مزید استفسارات کرو گے۔ اس لئے کہ ایک تو اسلامی مملکت میں قانون سازی کے اصول کا مسئلہ ویسے ہی بڑا اہم ہے، دوسرے، پاکستان میں یہ سوال نظری حیثیت سے آگے بڑھ کر عملی شکل اختیار کر چکا ہے۔ لہٰذا تمہارے جیسے متجسس قلوب کا اضطراب قابل فہم ہے۔ اس سلسلہ میں جو کچھ گزشتہ دو خطوط میں لکھا جا چکا ہے اسے بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اُن میں سے کئی ایک باتیں اس خط میں دوبارہ آجائیں گی کیونکہ اُن کے دُہرائے بغیر بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اب تم غور سے سنو کہ اسلامی مملکت میں قوانین کس اصول کے مطابق وضع ہونگے۔

تم خارجی کائنات پر غور کرو۔ اس میں، ہر چیز میں، ہر آن کوئی نہ کوئی تغیّر واقع ہوتا رہتا ہے۔ یَسْئَلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِىْ شَاْنٍ (۵۵/۲۹)۔ کائنات کی ہر شے اپنی زیست اور نشوونما کے لئے ربوبیت خداوندی کی محتاج ہے۔ لیکن ان کی نشوونما کے تقاضے ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔ یہی وہ ہر آن کا تغیّر (CHANGE) ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؏

ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

مادّی تصوّرِ حیات (یعنی MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE۔ جس کی مظہر مغرب کی تہذیب ہے) کی رُو سے انسان بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح ایک مادّی تخلیق ہے۔ اور اس کے تقاضے، اس کے جسم کے تقاضے

ہیں۔ انسانی جسم کچھ عرصہ کے بعد مضمحل ہو کر بے جان لاش بن جاتا ہے اور اس کے ساتھ انسان کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسانی جسم، یعنی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے انسان کے پاس عقل موجود ہے۔ عقل کی رُو سے ایسے قوانین مرتب کئے جا سکتے ہیں جو انسانی معاشرے میں تنظیم و ضبط قائم رکھیں اور عقل ہی کی رُو سے ان میں تبدیلیاں بھی کی جا سکتی ہیں۔ یعنی جس طرح انسان میں کوئی شے غیر متبدل نہیں اسی طرح اُن قوانین میں بھی کوئی عنصر غیر متبدل نہیں جو انسانی زندگی کو (REGULATE) کرنے کے لئے بنائے جائیں۔ (جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے) اس تصور کو مادی تصورِ حیات کہتے ہیں اور اس اندازِ تقنین (قانون سازی) کو سیکولر (SECULAR)۔

اس کے برعکس اسلام کا تصورِ حیات یہ ہے کہ انسان عبارت ہے جسم اور ذات (PERSONALITY) سے۔ اس کا جسم دیگر اشیائے کائنات کی طرح قوانینِ طبیعی کے مطابق نشوونما پاتا اور زندہ رہتا ہے۔ اس میں ہر آن تغیر ہوتا رہتا ہے ایسا تغیر۔۔ کہ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ ہر سات سال کے بعد، انسان کا سابقہ جسم، کلیتہً ایک نئے جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیکن انسانی ذات، کہ جسے قرآن روحِ خداوندی (DIVINE ENERGY) کہہ کر پکارتا ہے، غیر متبدل ہے۔ وہ شروع سے آخر تک ایک ہی رہتی ہے۔ اس میں کوئی تغیر نہیں ہوتا حتّٰی کہ جسم کی طبیعی موت بھی اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے[1]۔ انسان کی طبیعی زندگی سے مقصود اس ذات کی نشوونما ہے۔ کامیاب زندگی وہی کہلا سکتی ہے جس میں انسانی ذات کی نمود اور بالیدگی ہو جائے۔ ؎

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

لہٰذا، انسان عبارت ہے ثبات و تغیر سے۔ یہ (PERMANENCE AND CHANGE) دونوں کا مظہر ہے۔ علامہ اقبالؒ اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے، لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی

---

[1] انسانی ذات کے متعلق تفصیلی گفتگو جلد اوّل میں کی جا چکی ہے۔

زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیر کا امکان ہی نہیں۔ تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و منصلب بن کر رہ جائے گی۔[1]

جہاں تک تغیر کا تعلق ہے، اس سے متعلق قوانین عقل کی رُو سے مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ثبات (PERMANENCE) سے متعلق قوانین عقل کی رُو سے نہیں مل سکتے۔ یہ عقل کے بس کی بات نہیں۔ یہ قوانین وحی کی رُو سے ملتے ہیں، انہیں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) یا کلمٰت اللہ کہا جاتا ہے۔ عقل کی رُو سے مرتب کردہ ضوابط میں تبدیلی ہو سکتی ہے لیکن مستقل اقدار میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (۱۰/۶۴)

لیکن انسانی جسم اور اس کی ذات کو الگ الگ شعبوں (COMPARTMENTS) میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا اس لئے ثبات اور تغیر سے متعلق قوانین و ضوابط بھی ایک دوسرے سے غیر متعلق اور الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ انسانی عقل اگر وحی (کلمٰت اللہ) کی راہ نمائی میں کام کرے تو اس طریق سے وہ قوانین مرتب کئے جا سکتے ہیں جن کا اطلاق انسان پر تماماً (MAN AS A WHOLE) کیا جا سکتا ہے اور جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے اس کے جسم اور ذات کے تقاضے پورے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جس زمانے سے انسان نے تمدنی زندگی بسر کرنی شروع کی ہے، اسے وحی کی راہنمائی ملتی چلی آ رہی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ابتدائی دور میں انسان میں علم و تجربہ کی کمی تھی، اس لئے اس کی عقل نے پختگی اختیار نہیں کی تھی۔ اس زمانے میں وحی کا انداز یہ تھا کہ مستقل اقدار کے ساتھ ساتھ وہ تغیر پذیر قوانین بھی وحی کی رو سے دے دیئے جاتے تھے جنہیں سن شعور میں پہنچنے کے بعد عقل خود وضع کر سکتی تھی۔ مثلاً جب انسان کو پہلے پہل کشتی بنانے کی ضرورت لاحق ہوئی تو اس کا طریق بھی وحی ہی کو بتانا پڑا۔ چنانچہ قصۂ حضرت نوح علیہ السلام کے ضمن میں قرآن میں ہے کہ فَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡہِ اَنِ اصۡنَعِ الۡفُلۡکَ بِاَعۡیُنِنَا وَ وَحۡیِنَا (۲۳/۲۷)۔ ہم نے اس کی (نوحؑ کی) طرف وحی بھیجی کہ وہ ہماری زیر نگرانی ہماری وحی کے مطابق کشتی بنائے۔ جوں جوں عقل انسانی میں پختگی آتی گئی ان تغیر آشنا تفاصیل میں کمی ہوتی گئی۔ لیکن مستقل اقدار بدستور اپنی جگہ قائم رہیں۔ یہ اقدار یا کلمٰت اللہ آخری مرتبہ قرآن کے اندر محفوظ کر کے دے دیئے گئے اور ان کی روشنی میں جزئی قوانین کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ باہمی مشاورت سے مرتب کئے جایا کریں۔

---

[1] تشکیل الٰہیات جدید، خطبہ ششم۔

چنانچہ نبی اکرمؐ سے ارشاد ہوا کہ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) اور حضورؐ کے بعد جس منہاج پر اُمّت نے چلنا تھا اُس کے متعلق کہا گیا کہ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)۔ اس اجمال کی تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی ہوگی کہ اسلام کی رو سے، انسانی زندگی عبارت ہے ثبات اور تغیّر سے، اس لئے جن قوانین کے تابع انسان کو (اسلامی انداز کی) زندگی بسر کرنی ہوگی، وہ بھی ثبات اور تغیّر کے مظہر ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ ان قوانین میں کون سا عنصر غیر متبدّل رہے گا اور کون سے اجزاء ایسے ہوں گے جن میں حالات کے تقاضے سے تبدیلی کی جا سکے گی۔ یہی ہے وہ اصل سوال جو اس ضمن میں ساری بحث کا نقطۂ ماسکہ ہے، اور جس کے صحیح حل پر اسلامی قوانین کی تدوین کا دارومدار ہے۔ لہٰذا اس سوال کی اہمیت ظاہر ہے۔ لیکن تم اس سوال کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکو گے، جب تک تمہیں یہ نہ بتا دیا جائے کہ اس وقت پاکستان میں جو مختلف گروہ (یا فرقے) ہیں ان کا اس باب میں کیا عقیدہ اور خیال ہے۔ (واضح رہے کہ میں اس وقت ان مختلف فرقوں کے عقائد یا خیالات پر کسی قسم کی تنقید نہیں کرنا چاہتا، میں صرف اُنہیں علیٰ حالہٖ پیش کر دینا چاہتا ہوں تاکہ اُن کے خیالات تمہارے سامنے آجائیں)۔

جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں، پاکستان میں ایک گروہ وہ ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ ایک اسلامی مملکت کو جس قدر قوانین کی ضرورت ہے وہ سب کے سب ہماری فقہ کے اندر آچکے ہیں اور ان میں کسی قسم کا ردّوبدل نہیں کیا جا سکتا۔ مملکت کا فریضہ قانون سازی نہیں۔ اس کا کام یہ ہے کہ جو سوال سامنے آئے اس کے متعلق علمائے فقہ سے پوچھ لے کہ اس کی بابت فیصلہ کیا ہے اور اس کے بعد اس فیصلہ کو ملک میں نافذ کر دے۔ چنانچہ (فسادات پنجاب کے سلسلہ میں) جسٹس منیر کی عدالت میں، اسی گروہ کے ایک نمائندے نے اس مسلک کو پیش کیا تھا جس پر جسٹس موصوف نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ اگر صورتِ حال یہ ہے تو پھر مملکتِ پاکستان کو کسی لیجسلیٹو اسمبلی کی ضرورت ہی نہیں۔ اسے صرف ہیئتِ مجریہ (EXECUTIVE MACHINERY) کی ضرورت ہے۔

ان کے برعکس ایک گروہ ایسا ہے جو اس مسلک کو "بے روح مذہبیت" قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس میں:

> اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے، جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہدِ گزشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے[1]۔

---

[1] سیاسی کشمکش، حصّہ سوم، (ابوالاعلیٰ مودودی)، رسالہ ترجمان القرآن، محرم ۱۳۶۰ھ، صفحہ ۳۶۔

اس گروہ کا کہنا یہ ہے کہ :

مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو، زمان اور مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا، نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے[1]۔

پہلے گروہ (یعنی فقہی فیصلوں کو ناقابلِ تغیر سمجھنے والوں) کے متعلق علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبہ میں (جس کا حوالہ اُوپر دیا جا چکا ہے)، بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں :

سُنّی حضرات نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد (یعنی اجتہادِ مطلق) ممکن ہے۔ لیکن ائمۂ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے، اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، اُن کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں جس کی بنیاد قرآن پر ہو، جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصوّر کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں :

آیئے! اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں، جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلے میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کیلئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی میں ہمارے فقہاء نے، قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ ان ہی فقہا کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا۔ لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب اپنی اپنی جگہ مکمّل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں کبھی بھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے پچھلے صفحات میں ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشوونما اور ارتقاء سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے

---

[1] تفہیمات، حصہ دوم، صفحہ ۲۷۴، ابوالاعلیٰ مودودی۔

مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہب فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی، کامل اور سہو و خطا سے مبرا سمجھا؟ کبھی نہیں اسلئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں، لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستہ میں روک نہیں بن سکتے۔

اب آگے بڑھو!

ایک اور مکتب ہے جس کا کہنا ہے کہ فقہ نہیں، بلکہ احادیث نبوی میں جو کچھ آگیا ہے وہ غیر متبدل ہے۔ اسے جوں کا توں نافذ کیا جانا چاہئے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ:

> تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر پڑتا ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا۔ قرآن اختلافِ تاویل کے باوجود خدا کا کلام ہے اور شرعاً حجت۔ اسی طرح حدیث، تحقیق و تثبیت کے باوجود خدا کی طرف سے وحی ہے اور دین میں قرآن کے بعد حجت[1]

اس اقتباس میں کہا گیا ہے کہ حدیث، قرآن کے بعد حجت ہے۔ لیکن اس کی وضاحت میں وہ کہتے ہیں کہ یہ بات کہ حدیث کا درجہ قرآن کے بعد ہے، اصولی حد تک تو درست ہے۔ جہاں تک استدلال اور اخذِ مسائل کا تعلق ہے:

> ہمارے نزدیک حدیث وحی ہے اور اسی طرح آنحضرت ؐ کو اس کا علم دیا گیا ہے جیسے قرآن کا۔۔۔ جبریل قرآن اور سنّت، دونوں کو لے کر نازل ہوتے اور آنحضرت ؐ کو سنّت بھی قرآن کی طرح سکھاتے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔ قرآن اور حدیث دونوں ماخذ ہیں اور بیک وقت ماخذ ہیں[2]

احادیث کے مجموعوں میں سے صحیحین (یعنی بخاری اور مسلم) کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ

---

[1] جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث، مولانا محمد اسمٰعیل السلفی، صفحہ ۴۸۔

[2] جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث، مولانا محمد اسمٰعیل السلفی، صفحہ ۶۰۔

اُمت نے صحیحین کی متفقہ روایات کو اجماعاً قبول فرمایا۔ ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔[1]

لیکن اس کے برعکس دوسرا مکتبِ خیال ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ

> احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمانِ صحت ہے نہ کہ علم یقین۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرہ میں ڈالنا ہرگز پسند نہیں کرتا کہ جو امور اس کے دین میں اتنے اہم ہوں کہ ان سے کفر و ایمان کا فرق واقع ہوتا ہو انہیں صرف چند آدمیوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے۔[2]

اسی بناء پر وہ کہتے ہیں کہ

> یہ مواد اس حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سنتِ نبویؐ اور آثارِ صحابہؓ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب خیال کیا جائے۔ مگر اس قابل نہیں کہ بالکل اسی پر اعتبار کر لیا جائے۔[3]

امام بخاری کے مجموعۂ احادیث کے متعلق ان کا کہنا یہ ہے کہ

> یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں اُن کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔[4]

جن احادیث کو یہ حضرات صحیح مانتے ہیں اُنہیں بھی دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں: ایک وہ جن کے احکام میں ردّ و بدل نہیں ہو سکتا، اور دوسری وہ جن میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے اپنے الفاظ ہیں:

> اب رہ گئے احکام، تو قرآن مجید میں ان کے متعلق زیادہ تر کلّی قوانین بیان کئے گئے ہیں اور بیشتر امور میں تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبیؐ نے عملاً ان احکام کو زندگی کے معاملات میں جاری فرمایا اور اپنے عمل اور قول سے ان کی تفصیلات ظاہر فرمائیں۔ ان تفصیلات میں سے بعض ایسی ہیں جن میں ہمارے اجتہاد کو کوئی دخل نہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ جیسا عمل حضورؐ سے ثابت ہے، اس کی پیروی کریں۔ مثلاً عبادات کے احکام۔ اور بعض تفاصیل ایسی ہیں کہ ان سے

---

[1] جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث، مولانا محمد اسمٰعیل السلفی صفحہ ۵۵۔

[2] رسائل و مسائل، ابو الاعلیٰ مودودی، صفحہ ۶۷۔

[3] تفہیمات، حصّہ اوّل، صفحہ ۳۲۲، ابو الاعلیٰ مودودی۔

[4] ترجمان القرآن، بابت اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۱۷۔

ہم اصول اخذ کر کے اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کر سکتے ہیں۔ مثلاً عہدِ نبوی ؐ کے قوانینِ مدنی [۱]

چونکہ اس وقت زیرِ غور مسئلے کا تعلق قوانینِ مدنی سے ہے، اس لئے (مندرجہ بالا اقتباس کی رو سے) اس بارے میں ان حضرات کا مسلک یہ ہے کہ جو مدنی قوانین رسول اللہ ؐ نے مرتب فرمائے تھے، اُن سے اصول اخذ کر کے ہم اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کر سکتے ہیں۔

اسی عقیدہ کی وضاحت دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کی گئی ہے:

یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غائت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لیکر اپنے احکام کی بجاآوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام حالات میں اس کے مقصد کو پورا کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیرِ حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے جو حالات عہدِ رسالت ؐ اور عہدِ صحابہ ؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے، لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانے اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں، ان کو، ہُو بہُو، تمام زمانوں میں، تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح و حکم کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں کسی قسم کا ردّو بدل نہ کرنا، ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں.... پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو ایک طرف، صراحۃ النص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی۔ اور تفقہ کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیرِ احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا رہے جو شارع کے اصولِ تشریع پر مبنی اور اس کے طرزِ عمل سے اقرب ہو۔ [۲]

یہ مسلک یا عقیدہ نیا نہیں، بلکہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال ؒ نے خطبۂ ششم میں کہا ہے کہ امام ابوحنیفہ ؒ اور شاہ ولی اللہ ؒ محدث دہلوی کا یہی مسلک تھا اور اسی کے مؤید خود علامہ اقبال ؒ تھے۔ وہ اس باب میں لکھتے ہیں کہ

احادیث کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے، اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے

---

[۱] تفہیمات، حصہ اوّل، ابوالاعلیٰ مودودی، صفحہ ۳۳۲ - ۳۳۳ -

[۲] تفہیمات حصہ دوم، ابوالاعلیٰ مودودی، صفحہ ۳۲۷ - ۳۲۸ -

عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم ورواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا، نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم ورواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہ رکھا (خواہ اُن کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی اُن کا استصواب فرما دیا ہو) اُنہیں ہمیشہ کے لئے نافذالعمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریقِ تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات واطوار اور رسوم ورواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اوّلین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں، وضع کر لیں۔ لہذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور اُنہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسان کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات وخصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اُس وقت اُس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رو سے رسول کے احکام اُس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذّات نہیں ہوتی، اُنہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؓ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ اُنہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ اُن کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اوّل تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ اُن کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے اُن کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحب تک پہنچ نہیں پائے تھے یا اُن میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں تو اگر امام صاحب اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے۔ جیسا کہ امام مالکؒ اور اُن کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث

کے متعلق، جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنّن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقنّنین میں ہوتا ہے۔[۱]

اپنے اس مسلک کی تائید میں ان حضرات کے پاس قرآنی دلائل و بیّنات ہیں (ان کی تفصیل چوبیسویں خط میں دی جا چکی ہے) جن کا ملخص (SUMMARY) حسبِ ذیل ہے:

۱۔ اسلام میں اصلًا و اساسًا اطاعت صرف قوانین خداوندی کی ہے جو کتاب اللہ کے اندر مذکور ہیں۔ سورۂ انعام میں ہے:

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (۶/۱۱۵)

کیا میں (یعنی رسول اللہؐ) خدا کے سوا کسی اور کو حاکم بنا لوں؟ حالانکہ اُس نے تمہاری طرف وہ کتاب نازل کر دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کر دیتی ہے۔

۲۔ جو اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں ہے۔

سورہ مائدہ میں ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جو خدا نے نازل کیا ہے، تو یہی لوگ کافر ہیں۔

۳۔ لیکن خدا کی یہ اطاعت انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ یہ نہیں کہ ہر شخص اپنے سامنے قرآن رکھ لے اور جس طرح سے جی چاہے اُسکی اطاعت کرتا رہے۔ یہ اطاعت اجتماعی حیثیت سے ایک نظام کے تابع ہو گی جس کا مرکز اوّل رسولؐ کی ذات تھی لہذا اللہ کی اطاعت بواسطہ رسولؐ کے ہوتی تھی۔ سورۂ نساء میں ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴/۸۰)۔

جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔

رسولؐ کے لئے ضروری تھا کہ وہ ہر معاملہ کا فیصلہ قرآن کی رو سے کرتا۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)

---

[۱] خطبات اقبال، صفحہ ۱۶۲-۱۶۴۔

۴۔ لیکن کتاب اللہ کی صورت یہ ہے کہ اس میں (بجز چند مستثنیات) عام طور پر اصولی قوانین دیئے گئے ہیں۔ ان قوانین کی جزئیات متعین نہیں کی گئیں۔ یہ اصولی احکام مکمل اور غیر متبدّل ہیں۔ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶) ''تیرے رب کے قوانین صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ ان میں تبدیلی کرنے والا کوئی نہیں۔

۵۔ ان جزئیات کو غیر متعین اس لئے چھوڑا گیا ہے کہ اگر انہیں بھی وحی کی رو سے متعین کر دیا جاتا تو یہ بھی ہمیشہ کیلئے غیر متبدّل ہو جاتیں۔ ان کا غیر متبدّل رکھنا منشائے خداوندی نہیں تھا۔ چنانچہ سورۂ مائدہ میں ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (۵/۱۰۱)

اے ایمان والو! تم ایسی باتیں نہ پوچھا کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار گذریں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تم ان کے متعلق ایسے وقت میں پوچھو گے جب قرآن نازل ہو رہا ہے تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔ (بہر حال، اب تک جو کچھ تم کر چکے ہو) اللہ اس سے درگزر کرتا ہے، اللہ غفور و حلیم ہے۔

اس سے آگے ہے:

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ (۵/۱۰۲)

تم سے پہلے ایک قوم (بنی اسرائیل) نے اس قسم کی باتیں (کرید کرید کر) پوچھی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے (کچھ وقت کے بعد) اُن سے صاف انکار کر دیا اور سرکشی برتنے لگے)۔

اس آیت کی تفسیر میں نبی اکرمؐ کی ایک حدیث نقل کی جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوْهَا وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَهِكُوْهَا وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا۔ وَسَكَتَ عَنْ اَشْيَاءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْهَا۔

اللہ نے کچھ باتوں کو فرض قرار دیا ہے انہیں ضائع مت کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اُن کے پاس تک نہ پھٹکو۔ کچھ حدود متعین کی ہیں اُن سے تجاوز مت کرو۔ اور باقی چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے ان کے متعلق کرید مت کرو۔ یاد رکھو جن چیزوں کے متعلق اللہ نے خاموشی اختیار کی ہے اُس نے دانستہ ایسا کیا ہے۔ یہ نہیں ہوا کہ اُس سے (معاذ اللہ) بھول ہو گئی ہے۔

۶۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن میں بیان کردہ غیر متبدّل اصولوں کی روشنی میں اُن جزئیات کو کس طرح

مرتب کیا جائے جنہیں قرآن نے دانستہ غیر متعین چھوڑ دیا ہے۔ ان کے متعلق نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا تھا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) تم معاملات میں اُن (جماعتِ مومنین) سے مشورہ کیا کرو۔ اس حکم کے تحت یہ غیر متعین جزئیات باہمی مشاورت سے طے پاتی تھیں۔ کتب روایات و سیر میں کئی واقعات مذکور ہیں جن سے ظاہر ہے کہ حضورؐ صحابہؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

اس کی مثالیں چوبیسویں خط میں دی جا چکی ہیں۔

۷۔ یہ سلسلہ نبی اکرمؐ کی زندگی میں اسی طرح قائم رہا۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد اطاعتِ خداوندی کی کون سی صورت مقصود تھی۔ اس سلسلہ میں قرآن نے واضح طور پر بتا دیا کہ

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ (۳/۱۴۳)

محمدؐ بجز این نیست کہ اللہ کا ایک رسول ہے۔ اُس سے پہلے بہت سے رسول گزر رہے ہیں۔ سو اگر یہ وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم اُس کے بعد پھر اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟

یعنی حضورؐ کے بعد اطاعت خداوندی کے اسی سلسلہ کو بدستور قائم رکھنا مقصود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضورؐ کی وفات کے بعد صحابہؓ نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اپنے میں سے ایک (حضرت ابوبکر صدیقؓ) کو حضورؐ کا جانشین (خلیفہ) منتخب کر لیا۔ جس طرح رسول اللہؐ (اس سے پہلے اللہ کی اطاعت کراتے تھے)، اب خلیفۃ الرسولؐ نے اسی طرح خدا کی اطاعت کرانا شروع کر دی۔ جسطرح اس سے پہلے، رسول کی اطاعت سے عملاً خدا کی اطاعت ہوتی تھی، اسی طرح اب خلیفۃ الرسولؐ کے فیصلوں کی اطاعت، خدا اور رسولؐ کی اطاعت تھی۔ اسی کے لئے رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ (مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ) تم پر میرے طریقے اور میرے خلفاء راشدین المہدین کے طریقے کی پیروی لازمی ہے۔ جس طرح رسول اللہؐ کو حکم دیا گیا تھا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) ان (مومنین) سے معاملات میں مشورہ کیا کرو۔ اسی طرح خلافت کے متعلق تھا کہ أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) ان کے معاملات باہمی مشوروں سے طے پائیں گے۔ اسی کو قرآن نے وہ سبیل المومنین قرار دیا ہے (۴/۱۱۵) جسے چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

۸۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ خلافت راشدہ (یا خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) میں جزئیات کا تعین کسطرح سے ہوتا تھا۔ اس کے متعلق کتب روایات و آثار میں ایسی شہادات موجود ہیں جن ... سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی

شکل یہ تھی کہ

۱۔ جن امور کی جزئیات پہلے متعین نہیں ہوئی تھیں، ان کی جزئیات متعین کی جاتی تھیں۔ مثلاً شراب کی سزا نبی اکرمؐ کے زمانے میں مقرر نہیں ہوئی تھی (ایسا کوئی واقعہ ہی سامنے نہیں آیا ہوگا) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس کی سزا چالیس کوڑے مقرر فرمائی (حضرت عمرؓ نے اسے اسی کوڑے کر دیا تھا)۔

۲۔ جو جزئیات پہلے متعین ہو چکی تھیں اور ان میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی، انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جاتا تھا۔ ایک آئینی حکومت کا یہی انداز ہوتا ہے۔ اس میں سابقہ حکومت کے فیصلے بدستور نافذ العمل رہتے ہیں تا آنکہ تغیرِ حالات سے ان میں تبدیلی نہ کر دی جائے۔

۳۔ جن جزئیات میں اقتضائے حالات کے مطابق، کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی ان میں تبدیلی کر دی جاتی تھی۔ اس لئے کہ یہ جزئیات ابتداء میں بھی وحی کی رو سے متعین نہیں ہوئی تھیں کہ ان میں وحی ہی کوئی تبدیلی کر سکتی۔ اس کی چند ایک مثالیں چوبیسویں خط میں لکھی جا چکی ہیں۔

ان پر ایک نظر پھر ڈال لو۔

بہرحال، یہ ہیں وہ قرآنی دلائل اور کتبِ روایات و تاریخ کے شواہد جنہیں یہ گروہ اپنے مسلک کی تائید میں پیش کرتا ہے۔ یعنی اس مسلک کی تائید میں کہ غیر متبدل صرف قرآن کے قوانین ہیں اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ جزئیات میں "خلافت علیٰ منہاج رسالت" زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کر سکتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے خطبات کا جو اقتباس اوپر درج کیا جا چکا ہے اس میں انہوں نے اس ضمن میں امام ابوحنیفہؒ اور شاہ ولی اللہؒ محدث دھلوی کا نام خاص طور پر لیا ہے۔ امام اعظمؒ کے متعلق خطیب بغدادی، اپنی تاریخ (جلد ۱۳، صفحہ ۳۹۰) میں یوسف ابن اسباط کے حوالے سے لکھتا ہے کہ

> ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ نبی صلعم مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا (یعنی دونوں ایک زمانہ میں ہوتے) تو آپ میرے بہت سے اقوال اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔

اس کے بعد خطیب نے لکھا ہے کہ ابوعوانہ نے بیان کیا کہ "میں ایک روز ابوحنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے، اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ ابوحنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابوحنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ مجھ سے یحییٰ بن سعید نے بیان کیا، انہوں نے محمد بن حبان سے، انہوں نے رافع بن خدیج سے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس آدمی کی مدد کو پہنچو ورنہ اس کا ہاتھ کٹ

جائے گا۔ اس پر ابوحنیفہؒ نے پھر بلا تامّل کہا کہ وہ حکم گزر چکا اور ختم ہو چکا۔ چنانچہ اس چور کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔"

یہ تھی امام اعظمؒ کے مسلک کی مثال۔ شاہ ولی اللہؒ نے، حجۃ اللہ البالغہ میں ایک باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے "علوم نبویؐ کے اقسام"۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ "میں ایک انسان ہوں جب تم سے کوئی دین کی بات بیان کروں تو اسے اختیار کرو اور جو بات اپنی رائے سے بیان کروں تو میں ایک انسان ہوں" اس پر شاہ صاحب نے کہا ہے کہ ان امور کا تعلق تبلیغ رسالت سے نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ایسے ہی وہ امور ہیں جن میں آنحضرتؐ کے عہد میں ایک جزئی مصلحت تھی لیکن وہ تمام اُمت کے لئے لازمی اور حتمی نہ تھے۔ اسی حصّہ میں آپ کے احکام اور فیصلے بھی شامل ہیں۔ یا وہ امور جو تدبیرِ خانہ داری اور آدابِ معاش اور سیاستِ مدن سے تعلق رکھتے ہیں، شارع نے ان امور کے لئے کوئی مقدار معین نہیں کی ہے۔

شاہ صاحب کے اس مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا عبیداللہ سندھی (جو حکمت ولی اللّٰہی کے بہترین شارح اور مبلّغ تصوّر کئے جاتے ہیں) لکھتے ہیں۔

واضح رہے کہ جب اساسی قانون پر عملدرآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ قانونِ اساسی غیر متبدّل ہوتا ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں ہم "سنت" ان تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسول اللہؐ اور آپ کے بعد خلفائے ثلاثہ نے مسلمانوں کی مرکزی جماعت کے مشورے سے تجویز کئے۔ خلافت عثمانیؓ کے بعد یہ نظام ٹوٹ گیا کہ تمام کام مشورے سے کئے جائیں۔ سنت کو ہمارے فقہائے حنفیہ رسول اللہؐ اور خلفائے راشدین میں مشترک مانتے ہیں اور یہی ہماری رائے ہے۔ یہ سنت قرآن ہی سے پیدا ہوگی۔ آج کل کی اصطلاح میں اس کو بائیلاز کہا جاتا ہے ... اصل قانون اساسی متعین ہے۔ "بائیلاز" اُس وقت اور تھے اس وقت اور ہوں گے جن میں زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق فروعی تبدیلیاں ہوں گی۔ نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا اور اس کا نام فقہ ہے۔[۵]

فقہ اور حدیث سے متعلق دونوں مکاتب فکر کا ایک جائزہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ کہتے ہیں۔

جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے کتب فقہ کی روح کے خلاف امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدّل قرار دے رکھا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح امام ابوحنیفہؒ کے ناقدین نے ان فیصلوں کو

---

[۵] الفرقان۔ ولی اللہ نمبر صفحہ ۲۶۴۔

ابدی قرار دے دیا تھا جو عہدِ رسالت مآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقامات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے۔
جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، ہمارے ہاں ایسے لوگ موجود ہیں جن کا مسلک، اس مسلک سے مختلف ہے۔ ان حضرات کی طرف سے اس مسلک کی مخالفت ضروری ہے۔ چنانچہ اس مخالفت کو خود علامہ اقبالؒ نے محسوس (بلکہ ANTICIPATE) کیا تھا۔ وہ اپنے خطبات میں لکھتے ہیں:

> مجھے اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ اگر اسلامی قانون سے متعلق ضخیم لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے دورِ حاضر کے ناقدین کے اس سطحی خیال کی تردید ہو جائے گی کہ اسلامی قانون جامد اور ناقابلِ ترقی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں کہ قانون سازی کے مسئلہ کے متعلق تنقیدی نقطۂ نگاہ سے گفتگو کی جائے۔ اگر کسی نے اس بات کو اٹھایا تو یہ اقدام بہت سے لوگوں کے لئے وجۂ ناراضگی ہو جائے گا اور مخالفت کا دروازہ کھول دے گا۔ بایں ہمہ میں، اس باب میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں گا۔[1]

لہٰذا اس باب میں قدامت پرست طبقہ کی طرف سے مخالفت قابلِ فہم ہے۔ لیکن ہمارے ہاں مصیبت یہ ہے کہ خیالات کے اختلاف کی بنا پر مخالفت میں اس حد تک تشدّد برتا جاتا ہے کہ فریقِ مخالف میں کفر اور بے دینی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ چنانچہ اس اختلاف کی وجہ سے (اور تو اور) خود امام اعظمؒ کے متعلق جو کچھ کہا گیا وہ اس تشدّد کی بیّن مثال ہے۔ خطیب بغدادی لکھتا ہے کہ:

> امام مالک بن انسؒ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کا فتنہ اس اُمت کے لئے (معاذ اللہ) ابلیس کے فتنے سے کم نہیں۔ عقیدۂ ارجا میں بھی اور احادیث کو رد کرنے میں بھی۔ عبدالرحمان بن مہدی کہتے ہیں کہ دجّال کے فتنہ کے بعد اسلام میں کسی فتنہ کو ابوحنیفہؒ کے فتنہ سے بڑا نہیں دیکھا۔ سلمان بن حسان حلبی کہتے ہیں کہ میں نے بے شمار مرتبہ امام اوزاعیؒ کو کہتے سنا ہے کہ ابوحنیفہؒ نے اسلام کے ایک ایک دستے کو گن گن کر توڑا ہے۔ فزاری کہتے ہیں کہ میں نے سفیان اور اوزاعی دونوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اسلام میں (معاذ اللہ) ابوحنیفہؒ سے زیادہ بدبخت ترین پیدا نہیں ہوا۔ امام شافعیؒ نے بدترین کا لفظ کہا ہے۔ ابو عبید کہتے ہیں کہ میں اسود بن سالم کے ساتھ رُصافہ کی جامع مسجد میں بیٹھا تھا۔ وہاں کسی مسئلہ کا تذکرہ آ گیا۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ ابوحنیفہؒ ایسا کہتے ہیں تو اسود نے مجھے ڈانٹ کر کہا کہ تو مسجد میں ابوحنیفہؒ کا تذکرہ کرتا ہے؟ مسجد میں ابوحنیفہؒ کا نام لینے کے جرم میں وہ مجھ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ مرتے دم تک پھر مجھ سے

[1] خطبات صفحہ ۱۵۶۔

کلام نہیں کیا[۱]

مخالفت میں شدّت کا یہ مسلک ہمارے ہاں بدقسمتی سے آج تک چلا آ رہا ہے۔

بہرحال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ خلافتِ راشدہ میں قانون سازی کی صورت یہ تھی کہ اگر زمانے کے تقاضے کسی سابقہ فیصلہ میں تبدیلی کے متقاضی ہوتے، تو باہمی مشاورت سے ایسی تبدیلی کر لی جاتی۔ اگر خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ قائم رہتا تو ظاہر ہے کہ قانونی تبدیلیوں کی یہ شکل بھی ساتھ کے ساتھ آگے بڑھتی رہتی اور اس طرح ثبات و تغیّر کے امتزاج سے، ہمارا قانونِ شریعت اپنی ارتقائی منازل طے کئے چلا جاتا۔ لیکن افسوس کہ وہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور اس کے بعد قانون میں جانچ پڑتال کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے فقہی مکاتب نے اس سلسلہ کو کچھ وقت تک جاری رکھا لیکن ایک تو وہ انفرادی کوششیں تھیں اور دوسرے ان پر بھی ایک وقت کے بعد جمود و تعطّل چھا گیا۔ میں اس تاریخی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ یہ کیسے ہوا اور کیوں ہوا۔ ہمارے پیشِ نظر موضوع کے ضمن میں جو اہم سوال سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اب جبکہ خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا نظام مدّت ہوئی ختم ہو چکا ہے، تو ایک اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کے سلسلہ میں کیا صورت اختیار کی جائے؟ اس کا جواب صاف اور سیدھا ہے اور وہ یہ کہ وہی شکل اختیار کی جائے جو عہدِ رسول اللہؐ والذین معہٗ میں اختیار کی گئی تھی۔ یعنی خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کو دوبارہ قائم کیا جائے۔ اس ضمن میں بعض حضرات کو کہتے سنا گیا ہے کہ صاحب! یہ تو وہ شکل ہے جس کا اب کوئی امکان ہی نہیں۔ اب ہم "ابوبکر صدیقؓ اور عمرؓ" کو کہاں سے لائیں جو ایسی خلافت قائم کریں۔ یہ مایوسی ایک غلط فہمی کی پیدا کردہ ہے۔ اگر اس تصوّر کو صحیح مان لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ قرآن، تاریخ کے ایک خاص دور کے لئے ضابطۂ حیات بن سکتا تھا، اس کے بعد نہیں۔ یہ تصوّر غلط ہے۔ قرآن کو محفوظ رکھنے سے مقصد ہی یہ تھا کہ ہر زمانے میں ہر مقام کے انسانوں کے لئے ان کی عملی زندگی کا ضابطہ بن سکے۔ لہٰذا قرآن کی روشنی میں جو نظام ایک بار متشکل کیا گیا تھا وہ اب بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس نظام کے قیام کی شکل یہ ہے کہ ایک مملکت اس امر کا فیصلہ کرے کہ اس نے اپنے معاشرے کو ان غیر متبدّل خطوط پر متشکل کرنا ہے جو قرآن میں محفوظ ہیں۔ پھر یہ مملکت اسلامی قانون سے متعلق اپنے لٹریچر پر نگاہ ڈالے۔ اس میں جو کچھ ایسا ملے جو قرآنی اصولوں کی روشنی میں ہمارے زمانے کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اسے عملی حالہ اختیار (ADOPT) کر لے۔ جس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہو، وہ تبدیلی کر لی جائے، اور نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے لئے نئی نئی جزئیات متعین کر لی جائیں۔ یہ سب کچھ نمائندگانِ امّت کے باہمی مشورے سے ہو۔ اس طرح پھر سے اس نظام کی طرح پڑ جائے گی جو قرآن کی بنیادوں پر استوار

---

[۱] یہ تمام تفاصیل خطیب بغدادی کی تاریخ کی جلد نمبر ۱۳ میں موجود ہیں۔

ہوگا۔ یہ نظام بتدریج اپنی خامیوں کو دور کرتا ہوا ترقی کرتا اپنے منتہیٰ کی طرف بڑھتا چلا جائے گا۔ یہی وہ سبیل المؤمنین ہے جس پر چلنے کی قرآن نے تاکید کی ہے۔ جب تک ایسا نظام قائم نہیں ہوتا اس وقت تک اُمت جس طریق پر چلتی آ رہی ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ تبدیلی کا حق صرف نظام کو حاصل ہے۔ کسی فرد کو نہیں خواہ اس کی فکر و بصیرت کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو۔

یہ ہے عزیزم! میرے نزدیک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا اصول اور طریق جس کی نشان دہی علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں کی تھی۔ اُنہوں نے یہ بات (۱۹۲۸ء میں) اُس زمانے میں کہی تھی جب پاکستان کا تصوّر ہنوز ان کے ضمیر میں پہلو بدل رہا تھا۔ اُن کے نزدیک اس کی اہمیت اس قدر تھی کہ اُنہوں نے (اس سے بھی بہت پہلے) اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ:

> میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ کے جورس پروڈنس (JURISPRUDECNE) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام میں مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا محسن بھی وہی ہوگا.... افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا.... میری ناقص رائے میں اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید اسلام کی تاریخ میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔[۵]

علامہ اقبالؒ نے "شاید" کا لفظ اس وقت استعمال کیا تھا جب پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا۔ تشکیل پاکستان کے بعد، یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ:

تاریخ اسلام میں ایسا وقت پہلے کبھی نہیں آیا

یہ وہ وقت ہے جس کے متعلق اُنہوں نے (اپنے خطبات میں) کہا تھا کہ:

> یہ سوال زود یا بدیر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جد و جہد کا متقاضی اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی۔ حسبنا کتاب اللہ۔

---

[۵] اقبال نامہ۔ جلد اوّل صفحہ ۵۰۔

وہ اپنے اس اہم خطبہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں:

> اسلام کا بنیادی تخیّل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ پہلے زمانے کے مُسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ (ختم نبوّت کے) بنیادی تخیّل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مُسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدّل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرے کی تشکیل جدید کرے اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل و غایت ہے، لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔

اگر سلیم! ملّت پاکستانیہ نے قرآنی اصولوں کے مطابق فقۂ اسلامی کی تشکیلِ جدید کی رُو سے اسلام کی عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دی تو اُس کے حصّہ میں عالم اسلامی کی امامت اور اقوام عالم کی فکری قیادت آسکے گی۔ لیکن اگر یہ اپنے اس اہم اور نازک فریضہ میں ناکام رہ گئی تو دنیا اس کی ناکامی کو خود اسلام کی ناکامی تصوّر کرے گی اور اس تجربہ کو بطور شہادت پیش کر کے کہہ دے گی کہ اسلام تاریخ کے ایک خاص دور میں کامیاب ہوا تھا، اس کے بعد یہ اپنی توانائیوں کو کھو بیٹھا ہے اور اب یہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے کے قابل نہیں رہا۔

ذرا سوچو سلیم! کہ اس سے ہم انسانیت کی عدالت میں کتنے عظیم اور شدید جرم کے مرتکب ہوں گے۔ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا۔

والسّلام

پرویز

اکتوبر ۱۹۵۷ء

ستائیسواں خط

(جشنِ نزولِ قرآن)

ہاں سلیم! جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، عید میلاد النبیؐ، اور جشن نزول قرآن ایک ہی حقیقت کے دو پہلو اور ایک ہی سکہ کے دو رُخ ہیں۔ عید میلاد النبیؐ کے سلسلہ میں تمہیں اس سے پہلے بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ اب جشن نزول قرآن کے ضمن میں مختصراً بتانا چاہتا ہوں۔ اس کی تمہید میں کچھ ایسے نکات بھی مل جائیں گے جو عید میلاد کے سلسلہ میں (یا مقام محمدیؐ کے ضمن میں) پہلے لکھے جا چکے ہیں۔ انہیں قند مکرر سمجھو۔ لو اب غور سے سنو کہ قرآن کے متعلق، خود قرآن بھیجنے والا کیا کہتا ہے۔ قرآن، خدا کی کتاب ہے اور کتاب بھی ایسی جس کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ نزاکشیدہ دست از قلم کشید خدا۔ یہی وہ آخری کتاب ہے جس کے مطابق عدالت خداوندی سے کائناتِ انفس و آفاق کے معاملات کے فیصلے ہوتے اور جس کی رو سے قوموں کو ان کی موت و حیات کے پروانے ملتے ہیں۔ قرآنی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ کائنات میں ہر شے خدا کے متعین کردہ قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ محیر العقول کارگۂ ہستی جس کے تصور سے ذہن انسانی ورطۂ حیرت میں ڈوب کر رہ جاتا ہے اس حسن و خوبی اور ربط و ضبط سے چل رہا ہے کہ اس میں نہ کہیں کوئی سقم ہے نہ خلل، نہ فساد نہ انتشار، نہ تزاحم ہے نہ تصادم۔ ہر شے اپنے فریضہ کی ادائیگی میں انتہائی جذب و انہماک سے سرگرداں ہے۔ اور اس سعی و عمل کا مجموعی نتیجہ، تعمیر و ارتقاء (CONSTRUCTION AND PROGRESS) کی شکل میں ہر آن سامنے آجاتا ہے۔ قرآن کا کہنا یہ ہے کہ اسی قسم کے غیر متبدّل قوانین۔ جنہیں عام طور پر مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے لئے بھی مقرر ہیں۔ اگر انسانی معاشرہ اُن قوانین کے مطابق چلے تو اس کا نتیجہ خارجی کائنات کی طرح تعمیری اور ارتقائی ہوگا۔ اگر وہ اس کے خلاف چلے تو تخریب اور فساد کے جہنم میں جا گرے گا۔ چونکہ انسانی معاشرے کے متعلق قوانین، مجرّد اور غیر محسوس

شکل (ABSTRACT FORM) میں ہیں، اور خارجی کائنات کا نظم و نسق انسان محسوس طور پر اپنے سامنے دیکھ سکتا ہے۔ اس لئے قرآن، انسانی زندگی سے متعلق مجرّد قوانین کو کائنات کے محسوس شواہد کی مثالوں سے سمجھاتا ہے۔ یہی طریق اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کے تعارف کے لئے اختیار کیا ہے۔ مثلاً سورۂ واقعہ میں ہے: فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ۔ ان سے کہو کہ نہیں! بات یہ نہیں کہ میں ان حقائق کو یونہی نظری طور پر بیان کر کے آگے بڑھ جاؤں گا۔ میں انہیں کائنات کے محسوس نظام کی مرئی مثالوں سے سمجھاؤں گا۔ اس ضمن میں، میں سب سے پہلے ستاروں کی گزرگاہوں کو بطور شہادت پیش کرتا ہوں۔ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ۔ اور اگر تم علم و بصیرت کی بارگاہ سے دریافت کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ شہادت کتنی عظیم شہادت ہے۔ میں ستاروں کی گزرگاہوں۔ ان کے طلوع و غروب کے مواقع۔ کو اس حقیقت کبریٰ کے اثبات کے لئے بطور شہادت پیش کرتا ہوں کہ:

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ($\frac{56}{77-75}$)

یہ قرآن بڑے شرف و مجد کا حامل اور نوعِ انسانی کے لئے بے حد نفع رساں اور عزّت بخش ہے۔ خود واجب التکریم ہے اور جو اسے راہ نما بنا لے اسے واجب التکریم بنا دینے کا ضامن اور کفیل۔

سورۂ تکویر میں اسی اجمال کو ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ۔ نہیں! میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ان سیاروں کو جو پچھلے پاؤں لوٹ جاتے ہیں اور انہیں یعنی جو ایک برق یا غزالہ کی طرح تیزی سے آگے بڑھ کر چھپ جاتے ہیں۔ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ۔ اور شہادت میں پیش کرتا ہوں رات کو جب وہ آہستہ سے دبے پاؤں آتی ہے اور اسی طرح خاموشی سے دبے پاؤں لوٹ جاتی ہے۔ اور صبح کو جب وہ اپنی مسیحا نفسی سے، ساری دنیا کو حیات نو کا پیام دینے کے لئے مشرق کے جھروکے سے نمودار ہوتی ہے۔ میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ان تمام کائناتی شواہد کو اس حقیقت کبریٰ کی تبیین کے لئے کہ:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ($\frac{81}{19-15}$)

جس شخص کی زبان سے تم اس قرآن کو سن رہے ہو وہ ہمارا بھیجا ہوا قاصد ہے اور نہایت معزز اور واجب التکریم قاصد یعنی یہ پیغام (قرآن) بھی اَلْكَرِيْمُ ($\frac{56}{77}$) ہے اور اس کا لانے والا بھی اَلْكَرِيْمُ ($\frac{81}{19}$) اور جس (خدا) نے اسے بھیجا ہے وہ بھی اَلْكَرِيْمُ ($\frac{82}{6}$)۔ سورۂ الطارق میں ہے وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ۔ یہ فضائی کرّے جو اس قدر عظیم الجثہ ہونے کے باوجود اس حسن و خوبی سے اپنے اپنے افلاک میں تیرتے پھرتے ہیں ($\frac{36}{40}$)۔ اور اپنی گردش سے زندگی کے نئے نئے پہلو سامنے لاتے ہیں وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں۔

اور یہ زمین، جو بیج کو پھاڑ کر اس میں سے کونپل کی شکل میں ایک نئی زندگی کی نمود کرتی ہے (وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ) یہ بھی اس حقیقت پر گواہ ہے کہ:

اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ

قرآن ایک فیصلہ کن حقیقت ہے۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ (DECISIVE) ہے۔ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۸۶/۱۱-۱۴)۔ یونہی مذاق نہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ یہ محض شاعری ہے جسے زمانے کی گردشیں خود بخود مٹا دیں گی۔ (اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (۵۲/۳۰)۔ یہ غلط ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ۔ وہ تمام حقائق جو تمہاری آنکھوں کے سامنے آچکے ہیں۔ جن کا احاطہ تمہاری بصیرت کر سکتی ہے اور وہ حقائق جو تمہاری نگاہوں سے مستور ہیں، وہ سب اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ۔ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ (۶۹/۳۹-۴۰)

یہ (قرآن) ایک واجب التکریم پیغمبر کی وساطت سے پہنچنے والے ابدی حقائق کا مجموعہ ہے، محض شاعرانہ تخیلات کا نگاہ فریب مرقع نہیں۔ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ (۶۹/۴۲)۔ نہ ہی یہ کسی اٹکل پچو باتیں بنانے والے نجومی کی قیاس آرائیاں ہیں، بلکہ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶۹/۴۳)۔ یہ اُس خدا کی طرف سے نازل کردہ قوانین کا ضابطہ ہے جو تمام کائنات کا نشو و نما دینے والا ہے۔ ہر شے کو آہستہ آہستہ، بتدریج اُس کے نقطۂ آغاز سے، معراجِ تکمیل تک پہنچانے والا۔ اس قسم کے حقائق نہ کوئی شاعر دے سکتا ہے نہ سرپھرا دیوانہ۔ وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (۳۷/۳۶)۔ . . . .

بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ (۳۷/۳۷)۔ یہ وہی دے سکتا ہے جو خدا کی طرف سے تعمیری نتائج پیدا کرنے والی مثبت حقیقت لایا ہو۔ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ، ہم نے اپنے رسول کو شاعری نہیں سکھائی، نہ ہی شاعری اسے زیب دیتی ہے۔ جو زندگی بخش، حیات آور، پیغامِ انقلاب کا حامل ہو اسے شاعری سے کیا واسطہ؟ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ، یہ ان ابدی حقیقتوں کی یاد دہانی ہے جنہیں تم نے فراموش کر رکھا ہے۔ یہ ایک ضابطۂ زندگی ہے جو اپنی بات کو نہایت ابھرے اور نکھرے ہوئے انداز سے تمہارے سامنے پیش کرتا ہے۔ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۳۶/۶۹-۷۰)۔ تاکہ ہر اُس شخص کو جس میں زندگی کی رمق باقی ہے، غلط روش پر چلنے کے ہلاکت انگیز عواقب سے آگاہ کر دے۔ اور جو لوگ اس کے باوجود اسی (غلط) روش پر چلتے جائیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ کسطرح حقیقت پر مبنی تھا۔ اس لئے کہ:

اِنَّهٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ وَّمَا هُوَ بِالۡهَزۡلِ (۸۶/۱۳-۱۴)

یہ فیصلہ کن بات کرتا ہے۔ یونہی مذاق نہیں کرتا۔ چونکہ تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے اس لئے اس کی عظمت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس کی عظمت اور اثر انگیزی کا تو یہ عالم ہے کہ لَوۡ اَنۡزَلۡنَا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيۡتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ ؕ (۵۹/۲۱)۔ اگر (مثال کے طور پر) ہم اسے قلب کوہ کے اندر رکھ دیتے اور (اسے احساس عطا کر دیتے) تو تو دیکھتا کہ اسکی خلاف ورزی کے ہلاکت آفرین نتائج کے احساس سے اسکی سختی کسطرح نرم پڑ جاتی اور کسطرح اس کا جگر شق ہو جاتا۔ اسی لئے کہ اِنَّهٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ وَّمَا هُوَ بِالۡهَزۡلِ۔

"فصل" کے معنی ہوتے ہیں الگ الگ کر دینا، متمیّز کر دینا، حق کو باطل سے جدا کر کے دکھا دینا، غلط کو صحیح سے الگ کر کے بتا دینا۔ اسی کے لئے دوسری جگہ کہا۔ حٰمٓ۔ وَالۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ۔ یہ ایک ایسا ضابطۂ قوانین ہے جو خود بھی واضح اور صاف ہے۔ اور جو ہر بات کو نہایت وضاحت اور صراحت سے ابھار کر اور نکھار کر بیان کر دیتا ہے۔ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنۡذِرِيۡنَ ہم نے ان کا آغاز نزول (رمضان کے مہینے کی ایک) ایسی شب میں کیا جو تمام نوع انسان کے لئے نہایت برکت و سعادت کا موجب بن گئی ہے۔ یہ کتاب ہمارے اُس قانون (سنت اللہ) کے مطابق نازل ہوئی جس کی رو سے ہم شروع سے انسان کو اس کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتے چلے آ رہے ہیں فِيۡهَا يُفۡرَقُ كُلُّ اَمۡرٍ حَكِيۡمٍ (۴۴/۱-۴)۔ اس میں ان تمام امور کو جو حکمت پر مبنی ہیں، (غلط امور سے) الگ کر کے رکھ دیا گیا ہے۔

یہاں اسے لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ کہا ہے۔ دوسری جگہ ہے اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ (۹۷/۱)۔ ہم نے اسے لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ میں نازل کیا۔ اگرچہ (لیل) کے معنی رات کے ہیں، لیکن اس سے مراد وہ تمام زمانہ بھی ہو سکتا ہے جس میں قرآن نازل ہوتا رہا۔ اسے (لیل) سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ جس زمانے میں انسانوں کے پاس خدا کی وحی کی روشنی نہ رہے وہ اندھیری رات کی طرح تاریک ہوتا ہے۔ وحی کی روشنی آتی ہی تاریکیوں کے بعد ہے۔ اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ نوع انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے (يُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ (۵/۱۶))۔ نیز اس سے مراد وہ دَور بھی ہو سکتا ہے جس میں قرآن تو کسی قوم کے پاس موجود ہو، لیکن اس پر عمل نہ ہو رہا ہو (جیسا ہمارا دور ہے) بہرحال، قرآن کا نزول، تاریکی کے دَور میں ہوا تاکہ اُن انسانوں کے لئے، جو دیکھ بھال کر راستہ چلنا چاہیں، روشنی مہیا کر دے۔

دوسرا لفظ قدر ہے جس کے معنی ہیں پیمانہ۔ یعنی قرآن نے نوع انسان کو حق و باطل کے ناپنے کے صحیح صحیح پیمانے

عطا کئے ہیں۔ اُس نے وہ مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) دی ہیں۔ جن کے مطابق زندگی بسر کرنا مقصودِ انسانیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مستقل اقدار ہی وہ لنگر ہیں جن کے سہارے انسانی زندگی کی کشتی، حوادثِ زمانہ کی طوفان انگیزیوں سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ یہ بات بادنیٰ تعمق سمجھ میں آجائے گی کہ خارجی کائنات کی ہر شے وہ کچھ بن جاتی ہے جس نگاہ سے ہم اسے دیکھیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

اے کہ منزل را نمی دانی ز راہ قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگاہ
نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود ایں زمین و آسمان دیگر شود

اگر ہم آزردہ دل ہیں تو لوگوں کی ہنسی اور خوشی سے ہمیں غصہ آئے گا۔ (غالباً) فانی نے کہا ہے کہ ؎

عالم کی فضا پوچھو محرومِ تمنّا سے
بیٹھا ہوا دنیا میں اُٹھ جائے جو دنیا سے

اس کے برعکس، اگر ہم خوش ہیں تو ساری دنیا جھومتی اور ناچتی دکھائی دے گی۔ بقول اختر شیرانی ؎

یہ کس کو دیکھ کر، دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو
کہ جو شے ہے نگاہوں میں حسیں معلوم ہوتی ہے

مختصراً یوں کہ:

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں، دنیا مرا دل ہے
بدل جانے سے اس کے، رنگ ہر اک چیز کا بدلا

یا یوں کہ ؎

نہ کلی ہے وجۂ نظر کشی، نہ کنول کے پھول میں تازگی
فقط ایک دل کی شگفتگی سببِ نشاطِ بہار ہے

لیکن اگر ہم دنیا کے معاملات کے فیصلے اسی معیار کے مطابق کرنے لگ جائیں تو مصیبت ہو جائے۔ جس دن ہم خوش ہوں، اس دن مجرم بھی ہماری عدالت سے صاف بری ہو جائیں، اور جس دن ہم بیگم صاحبہ سے لڑکر آئے ہوں، اس دن بے گناہ بھی پھانسی پا جائیں۔ تمہیں شاید یاد ہو کہ مشہور روسی لیڈر لینن (روس کی تحریک سے پہلے) جرمنی میں گرفتار ہو گیا تھا۔ جج نے فیصلہ یہ کرنا تھا کہ اسے موت کی سزا دی جائے یا ملک بدر کر دیا جائے۔ اُس نے اسے ملک بدر کر دیا اور وہ بعد ازاں روس پہنچ گیا۔ اس پر لارڈ رسل نے لکھا ہے

کہ اگر اُس دن اس جج کو سوءِ ہضم (DYSPEPSIA) کی شکایت ہوتی تو دنیا کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔ لہذا یہ اصول غلط ہے کہ فیصلے ایک فرد کی افتادِ طبع کے مطابق ہوں۔ معاملات کے فیصلوں کے لئے کوئی مستقل پیمانہ ہونا چاہیئے، جو افراد کے مزاج اور طبائع سے قطعاً متاثر نہ ہو۔ ان پیمانوں کو "مستقل اقدار" کہتے ہیں جو وحی کی رو سے ملتی ہیں اور جن میں (اور تو اور) خود نبی کے ذاتی خیالات و جذبات کا بھی کوئی دخل نہیں ہوتا (وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى) (۵۳/۳)۔ ان مستقل اقدار کو میزانِ زندگی قرار دینے والوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ؎

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد کے مُردے اُکھڑ گئے

یہ مری جبینِ نیاز ہے کہ جہاں دھری تھی، دھری رہی

ان پر خارجی حوادث کی تلاطم خیزیوں اور طوفان انگیزیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

یہ ہے وہ لیلۃ القدر (مستقل اقدار والی "رات") جس میں قرآن نازل ہوا۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ۔ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۵ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ۔ اس حقیقت کو خدا کے سوا اور کون بیان کرسکتا ہے کہ وہ رات جس میں نزولِ قرآن کا آغاز ہو، اُس دور کے ہزار مہینوں سے بہتر ہے جس میں انسان وحی کی روشنی سے محروم ہو۔ وہ دور، جو قرآن کی روشنی سے منور ہو، انسانی جہالت اور ظلمت کے ہزار زمانوں سے افضل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نزول قرآن سے انسانی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ بعثتِ محمدیہ زمانۂ قبل از قرآن اور بعد از نزول قرآن میں ایک حدِ فاصل ہے جس سے دونوں دور نمایاں طور پر الگ دکھائی دیتے ہیں۔ نزول قرآن کے بعد کے زمانے کی خصوصیت یہ ہے کہ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ۔ اس میں آہستہ آہستہ، قانونِ خداوندی کے مطابق، ملائکہ اور روح کا نزول ہوتا ہے۔

یہ تمہیں معلوم ہی ہے کہ ملائکہ سے مفہوم وہ کائناتی قوتیں ہیں جو خدائی پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے میں سرگرم عمل رہتی ہیں۔ تم دیکھو! کہ کائناتی قوتوں کی کارفرمائیاں، جس سُرعت اور وضاحت سے، زمانۂ بعد از نزول قرآن میں بے نقاب ہوئی ہیں، زمانۂ قبل از قرآن کے ہزارہا سال میں اس کا عشر عشیر بھی انسانوں کے سامنے نہیں آسکا تھا۔

باقی رہا الرُّوح، سو اس سے مراد خود وحی کی قوت ہے۔ اس ضمن میں بھی غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جس تیزی سے (زمانۂ بعد از نزول قرآن میں) اقوامِ عالم، غیر شعوری طور پر (یعنی عقل کے تجرباتی طریق سے) وحیٔ خداوندی (قرآن) کے قریب آتی جا رہی ہیں، اس سے پہلے دور میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ تم دیکھو کہ زمانۂ قبل از قرآن میں (مثلاً) ملوکیت، شخصیت پرستی، نسل پرستی، اسلاف پرستی، قومیت پرستی، ذات پات کی تمیز، پیشوائیت، سرمایہ داری

جیسے عناصر، انسانی زندگی کے مسلّمات میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن (زمانہ نزولِ قرآن کے بعد دیکھو کر) اقوامِ عالم کس طرح ان "مسلّمات" کو آہستہ آہستہ چھوڑ چکی ہیں، یا چھوڑتی چلی جارہی ہیں۔

اس کے بعد قرآن یہ بتاتا ہے کہ کائناتی قوتوں کے عمل اور طریق کار کے بے نقاب ہونے اور وحیٔ خداوندی کے مطابق نظامِ زندگی کی تشکیل کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کا نتیجہ ہوتا ہے مِّنْ كُلِّ أَمْرٍ سَلَامٌ۔ سَلَامٌ ایک جامع لفظ ہے جس کے معنی امن و سلامتی بھی ہیں اور تکمیل ذات بھی۔ ضبطِ خویش بھی ہیں اور احترام آئین و قوانین بھی۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کائنات کے ہر گوشے، اور زندگی کے ہر شعبے میں، سلام کی کیفیت پیدا ہوجائے گی۔ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷/۵-۱)۔ تا آنکہ رات کی تاریکیاں چھٹ کر ساری فضا صبح کی روشنی سے معمور ہوجائے۔ یہ نورانیت سب سے پہلے عہدِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم وَالَّذِينَ مَعَهُ میں وجہِ تابانیٔ عالم ہوئی تھی، جس سے زندگی کے تاریک گوشے بھی چمک اُٹھے تھے۔ وہ انقلاب نبی اکرمؐ کی بے مثال قوّتِ عمل اور بے نظیر سیرت و کردار سے ہنگامی طور پر (BY REVOLUTION) ظہور میں آگیا تھا۔ لیکن اُس کے بعد، یہ انقلاب (بارِ دیگر) آہستہ آہستہ ارتقائی طور پر (BY EVOLUTION) رونما ہوگا، جب انسان، اپنے غلط تجارب کے تباہ کن نتائج سے متاثر ہوکر، وحی کے بتائے ہوئے راستے پر آئے گا۔ قرآن کا کہنا ہے کہ ایسا ہوکر رہے گا۔ اُس دَور میں ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی
اس قدر ہوگی ترنّم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہوجائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹)۔ اس وقت زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔

یہاں قرآن نے مِّنْ كُلِّ أَمْرٍ سَلَامٌ کہا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ۔ تمہاری طرف اللہ کی جانب سے ایک روشنی آگئی ہے۔ یعنی واضح کتاب۔ روشنی، خود روشن ہوتی ہے۔ یعنی اسے تلاش کرنے اور دیکھنے کے لئے کسی دوسری روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر کسی کمرے میں جلتا

ہوا چراغ رکھا ہو تو آپ یہ دیکھنے کے لئے، کہ وہ چراغ کہاں رکھا ہے اور کیسا ہے، لالٹین لے کر نہیں جاتے۔ وہ چراغ اپنی روشنی سے اپنے متعلق سب کچھ بتا دیتا ہے۔ اس کے لئے صرف دیکھنے والی آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن کو سمجھنے کے لئے کسی خارجی ذریعے کی ضرورت نہیں۔ صرف عقل و فکر انسانی کی ضرورت ہے۔ وہ کتاب مبین (واضح کتاب) ہے۔ یَّهۡدِیۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ - اس کے ذریعے اللہ، ہر اُس قوم کو جو اُس کے قوانین کا اتباع کرے، سلامتی (سلام) کے راستوں کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ وَيُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ - اور اپنے قانون کی رو سے انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے وَيَهۡدِيۡهِمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ (۵/۱۵-۱۶) اور زندگی کے توازن بدوش راستے کی طرف ان کی راہ نمائی کر دیتا ہے۔ یہاں صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ کہا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے اِنَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ يَهۡدِىۡ لِلَّتِىۡ هِىَ اَقۡوَمُ (۱۷/۹)۔ یقیناً یہ قرآن (کاروانِ انسانیت کی) اس راہ کی طرف راہ نمائی کرتا ہے جو اَقۡوَمُ ہے۔ قَائِمٌ (وہ کھڑا ہوا) قیام، قیامت، تقویم (ساخت، ہیئت کذائی) قوام وغیرہ الفاظ کی بنیاد میں توازن کا مفہوم مضمر ہوتا ہے کھڑا وہی رہ سکتا ہے جس کا توازن درست ہو۔ قوام میں بھی اعتدال کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اَقۡوَمُ کے معنی ہیں جس میں سب سے زیادہ تقویمی کیفیت ہو، جو توازن و تناسب کے اعتبار سے سب سے بہتر ہو، جو بہترین اعتدال کی حامل ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کا سارا سلسلہ توازن (PROPORTION) اور تناسب (RATIO) پر چل رہا ہے۔ اگر کسی شے کے اجزاء کے توازن و تناسب میں ذرا سا بھی فرق آجائے تو اس میں فساد ہی فساد رونما ہو جاتا ہے۔ یہی تناسب و توازن انسانی معاشرے کا بھی اصل الاصول ہے۔ نیز، جس کی (RATIO) درست ہو، وہی معقول (RATIONAL) ہے۔ لہٰذا قرآن اس راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو خود قائم ہے اور دوسروں کے قیام کا ذریعہ۔ جس کا توازن و تناسب بہترین ہے اور اس لئے سرتاسر (RATIONAL) ہے۔ اسی لئے اس کی اپیل بھی انسانی عقل و فکر سے ہے۔ اسی سے انسان کو حقیقی زندگی ملتی ہے اور ایسی مشعل ہدایت، جسے ہاتھ میں لے کر وہ ساری دنیا میں سیدھے راستوں پر جا سکتا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے اَوَمَنۡ كَانَ مَيۡتًا فَاَحۡيَيۡنٰهُ - ذرا سوچو کہ ایک وہ شخص ہے جسے ہم نے موت کے بعد حیات نو عطا کی۔ وَجَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا يَّمۡشِىۡ بِهٖ فِى النَّاسِ - اور ایسی قندیل ہدایت دی جس کی روشنی میں وہ دنیا کے تاریک ترین گوشوں میں نہایت امن و اطمینان سے چل پھر سکتا ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے كَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا (۶/۱۲۳)۔ جس کے متعلق یوں سمجھو کہ وہ ایسی تاریکی میں ہے جس سے وہ نکل ہی نہیں سکتا۔ کیا یہ دونوں شخص برابر ہو سکتے ہیں؟

یہ ہے وہ قرآن جس کے متعلق سورۂ یونس میں ہے کہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۔ اے نوعِ انسانی! تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک ایسا ضابطۂ ہدایت آگیا جو، غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر کے، تمہیں اس سے روکتا ہے ("وعظ" کے یہی معنی ہیں) اور آن تمام بیماریوں کا علاج ہے جن سے انسان کی سیرت میں ضعف اور کردار میں پستی آجاتی ہے۔ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۔ اور جو لوگ اس کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اُنہیں سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کرتا اور سامانِ نشوونما بہم پہنچاتا ہے۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ ۔ اے رسُول! ان سے کہہ دو کہ اس قسم کا ضابطۂ حیات محض خدا کے فضل و کرم سے تمہیں مل گیا۔ ورنہ انسان کے بس کی بات ہی نہ تھی کہ اپنے کسب و ہُنر اور عقل و خرد سے وہ ان حقائق کو معلوم کر لیتا۔

اس کے بعد ہے:

فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا

پس تمہیں چاہیئے کہ اس گراں قدر نعمت اور بخشِ بہا عطیہ کے ملنے پر خوشیاں مناؤ۔ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۱۰/۵۷-۵۸) حقیقت یہ ہے کہ یہ نعمت، دنیا بھر کی نعمتوں کے مقابل میں جنہیں انسان جمع کرتا رہتا ہے، اگر نقد رہے۔ یہ اس تمام علمی سرمایہ سے بہتر ہے جسے نوعِ انسان آج تک جمع کر سکی ہے اور جو وارثتاً اس تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس کی مثل و نظیر دنیائے فکر و عمل میں کہیں نہیں مل سکتی۔ لہٰذا تم اس قرآن کے ملنے پر خوشیاں مناؤ۔

اس سے واضح ہے سلیم! کہ رمضان اور اس کی عید درحقیقت نزولِ قرآن کا جشن ہے۔ یہ وہ تقریب ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں اور مشترک طور پر جشنِ مسرّت ہے۔ اس لئے کہ یہ نعمت کسی خاص قوم یا خاص ملک کی ملکیت نہیں۔ یہ تمام نوعِ انسان کے لئے حیاتِ باشرف کا موجب اور امن و عافیت کا ضامن ہے۔ اصل یہ ہے کہ اقوامِ عالم نے ابھی سمجھا ہی نہیں کہ قرآن کیا ہے؟ جس دن ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی ان کے نزدیک، نزولِ قرآن کی تقریب سے بڑھ کر، اور کوئی تقریب جشن و مسرّت کا موجب نہیں سمجھی جائے گی۔ اس وقت ساری دنیا میں یہی ایک تقریب مشترک قرار پا جائے گی۔ نزولِ قرآن کی تقریب اور عیدِ میلاد النبیؐ کی تقریب، جو درحقیقت ایک ہی حقیقت کے دو گوشے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے، عملی نقطۂ نگاہ سے، انسان کو ملتا کیا ہے؟ مختصر الفاظ میں اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کو وُہ سب کچھ مل جاتا ہے جو اس کی موجودہ زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے

ضروری ہے اور جس سے اس کے مرنے کے بعد کی زندگی انسانیت کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بن جاتی ہے یہ ظاہر ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی کو خوشگوار بنانے کا پہلا قدم یہ ہے کہ اس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی (BASIC NECESSITIES OF LIFE) پوری ہوں۔ یہ زندگی کا کم از کم اور لاینفک مطالبہ ہے۔ جس فرد یا قوم کی طبیعی ضروریاتِ زندگی پوری نہ ہوں وہ دیگر مسائلِ حیات کے متعلق کچھ سوچ ہی نہیں سکتی۔ دیکھو! قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔

سورۂ طٰہٰ کی ابتداء اس سے ہوتی ہے۔

مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى (۲۰/۲)۔

ہم نے تجھ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ تو "شقاوت" کی زندگی بسر کرے۔ شقاء کے معنی ہیں محرومی، بدنصیبی یعنی قرآن اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ تم محرومی اور بدنصیبی کی زندگی بسر نہ کرو۔ تمہیں جگر پاش مشقتیں نہ اٹھانی پڑیں۔

یہ ہے نزولِ قرآن کا ایک اہم مقصد۔ اب اس اصول کی عملی تشریح دیکھو! اسے قرآن نے (اسی سورہ میں) قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ آدم ایک جنتی زندگی میں تھا۔ ہم نے اس سے کہا کہ دیکھنا! تم کہیں شیطان کے فریب میں نہ آجانا[1]۔ اگر تم اس کے فریب میں آ گئے تو یہ تمہیں جنت سے نکلوا دے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا فَتَشۡقٰٓى (۲۰/۱۱۷)۔ تم محروم اور بدنصیب رہ جاؤ گے۔ کن چیزوں سے محروم رہ جاؤ گے؟ ان چیزوں سے جو تمہیں اس وقت نہایت فراوانی سے حاصل ہیں۔ وہ چیزیں کیا ہیں؟ سنو! اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوۡعَ فِيۡهَا وَلَا تَعۡرٰى۔ اس جنت میں تجھے اس بات کی ضمانت حاصل ہے کہ تو نہ بھوکا رہے گا نہ ننگا۔ وَاَنَّكَ لَا تَظۡمَؤُا فِيۡهَا وَلَا تَضۡحٰى (۲۰/۱۱۸)۔ تجھے نہ یہاں پیاس کا خوف ہے، نہ موسم کی گرمی سے بچنے کی فکر۔ اس میں تمہارے کھانے پینے کے لئے رزق، پہننے کے لئے کپڑا، رہنے کے لئے مکان۔ غرضیکہ تمام بنیادی ضروریات زندگی اس طرح حاصل ہیں کہ ان کے لئے تمہیں مشقتیں نہیں اٹھانی پڑتیں۔ اگر تم نے اس روش زندگی کو چھوڑ دیا تو ان تمام چیزوں سے محروم رہ جاؤ گے۔

اس کے بعد ہے کہ آدم شیطان کے فریب میں آ گیا اور ان چیزوں سے محروم ہو گیا۔ جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے خدا سے عرض کیا کہ کیا یہ محرومی ابدی ہے یا اس سے بچ نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے؟ جواب ملا کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ اس محرومی سے نجات مل سکتی ہے۔ اس کی شکل یہ ہے کہ فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ

---

[1] آدم، ابلیس، آدم کی جنتی زندگی وغیرہ کے مفہوم کے لئے میری کتاب "ابلیس و آدم" دیکھئے۔

هُدًى فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (۲۰/۱۲۳)۔ تمہارے پاس میری طرف سے راہنمائی آئے گی۔ سو تم میں سے جو بھی اس راہنمائی کے پیچھے پیچھے چلے گا تو نہ اس کی کوششیں رائگاں جائیں گی اور نہ ہی وہ محروم رہے گا۔ (لَا يَشْقٰى)۔

اس کے برعکس وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔ جو ہمارے قانون سے اعراض برتے گا تو اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی۔ (اتنا ہی نہیں بلکہ) وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴)۔ اور اسے ہم قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔

یعنی سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ، جو قوم قرآن کے قوانین کا اتباع کرے گی، وہ بنیادی ضروریاتِ زندگی سے کبھی محروم نہیں رہے گی اور جو اس سے اعراض برتے گی اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی۔ اس لئے کہ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى (۲۰/۲)۔ قرآن اس لئے نازل نہیں کیا گیا کہ اس کا اتباع کرنے والے بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جائیں۔

لیکن اس میں صرف طبیعی ضروریاتِ زندگی کے بافراط مہیا ہو جانے کے متعلق ہی ہدایات نہیں، یہ ایک مکمل ضابطۂ ہدایت ہے جس میں انسانی زندگی کے ہر گوشے اور نظامِ حیات کے ہر شعبے کے متعلق راہنمائی موجود ہے۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ (اس میں) تیرے پروردگار کا قانون صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گیا اور اس طرح مکمل ہو گیا کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ۔ اس میں کوئی شخص کسی قسم کا ردوبدل نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ، یہ (معاذ اللہ) کسی "اندھی گونگی فطرت" کا مدوّن کردہ ضابطۂ زندگی نہیں۔ یہ اس خدا کا عطا کردہ قانونِ حیات ہے جو سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶/۱۱۶)۔

اس کے مکمل ہونے کی کیفیت یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جس قدر قوانین نوعِ انسانی کی زندگی کے مختلف ادوار میں نازل ہوتے رہے وہ سب کے سب اس کے اندر آ چکے ہیں۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (۵/۴۸)۔ یہ ان تمام صداقتوں کو سچ کر کے دکھانے والا اور ان کا محافظ و نگہبان ہے۔ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۹۸/۳)

اس میں تمام محکم اور متوازن قوانین جمع ہو گئے ہیں۔

پھر، جس خدا نے اسے مکمل کیا ہے، اس نے اس کی حفاظت کا بھی ذمہ لیا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹)۔

یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اس طرح محافظ کہ لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (۴۱/۴۲) باطل نہ اس کے آگے سے آ سکتا ہے نہ پیچھے سے۔ جس راہنمائی کو تمام نوعِ انسان کے لئے، ہمیشہ کے لئے، ضابطۂ حیات بننا ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ محفوظ رہے

انسانی خیالات وتصوّرات کی اثراندازی سے۔ اور اس کی یہی صورت ہے کہ اس کے الفاظ میں نہ کسی قسم کا تغیّر و تبدّل ہوا، نہ کوئی حک و اضافہ۔ قرآن کا ایک ایک لفظ وہی ہے جو نبی اکرمؐ نے خدا سے پاکر اُمّت کو دیا تھا۔ اس میں نہ ایک لفظ زائد ہے نہ منسوخ۔ نہ بدلا ہوا ہے، نہ بگڑا ہوا۔

اس قسم کے ضابطۂ حیات کی بنیادی خصوصیت یہ بھی ہونی چاہیئے کہ اس میں نہ کوئی اختلاف ہو نہ تضاد۔ قرآن نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ اس میں کہیں اختلاف نہیں۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبّر نہیں کرتے؟ اگر یہ لوگ غور و فکر سے کام لیں تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے کہ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (۴/۸۲)۔ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات ملتے۔ یعنی، اس میں کسی اختلاف کا نہ ہونا بھی اس امر کی دلیل ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔

تم نے سلیم! اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ مسلمانوں میں جس قدر فرقے ہیں ان میں سے ہر فرقہ اپنے اپنے مسلک و مشرب کی تائید قرآن سے لاتا ہے۔ اگر صورت حال فی الواقع ایسی ہو۔ یعنی قرآن کریم اس قدر باہمد گر متخالف فرقوں میں سے ہر ایک کی تائید بہم پہنچا دیتا ہو تو لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (قرآن میں بے شمار اختلافات ہونے) کی، اس سے بڑھ کر اور دلیل کون سی ہو سکتی ہے؟ لہٰذا یہ غلط ہے کہ قرآن سے مختلف فرقوں کے باہمد گر متضاد عقائد و مسالک کی تائید مل سکتی ہے قرآن تو مختلف فرقوں کے وجود کو شرک قرار دیتا ہے (۳۰/۳۱-۳۲)۔ اس لئے اس سے ان کی تائید کیسے مل سکتی ہے؟ قرآن خدا کا دین پیش کرتا ہے جو ایک غیر منقسم وحدت (INDIVISIBLE UNIT) ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن یہ حقیقت (جیسا کہ قرآن نے خود کہا ہے) تدبّر فی القرآن سے سامنے آسکتی ہے، اندھی تقلید سے نہیں۔

لیکن تدبّر فی القرآن کا طریقہ وہی ہونا چاہیئے جسے قرآن نے خود تجویز کیا ہے۔ سورہ یونس میں ہے بَلْ کَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِہٖ وَلَمَّا یَاْتِہِمْ تَاْوِیْلُہٗ ؕ کَذٰلِکَ کَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الظّٰلِمِیْنَ (۱۰/۳۹)۔ ان لوگوں کو دیکھو! یہ قرآن کی تکذیب کرتے ہیں، بغیر اس کے کہ اس کے حقائق کو اپنے علم کے احاطہ میں لیں۔ لہٰذا قرآن کے سمجھنے کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ انسانی علم جس سطح تک پہنچ چکا ہو، انسان اس کی روشنی میں قرآنی حقائق کا مطالعہ کرے۔ جس شخص کے سامنے اس کے اپنے زمانے تک کا تمام علم نہ ہو، وہ قرآنی حقائق کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ جو علم و عقل سے کام نہ لے، قرآن کی بارگاہ سے اس پر پھٹکار پڑتی ہے۔ وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۰۰)۔

دوسرا طریقہ (جو درحقیقت پہلے ہی کا جزو لازم ہے) یہ ہے کہ (فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الظّٰلِمِیْنَ) انسان،

اقوام گذشتہ کی تاریخ سے دیکھئے کہ کس قوم نے کونسا راستہ اختیار کیا اور اس کا انجام کیا ہوا۔ گویا جس انسان کے سامنے اقوام سابقہ سے متعلق تاریخی شواہد، اور اپنے زمانے کے تقاضے نہ ہوں وہ قرآنی حقائق کا ادراک نہیں کرسکتا۔

اور تیسرا طریق، عمل سے متعلق ہے۔ یعنی قرآنی نظام کو عملاً متشکل کر دیا جائے۔ اس کے بعد اس کے نتائج (تَاْوِیْلہٗ) سے اس کے دعاوی کی صداقت خود بخود سمجھ میں آجائے گی۔ لیکن جو شخص نہ ماضی (تاریخ) اور نہ حال (عصر حاضر) سے متعلق علم رکھتا ہو اور نہ ہی قرآنی نظام کو متشکل ہونے دے، نہ اس کا انتظار کرے، وہ قرآن کو سمجھ نہیں سکتا۔

اوپر کہا گیا ہے کہ جس سطح تک انسانی علم پہنچ چکا ہو، وہ انسان کے سامنے ہونا چاہئے۔ اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس حقیقت کو قرآن نے دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)۔ ہم ان لوگوں کو عالم انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے تاکہ یہ بات نکھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن فی الواقع ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ یعنی قرآنی حقائق، زمانہ کی لہروں میں، کائنات کے پیچ و خم میں لپٹے ہوئے ہیں۔ جب انسانی علم و تحقیق کا کوئی گوشہ آشنا بلند ہو جائے کہ کسی لہر کو جا کر چھو لے تو اس میں چھپی ہوئی حقیقت، عروس نو کی طرح مسکراتی ہوئی، بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اس طرح قرآن کے حقائق آہستہ آہستہ مشہود ہونے چلے جا رہے ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

چوں مسلمانان اگر داری جگر — در ضمیر خویش و در قرآں نگر
صد جہان تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است — گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست — ہر جہاں اندر بر او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش

اس سے ظاہر ہے کہ، جو حقائق اس طرح زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بارز اور مشہود ہوتے ہوں، ان کے متعلق یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ، کسی ایک زمانے میں ان سب کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ ہم قرآنی حقائق کو اپنے زمانے کے علم کی روشنی میں ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے بعد، جب علم انسانی کی سطح اور اونچی ہو جائے گی تو قرآن کی کئی ایسی حقیقتیں جو ہمارے زمانے میں ہنوز بے نقاب نہیں ہوئیں، منکشف ہو کر سامنے آجائیں گی۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ۔ یہ اس لئے کہ قرآن اس خدا کا کلام ہے جس کی نگاہوں سے کوئی حقیقت پوشیدہ نہیں۔ اَوَلَمْ

يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۵۳/۴۱)۔ واضح رہے کہ یہ چیز قرآن کے مجرد حقائق (ABSTRACT TRUTHS) کے متعلق ہے جن کے اسرار و غوامض زمانہ کی سطح کے ساتھ ساتھ کھلتے ہیں۔ جہاں تک قرآن کے احکام کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ متعین ہیں اور محکم۔ البتہ ان کی حکمت اور غایت کے سمجھنے میں زمانے کی علمی ترقی کے ساتھ وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ قرآن فہمی کے ضمن میں اس نکتہ کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہئے۔

اگر کوئی پوچھے کہ وہ سب سے بڑی چیز جو قرآن نے انسان کو دی ہے (اور جو انسان کو کہیں اور نہیں مل سکتی تھی) کیا ہے؟ تو ایک مختصر سے فقرہ میں اس کا جواب یہ ہوگا کہ قرآن نے انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے، ہر چیز اس کے لئے تابع تسخیر کر دی گئی ہے۔ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۳/۴۵)۔ آدم کے مسجود ملائکہ ہونے کا یہی مطلب ہے۔ باقی رہے خود انسان۔ تو یہ سب پیدائش کے اعتبار سے یکساں طور پر واجب التکریم ہیں وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷)۔ اس لئے کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور تابع فرمان بنا سے (۷۹/۳)۔ اس کے لئے صرف ان قوانین کے اتباع کی ضرورت ہے جو اس کی ذات کی نشوونما کے لئے خدا کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ ان قوانین کے سوا، یہ کسی ضابطہ یا آئین کا پابند نہیں۔ قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۳/۷) تم صرف ان قوانین کا اتباع کرو جو تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے تمہاری جانب بھیجے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور کسی کارساز و کارفرما کا اتباع نہ کرو۔ غور کرو سلیم! کہ یہ کتنی بڑی آزادی ہے جو انسان کو عطا کی گئی ہے۔ دنیا میں انسان کی انتہائی آرزو یہ ہے کہ وہ آزاد ہو۔ آزادی کی خاطر وہ اپنی جان تک بھی دے دیتا ہے۔ اس کی ساری تاریخ، حصول آزادی کی کشمکش کی داستان ہے۔ لیکن اس تمام سعی و کاوش، تگ و تاز اور تپش و گداز کے باوجود یہ آج تک متعین نہیں کر سکا کہ آزادی کہتے کسے ہیں۔ اسے یہ چیز قرآن ہی نے بتائی ہے کہ آزادی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہ ہو ؎

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس　　نکتۂ شرعِ مبین ایں است و بس

قرآن نے بعثتِ محمدیہ کا مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۱۵۷/۷) وہ نوع انسانی کو ان زنجیروں سے آزاد کرا دے گا جن میں وہ جکڑی چلی آرہی تھی اور وہ بوجھ اس کے سر سے اتار دیگا

جس کے نیچے وہ دب رہی تھی۔ قرآن نے ان تمام اطواق و سلاسل کو توڑ کر رکھ دیا جو صدیوں سے انسان کی آزادی کو سلب کئے ہوئے تھے۔ خواہ یہ سلاسل، ملوکیت کے استبداد کی شکل میں تھے، یا پیشوائیت کے تقدس کے رنگ میں۔ خواہ یہ حسب و نسب اور رنگ و نسل کی تفریق کی صورت میں تھے یا اقتصادی طور پر طبقاتی تقسیم کے پیکر میں۔ قرآن نے ان تمام زنجیروں کو توڑ کر، انسان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ آزادی کی فضائے بسیط میں کھلا سانس لے سکے اور اس طرح کائنات میں اپنے صحیح مقام سے آگاہ ہو جائے۔

یہ تھا وہ پیغام جو قرآن نے دیا۔ لیکن اس کی حامل اُمّت نے جو کچھ (اس کے باوجود) اپنے ساتھ کیا اُس کے تصوّر سے روح کانپ اُٹھتی ہے۔ اس نے ان زنجیروں کے ایک ایک ٹکڑے کو، جنہیں قرآن نے اس طرح توڑا تھا، تلاش کر کے اپنی مژگان عقیدت سے اُٹھایا اور نہایت تعظیم و احترام سے اُنہیں پھر سے اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت دینِ او نقشِ از ملوکیت گرفت

چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ ؎

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است رسم و آئینِ مسلماں دیگر است
در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست مصطفیؐ در سینۂ او زندہ نیست

اس کی یہ حالت کیوں ہوئی؟ اس کے متعلق زبان وحی نے خود بتایا کہ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰)۔ اس قوم نے نہ صرف اپنے آپ کو اپنی خود ساختہ زنجیروں میں جکڑ لیا بلکہ قرآن کو بھی، غیروں سے مستعار نظریات و تصوّرات کی رسیوں سے اس طرح باندھ دیا کہ وہ آزادانہ ایک قدم چلنے کے قابل نہ رہا۔ جانے والوں نے قرآن کے ساتھ یہ کچھ کیا اور آنے والوں کے نزدیک اُن جانے والوں کی یہی روش دین میں سند قرار پا گئی۔ چنانچہ اب حالت یہ ہے کہ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اس مسلک کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ اَوَ لَوْ کَانَ الشَّیْطٰنُ یَدْعُوْهُمْ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیْرِ (۳۱/۲۱)۔ خواہ اس طرح شیطان اُنہیں جہنم کے عذاب کی طرف دعوت کیوں نہ دے رہا ہو، یہ اُسی راستے پر چلیں گے، اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ دین کی راہ اندھی تقلید نہیں۔ اس کی راہ یہ ہے کہ مَنْ یُّسْلِمْ

وَجْهَهٗ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ جو شخص اپنے آپ کو خدا کے قوانین کے سامنے جھکا دے اور اس طرح حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (۳۱/۲۲)۔ اس نے ایک سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

لیکن اسلاف پرستی کی جذباتی شدت انسان کے دل میں اس حد تک مخاصمت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ قرآن کی آواز کو سننا تک گوارا نہیں کرتا۔ یہی نہیں، کہ وہ خود اس کی آواز کو سننا نہیں چاہتا، بلکہ اپنے متبعین کو بھی تاکید کرتا ہے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱/۲۶)۔ اس قرآن کی آواز کو قطعاً اپنے کانوں میں نہ پڑنے دو اور نہ ہی اسے کسی اور کو سننے دو۔ جہاں اس کی آواز اُٹھے تم کائیں کائیں کرنے لگ جاؤ، خوب شور مچاؤ، نعرے بلند کرو، فتوے لگانا شروع کر دو۔ ہو سکتا ہے کہ تم اس طرح ان لوگوں پر غالب آجاؤ جو قرآن کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

آج ہماری یہ حالت ہو چکی ہے اس قرآن کے متعلق، جس پر ایمان لانے سے ہم مسلمان کہلاتے ہیں، اور اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہے! وہی قوم جسے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کہا گیا تھا (یعنی دنیا میں سب پر غالب) وہ آج دنیا میں سب سے ذلیل ہے اور در بدر دھکے کھا رہی ہے مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا (۱۸/۷) اور مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (۲۹/۱۷)۔ دھتکاری اور پھٹکاری ہوئی درماندہ اور واماندہ۔ جنّت سے نکلے ہوئے آدم کی طرح حیران اور پریشان، مایوس اور محروم۔

لیکن یہ مایوسی اور محرومی پھر سے شادکامی اور سرفرازی میں بدل سکتی ہے بشرطیکہ ہم پھر اُسی قرآن کی طرف آجائیں جس نے ہمیں ایک بار وہ سربلندی و کامرانی عطا فرمائی تھی، جس کی مثال انسانیت کی تاریخ میں کہیں نہیں مل سکتی۔ اس نے جنّت سے نکلے ہوئے آدم سے کہا تھا کہ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۳۸/۲)۔ جو قوم بھی خدا کی طرف سے ملی ہوئی راہنمائی کا اتباع کرے گی اسے نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حزن۔ نہ سرگردانی ہوگی، نہ پریشانی۔

یہ ہے عزیزم! اس قرآن کا اجمالی سا تعارف جس کے متعلق خود خدا نے کہا ہے کہ اس کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ کہ یہ دنیا کی ہر نعمت سے گراں بہا اور ہر دولت سے زیادہ بیش قیمت ہے۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۵۸/۱۰) ؎

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم | حکمتِ او لایزال است و قدیم
پختہ تر سودائے خام از زورِ او | در فتد با سنگِ جام از زورِ او
می برد پابند و آزاد آورد | صید بنداں را بفریاد آورد
ارج می گیرد ازو نا ارجمند | بندہ را از سجدہ سازد سربلند

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ اُو رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

زہے صد عید ہے وہ ساعت جس میں دنیا کو ایسا پیام حیات ملا اور دہ خود ہزار تہنیت ہے وہ امت جسے اس پیام کی وراثت کے لئے منتخب کیا گیا (۳۵/۳۲) ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

یہ ہے سلیم! قرآن کا وہ تعارف جسے خود قرآن نازل کرنے والے (خدا) نے کرایا ہے۔

والسلام

پرویز

مئی ۱۹۵۷ء

اٹھائیسواں خط

(اندھے کی لکڑی)

نہیں سلیم! یہ جو تم نے اندھوں کی قطار دیکھی ہے، کوئی نئی چیز نہیں۔ ہم اپنے بچپن سے انہیں اسی طرح دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اور اسی طرح ہمارے بڑے بوڑھوں نے انہیں دیکھا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ اُس زمانے میں ان کی تعداد کم تھی اب زیادہ ہوگئی ہے۔ نیز اُس وقت سب سے آگے چلنے والے کو کچھ کچھ نظر آیا کرتا تھا۔ اب وہ بھی بالکل اندھا ہو چکا ہے اور محض قیاس اور مدت دراز کی مشق کے زور پر اپنے جیسے اندھوں کی راہ نمائی کرتا ہے۔ جب میں نے انہیں دیکھا تھا تو سب سے آگے ایک اور اندھا ہوا کرتا تھا۔ اس کے مرنے پر، اُس سے پچھلے اندھے کو ترقی (PROMOTION) مل گئی اور وہ ان کا راہ نما بن گیا اور لائن کے آخر میں دو چار اندھوں کا اور اضافہ ہو گیا۔ اگلے کی لکڑی پچھلے کے لئے "دلیل راہ" یا "مشعل ہدایت" بن گئی۔ جس طرف اگلا مڑا، پچھلے بھی مڑ گئے۔ جہاں وہ ٹھہرا، یہ بھی ٹھہر گئے۔ جس قسم کی..... آواز اس نے نکالی، اُنہوں نے بھی اس کی نقل اتار دی۔ یہ ٹھیک ایک وقت پر بھیک مانگنے نکلتے ہیں اور دن بھر متعین راستوں پر چلتے، شام کو واپس چلے جاتے ہیں۔ یہی ان کی مقررہ روش ہے جس پر یہ عمر بھر چلتے رہتے ہیں، اور چلتے چلتے بالآخر قبر تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور چونکہ ساتھ کے ساتھ قطار میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے ان کا یہ سلسلۂ دراز ختم نہیں ہوتا۔

پہلے دن سے ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا ہے اور آج بھی وہی کچھ ہو رہا ہے۔ اندھے بدلتے جاتے ہیں لیکن ان کی قطار بدستور قائم رہتی ہے۔ نہ ان کی روش میں فرق آتا ہے، نہ راستوں میں تبدیلی۔ نہ ان کی آواز بدلتی ہے، نہ رفتار۔ جب کسی پچھلے سے پوچھئے کہ تم اس راستے پر کیوں جا رہے ہو، تو وہ اطمینان سے کہہ دیتا ہے کہ، اس لئے کہ مجھ سے آگے چلنے والا اسی راستے پر جا رہا ہے، اور جب سب سے آگے چلنے والے سے پوچھئے تو وہ کہہ دیتا ہے کہ میں نے جس کی جگہ لی ہے وہ اسی راستے پر

چلا کرتا تھا۔ اور چونکہ وہ پیشرو مرچکا ہوتا ہے، اس لئے آپ کسی سے پوچھ ہی نہیں سکتے کہ وہ اس راستے پر کیوں چلا کرتا تھا۔

غور کرنے پر تمہیں نظر آجائے گا سلیم! کہ اندھوں کی ایک قطار ہے جو شاہراہ انسانیت پر، روز ازل سے آج تک مسلسل و متواتر چلی آرہی ہے۔ جب کوئی آنکھوں والا ان سے کہتا ہے کہ تم جس راستے پر جارہے ہو وہ غلط ہے تو وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ہم نے اپنے بڑوں کو اسی راستے پر چلتے دیکھا ہے اس لئے ہم اسی راستے پر چلتے جائیں گے ان آنکھوں والوں میں سب سے پہلے ہمارے سامنے حضرت نوحؑ آتے ہیں۔ اُنہوں نے ان اندھوں سے کہا کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (۲۳/۲۳)۔ تم صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت اور محکومی اختیار کرو۔ اسکے سوا کوئی صاحبِ اقتدار ہستی ایسی نہیں جس کی تم اطاعت کرو۔

بات کس قدر صاف اور واضح تھی لیکن اُنہوں نے نہ تو اسے قبول کیا اور نہ ہی اس کی تردید میں کوئی دلیل پیش کی۔ کہا تو صرف اتنا کہ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ (۲۳/۲۴)۔ ہم نے اپنے آباء و اجداد میں سے کسی سے یہ بات نہیں سُنی۔ اس لئے ہم اسے سننے کے لئے تیار نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ جو بات تم کہتے ہو اس میں ہمارے نزدیک یہ غلطی اور یہ سقم ہے بلکہ یہ کہ، جس راستے کی طرف تم بلاتے ہو، چونکہ ہم سے پہلے اندھے اس راستے پر نہیں چلا کرتے تھے، اس لئے ہم بھی اسے اختیار نہیں کر سکتے۔ ہم اسی روش پر چلتے جائیں گے جس روش پر وہ چلا کرتے تھے۔

حضرت نوحؑ کے بعد ہم حضرت صالحؑ کو دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اپنی قوم سے یہی کہتے ہیں کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (۱۱/۶۱)۔ اس کے جواب میں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (۱۱/۶۲) جن معبودوں کی پرستش ہمارے آباء و اجداد کیا کرتے تھے، تو ہمیں ان کی پرستش سے روکتا ہے؟ یعنی وہی آباء جنہوں نے حضرت نوحؑ اور حضرت ہودؑ کے زمانے میں صحیح روش اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا، اب ان کے لئے دلیل اور سند بن گئے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اندھا پہلے مرجائے، وہ بعد میں آنے والوں کے لئے آنکھوں والا بن جاتا ہے۔

اس کے بعد ہمارے سامنے حضرت ابراہیمؑ آتے ہیں۔ وہ اپنے باپ اور قوم سے کہتے ہیں کہ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (۲۱/۵۲)۔ ان مورتیوں کی حیثیت کیا ہے جن سے تم یوں چمٹے بیٹھے ہو؟ تم انہیں اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو اور پھر ان کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے ہو؟ سوچو کہ اس روش میں عقل اور انسانیت کی کوئی رمق تک بھی ہے؟ اس کے جواب میں ان اندھوں نے وہی کچھ کہا جو ان سے پہلے اندھے کہتے تھے قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ (۲۱/۵۳)۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو انہی کی پرستش کرتے دیکھا ہے۔ اس لئے ہم بھی ان کی پرستش کرتے ہیں ہم اپنے اسلاف کے راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس جواب پر حضرت ابراہیمؑ

کو غصہ تو بہت آیا (اور ہر سمجھ دار کو غصہ آئے گا) لیکن اُن عقل کے اندھوں سے اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا تھا کہ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۲۱/۵)۔ تم اور تمہارے اسلاف کس قدر کھلی ہوئی گمراہی میں تھے! لیکن "کھلی ہوئی گمراہی" تو اسے ہی نظر آسکتی ہے جو اپنی آنکھوں سے کام لے۔ جو آنکھیں بند کئے اگلے اندھے کی لکڑی کے سہارے چلا جا رہا ہو، اسے غلط اور صحیح راستے میں تمیز کس طرح ہو سکتی ہے؟

اور وہ دیکھو سلیم! قوم مدین سے حضرت شعیبؑ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ (۱۱/۸۴)۔ اطاعت اور محکومی صرف ایک خدا کے قانون کی ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا کائنات میں کوئی اور صاحب اقتدار و اختیار نہیں۔ اس کے جواب میں ان کی قوم کیا کہتی ہے؟ وہی جو ان سے پہلے اندھے کہتے تھے۔ قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ (۱۱/۸۷)۔ اے شعیب! کیا تمہاری صلوٰۃ تمہیں اس کا حکم دیتی ہے کہ ہم ان کی پرستش چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے تھے؟

وہی اندھے کی لکڑی!

دعوت حق و صداقت کے جواب میں یہی کچھ حضرت موسیٰؑ کے مخالفین نے کہا۔ ان کا جواب یہ تھا کہ اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا (۱۰/۷۸)۔ کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اس راہ سے پھیر دے جس راہ پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے؟

تم نے دیکھا سلیم! کہ شروع سے آخر تک کس طرح ان اندھوں کی طرف سے ایک ہی جواب ملتا چلا آرہا ہے۔ اندھے، اس کے سوا، کوئی اور جواب دے ہی نہیں سکتے تھے۔ اُن کے پاس اپنی روش کے جواز میں کوئی دلیل اور برہان نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ دلیل اور برہان اس کے پاس ہوتی ہے جس نے کسی راستے کو دیکھ بھال کر، اپنے انتخاب سے اختیار کیا ہو۔ لیکن جو شخص کسی راستے پر اس لئے چل رہا ہو کہ اس کے آباؤ اجداد اُسی راستے پر چلا کرتے تھے، اُس کے لئے دلیل و برہان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اگر مسلمانوں کے گھر پیدا ہو گیا تو اس نے مسلمانوں کا راستہ اختیار کر لیا۔ اگر ہندوؤں کے گھر پیدا ہو جاتا تو انہی کے راستے پر چلنے لگتا۔

یہ تو انبیائے سابقہ کا تذکرہ تھا۔ جب نبی اکرمؐ نے اپنی دعوت پیش کی ہے تو آپ کو بھی اس کا وہی جواب ملا جو پہلے انبیاء کرامؑ کو ملا کرتا تھا۔ یعنی حضورؐ کی دعوت پر اگلے اندھے نے پچھلے اندھوں سے کہا کہ مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ یُّرِیْدُ اَنْ یَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ (۳۴/۴۳)۔ یہ شخص چاہتا ہے کہ جن چیزوں کی پرستش تمہارے آباؤ اجداد کیا کرتے تھے تمہیں اس راستے سے روک دے۔ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ (۳۸/۷)۔ جو کچھ یہ

کہتا ہے ہم نے اسے اپنے پچھلے مسلک و مذہب میں کہیں نہیں سُنا۔ اس لئے اس کی بات سچی نہیں ہو سکتی۔ اِنْ ھٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ (۳۸/۷)۔ یہ محض بناوٹ ہے۔ اس کا خودساختہ دعویٰ ہے۔ حق و صداقت کا راستہ وہی ہے جس پر ہم اپنے اسلاف کی تقلید میں چلتے آرہے ہیں۔

غرضیکہ حضرت نوحؑ ہوں یا ہودؑ۔ حضرت صالحؑ ہوں یا شعیبؑ۔ حضرت موسیٰؑ ہوں یا نبی آخرالزماںؐ۔ ہر آنکھوں والے کو اندھوں کی قطار کی طرف سے یہی جواب ملتا رہا کہ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۴۳/۲۲)۔ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک طریق پر چلتے دیکھا ہے اور ہم اُنہی کے نقشِ قدم پر چلتے جائیں گے۔ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ (۴۳/۲۴)۔ ان کے رسول ان سے کہتے رہے کہ جس راستے کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں اگر وہ راستہ تمہارے اسلاف کے راستے سے زیادہ واضح، صحیح، روشن اور یقینی طور پر منزل کی طرف لے جانے والا ہو، تو کیا تم پھر بھی اسلاف ہی کے راستے کو ترجیح دو گے؟ وہ کہتے کہ ہمارے لئے مقابلہ اور انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ہم کوئی اور بات سننا ہی نہیں چاہتے اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (۴۳/۲۳)۔ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک راستے پر چلتے پایا ہے اور ہم اُنہی کے نقشِ قدم پر آنکھیں بند کئے چلتے جائیں گے۔ ان سے کہا جاتا کہ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ (۵/۱۰۴)۔ اگر صورت یہ ہو کہ تمہارے آباؤ اجداد کو حقیقت کا کچھ علم نہ ہو اور وہ ساری عمر غلط راستے پر چلتے رہے ہوں، تو کیا تم پھر بھی اُنہی کے نقشِ قدم پر چلتے رہو گے؟ جواب ملتا کہ بے شک! ہم اسی راستے پر چلتے رہیں گے۔ اس لئے کہ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۵/۱۰۴)۔ ہمارے اطمینان کے لئے یہ کافی ہے کہ ہم اپنے آباء کے راستے پر چل رہے ہیں۔ ہمیں اس سے زیادہ اور کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ شاہراہ انسانیت پر کس طرح اندھوں کی ایک قطار ہے جو مسلسل و متواتر ایک ہی ڈگر پر چلے جا رہی ہے۔ ہر پچھلا اندھا اگلے اندھے کو اپنا ہادی اور راہ نما سمجھتا ہے اور اس کی لکڑی کو اپنی روش کے برسرِحق ہونے کی دلیل و حجت قرار دیتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ، آنکھیں رکھنے کے باوجود، اس قسم کی اندھی روش کو پسند کیوں کرتے ہیں؟ قرآن نے اس کا جواب ایک لفظ میں دے دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (۴۳/۲۳)۔ اسی طرح، ہم نے جس قوم کی طرف بھی کوئی رسول بھیجا، تو اس قوم کے مترفین نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک روش پر چلتے پایا ہے اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر چلتے جائیں گے۔ مُتْرَفِيْنَ

کے معنی ہیں، وہ لوگ جو خود کچھ کام کرنا نہ چاہیں اور دوسروں کی کمائی پر عیش اڑائیں ۔ سہل انگار، محنت سے جی چرانے والے اس میں دونوں باتیں آگئیں ۔ پہلی بات تو یہ کہ اندھی تقلید میں انسان کے ذہن کو ذرا بھی محنت نہیں کرنی پڑتی ۔ سوچ سمجھ کر راستہ اختیار کرنے کے لئے انسان کو ذہنی کاوش اور فکری جدوجہد کرنی پڑتی ہے ۔ یہ کچھ آسان کام نہیں ۔ اس کے برعکس اسلاف کی پامال راہوں اور آباؤ اجداد سے وراثتاً منتقل ہو کر آنے والے مسلک پر چلنے کے لئے کسی سعی و کاوش اور تگ و تاز کی ضرورت ہی نہیں ہوتی ۔ کوئی سوال سامنے آئے، اس کے متعلق بس اتنا بتانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس باب میں فلاں امام نے یہ کہا ہے اور فلاں بزرگ کا یہ ارشاد ہے ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کوئی فکری کاوش درکار نہیں ہوتی ۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی قوموں میں سب سے بڑا عالم وہ ہوتا ہے جسے سب سے زیادہ حوالے (REFERENCES) یاد ہوں ۔ یعنی جو سب سے بڑا (CATALOGUER) ہو وہ سب سے بڑا عالم ہوتا ہے ۔ اس کے لئے صرف حافظہ (MEMORY) کی ضرورت ہوتی ہے، فکر (INTELLECT) کی ضرورت قطعاً نہیں ہوتی ۔

دوسرے یہ کہ اس روش سے، روٹی بڑی آسانی سے مل جاتی ہے ۔ عوام جس راستے پر چل رہے ہوں، آپ اس کی تائید کرتے جائیے ۔ پھر دیکھئے کہ کس طرح آپ کی پرستش ہوتی ہے ۔ یہ جو تم بڑی بڑی مقدس دکانیں دیکھ رہے ہو اور ان کی بکری پر اس قدر متعجب ہوتے ہو، تو ان کی تجارت کا راز (TRADE SECRET) ہی یہ ہے کہ عوام کو مطمئن اور خوش رکھا جائے اور عوام کے خوش رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان سے کہا جائے کہ جس راستے پر تم اور تمہارے آباؤ اجداد چلتے آرہے ہیں وہ راستہ سیدھا جنت میں لے جانے کا ہے ۔

تجارت کا دوسرا راز یہ ہے کہ ہم پیشہ لوگ آپس میں کتنی ہی سر پھٹول کیوں نہ کریں، جونہی کوئی باہر کا آدمی اس پیشہ کے خلاف کچھ کہے، سب اس کی مخالفت میں متحدہ محاذ بنا لیں ۔ یہ جو تم مختلف پیشوں (PROFESSIONS) والوں کی (UNIONS) دیکھتے ہو تو ان کی وجۂ جامعیت اپنے پیشے کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے ۔ یہی وہ چیز ہے جو مذہبی مترفین کو باہمدگر مربوط رکھتی ہے ۔ اس حقیقت کو حضرت ابراہیمؑ نے بڑے لطیف انداز میں بیان کیا تھا، جب انہوں نے بُت خانہ کے متریوں (مذہبی پیشواؤں) سے کہا، کہ تم میں سے اکثر ایسے ہیں جو جانتے ہیں کہ بتوں کی حقیقت کیا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود اس کے خلاف لب کشائی نہیں کرتے کیونکہ ان بتوں کی وجہ سے اُن کا مذہبی جتھہ بنا ہوا ہے ۔ اگر اس جتھہ میں کمزوری آجائے تو یہ جو اس وقت عیش کی زندگی بسر ہو رہی ہے، وہ باقی نہ رہے گی ۔ وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۲۹/۲۵) ۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ تم نے خدا کو چھوڑ کر بُت پرستی اس لئے اختیار کر رکھی ہے کہ اس سے دنیاوی زندگی میں تم میں باہمی ربط اور پیوستگی قائم رہتی ہے ۔ اس سے تمہارا جتھہ بنا ہوا ہے

اور جتھے میں رہتے ہوئے تمہیں بہت سے مفاد حاصل ہیں۔

اس جتھے کو مضبوط رکھنے کے لئے ان کی ٹکنیک یہ ہوتی ہے کہ جونہی انہیں کسی طرف سے کوئی خطرہ محسوس ہوا، انہوں نے یہ کہہ کر عوام کو بھڑکانا شروع کر دیا کہ دیکھنا! یہ شخص تمہارے دین میں فتنہ پیدا کرتا ہے۔ یہ تمہیں اس روش سے ہٹانا چاہتا ہے جس پر تمہارے آباؤ اجداد چلتے تھے۔ یہ کہتا ہے کہ تمہارے اسلاف گمراہ تھے۔ اگر تم نے اس فتنہ کا سر نہ کچلا تو یہ تمہارے معبودوں کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ اٹھو۔ قَالُوا اقْتُلُوْهُ (۲۹/۲۴)۔ اسے قتل کر دو۔ حَرِّقُوْهُ۔ اسے زندہ جلا دو۔ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ (۲۱/۶۸)۔ اور اس طرح اپنے معبودوں کا بول بالا کر دو۔ یہی وہ حربہ ہے جسے فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے خلاف استعمال کرنا چاہا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے اس سے کہا کہ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ (۲۰/۴۷)۔ تم بنی اسرائیل پر ظلم و ستم سے باز آجاؤ اور انہیں ہمارے ساتھ جانے دو تاکہ یہ آزادی کی فضاؤں میں سانس لے سکیں۔ بجائے اس کے کہ فرعون اس نقطہ پر بات کرتا، اس نے بات کا رُخ بدل کر چاہا کہ حضرت موسیٰؑ کو خاردار جھاڑیوں میں الجھا دیا جائے۔ فرعون کے دربار میں اس کے امراء و وزراء بیٹھے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ خود بھی باطل پرست تھے اور ان کے آباؤ اجداد بھی گمراہ۔ فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ یہ بتاؤ کہ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى (۲۰/۵۱)۔ جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں (یعنی ان امراء و وزراء کے اسلاف) وہ کس حال میں ہیں؟ ان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ جنت میں ہیں یا جہنم میں؟ صاف ظاہر ہے کہ اس سوال سے فرعون کے پیش نظر کیا شرارت تھی؟ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے سامنے کون ہے؟ اس کے سامنے تھا خدا کا رسول جو ایسے مقامات کی نزاکتوں سے خوب واقف ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے اس کے جواب میں کہا کہ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى (۲۰/۵۲)۔ ان کا علم میرے رب کے ہاں مکافات عمل کے رجسٹر میں درج ہے۔ وہ اس باب میں نہ بھولتا ہے، نہ غلطی کرتا ہے۔ ان کا معاملہ اُسی کے ساتھ ہے۔ تم مجھے بتاؤ کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دیتے ہو یا نہیں؟

یہی کچھ مترفین کا طبقہ پہلے کرتا تھا۔ یہی کچھ وہ آج کرتا ہے۔ جونہی کسی نے ان سے کہا کہ جس روش پر تم چل رہے ہو اور عوام کو چلا رہے ہو، اس کے متعلق اتنا تو دیکھ لو کہ یہ قرآن کے مطابق صحیح ہے یا غلط۔ تو انہوں نے عوام کو بھڑکانا شروع کر دیا کہ اقتلوہ وحرقوہ۔ پکڑ لو، جانے نہ دو، یہ فتنہ ہے۔ اس کا سر کچل دو۔ مقصد اس سے صرف یہ کہ کہیں ان کی بے صبری کا پول نہ کھل جائے اور جو عیش، محنت کئے بغیر حاصل ہیں، ان پر زد نہ پڑے۔ اس کے لئے ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ قوم کو سوچنے سے باز رکھا جائے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کے متبعین نے سوچنا شروع کر دیا تو وہ ان سے باغی ہو جائیں گے۔

لیکن اسی سے سلیم! اتنا ہی نہیں ہوتا کہ قوم وقتی طور سوچنا چھوڑ دیتی ہے۔ اس کا اثر بہت دور رس اور اس کے نتائج بڑے تباہ کن ہوتے ہیں۔ فطرت کا قانون یہ ہے کہ اگر کوئی ذی حیات کچھ عرصہ تک اپنے کسی عضو سے کام لینا چھوڑ دے اور یہ روش کچھ نسلوں تک متواتر قائم رہے، تو اس کے بعد وہ عضو ہی معدوم ہو جاتا ہے۔ تمہیں یاد ہے، نئی دہلی میں گول ڈاک خانہ کے قریب ایک اندھا لڑکا بھیک مانگا کرتا تھا۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ وہ لڑکا شروع میں اندھا نہیں تھا اس نے اندھا بن کر بھیک مانگنی شروع کی۔ وہ دن بھر اپنی آنکھیں بند کئے بیٹھا رہتا۔ دو چار سال کے بعد اس کی بینائی سچ مچ جاتی رہی۔ یہی حال قوموں کا ہے جب کوئی قوم، اندھی تقلید کا مسلک اختیار کر کے، غور و فکر کرنا چھوڑ دے تو کچھ مدت کے بعد اس قوم سے غور و فکر کی صلاحیت ہی سلب ہو جاتی ہے۔ تم مجھ سے بار بار پوچھا کرتے ہو کہ مسلمانوں میں ارباب فکر و نظر کا اس قدر قحط کیوں ہے؟ ان کے ہاں صاحبانِ عقل و بصیرت کیوں نہیں پیدا ہوتے جب کہ دنیا کی دوسری قوموں میں ان کی اتنی فراوانی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قوم نے صدیوں سے فکر و بصیرت سے کام لینا چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے فطرت کے اٹل قانون کے مطابق، ان سے فکر و تدبر کی صلاحیت ہی مفقود ہو گئی ہے۔ اس گول ڈاک خانے والے اندھے کی طرح ان کی بینائی سلب ہو چکی ہے۔ تقلید کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُمْ مُقْمَحُونَ (۳۶/۸)۔ ان کی گردنوں میں ایسے طوق ڈال دیئے جاتے ہیں جن سے ان کے سر اٹھے کے اٹھے رہ جاتے ہیں اور وہ اپنی گردن ٹھوڑی سے نیچے کر نہیں سکتے۔ اس لئے انہیں اپنے سامنے کا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (۳۶/۹)۔ ان کے سامنے بھی روک پیدا ہو جاتی ہے اور پیچھے بھی۔ ان کی عقلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور ان کی بینائی سلب ہو جاتی ہے۔ وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۳۶/۱۰) انہیں سمجھانا نہ سمجھانا برابر ہوتا ہے۔ یہ کبھی سیدھا راستہ اختیار نہیں کریں گے۔ إِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَإِلَى الْجَحِيمِ (۳۷/۶۸) ان کی یہ روش انہیں جہنم کی طرف کھینچ کر لے جائے گی اس لئے کہ إِنَّهُمْ أَلْفَوْا آبَاءَهُمْ ضَالِّينَ (۳۷/۶۹)۔ انہوں نے جس گمراہ کن روش پر اپنے باپ دادا کو پایا، اسی روش پر یہ خود چلے جا رہے ہیں۔ چونکہ ان کی نگاہیں ہمیشہ اسلاف کی طرف لگی رہتی ہیں، اس لئے ان کے ذہن میں ماضی تو درخشندہ اور تابناک ہوتا ہے اور مستقبل تیرہ و تار۔ ان سے جب سنئے، یہ اپنے ماضی کے قصے دہراتے رہیں گے اور اس سے بہت خوش ہوں گے۔ یہ ماضی کو ست جگ (حق و صداقت کا زمانہ) اور مستقبل کو کل جگ (تباہی کا دور) قرار دیں گے۔ تمہیں یاد ہے، شملہ میں وہ لڑکا۔ فتو گوجر۔ جب تمہیں راستہ دکھانے کے لئے سڑک تک جاتا تھا تو لالٹین لے کر تمہارے پیچھے پیچھے چلتا تھا اور تمہیں بار بار کہنا پڑتا تھا کہ روشنی لے کر آگے آگے چلو۔ لالٹین کے پیچھے رکھنے سے،

سے کہ وہ راستہ تو روشن ہو جاتا تھا۔ لیکن سامنے کا راستہ خود تمہارے سائے سے تاریک تر ہو جاتا تھا یہی حالت ماضی پرست قوم کی ہو جاتی ہے۔ اس کے نزدیک گزرا ہوا زمانہ درخشندہ ہوتا ہے اور اپنا زمانہ اور آنے والا دور تاریک یہی وہ جہنمی ذہنیت ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہاں چہرے اُلٹے ہوتے ہیں۔ یعنی آنکھیں سامنے کے بجائے پیچھے کی طرف ہوتی ہیں۔ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ (۳۳/۶۶)۔ اس کی وجہ کیا ہوتی ہے اس کی تصریح اگلی آیت میں کر دی جہاں فرمایا کہ وہ کہیں گے کہ إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا (۳۳/۶۷)۔ بجائے اس کے کہ ہم اپنی عقل و فکر سے کام لے کر زندگی کی صحیح روش پر چلتے، جو خدا نے متعین کی تھی، ہم اپنے بڑوں کی اطاعت کرتے رہے اور اُنہوں نے ہمیں یوں گمراہ کر دیا۔ یہی ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ لوگ انسانی سطح سے نیچے گر کر حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ "بھیڑ چال" کا محاورہ حیوانی سطح کا آئینہ دار ہے۔ اندھوں کی یہ قطار، انسانوں کا گروہ نہیں بلکہ، حیوانوں کا گلہ ہوتی ہے۔ دیکھو سلیم! قرآن کس قدر واضح الفاظ میں اس حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ۔ انسان شہری ہوں یا دیہاتی وہ زبانِ حال سے پکار رہے ہوتے ہیں کہ وہ جہنمی ہیں۔ اس لئے کہ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سینے میں دل تو رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا۔ ان کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں لیکن اُن سے دیکھنے بھالنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں، لیکن ان سے سُننے کا کام نہیں لیتے۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ۔ یہ دیکھنے میں انسان نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت حیوانوں کی مانند ہوتے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ اس لئے کہ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۷/۱۷۹)۔ یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں کہ انسانیت نام ہی اس کا ہے کہ اپنی عقل و فکر سے کام لیا جائے۔ اندھوں کی قطار میں چلنے والے، انسان نہیں حیوان ہوتے ہیں۔ بھیڑ چال، انسانیت کا خاصہ نہیں، حیوانی روش ہے۔ اسی حقیقت کو سورۂ بقرہ میں بانداز دگر بیان کیا گیا ہے۔ پہلے یہ کہا کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ مَا أَنزَلَ اللَّهُ (قرآن) کا اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی روش کا اتباع کرتے رہیں گے مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا۔ جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا ہے کہ خواہ تمہارے آباؤ اجداد کچھ بھی عقل و شعور نہ رکھتے ہوں اور غلط راستوں پر چلتے رہے ہوں، تم اس پر بھی انہی کی پیروی کرتے رہو گے؟ (۲/۱۷۰)۔ اس کے بعد ہے وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً۔ یہ لوگ جو سیدھے راستے پر چلنے سے انکار کرتے ہیں، اُن کی مثال یوں سمجھو جیسے بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ ہو اور ان کے پیچھے چرواہا۔ چرواہے نے اپنے بڑے بوڑھوں

سے کچھ آوازیں سیکھ رکھی ہیں بلا الفاظ۔ اور کچھ الفاظ یاد کر رکھے ہیں بلا معنی و مطلب۔ وہ یہ آوازیں نکالتا اور الفاظ دہراتا ہے اور بھیڑ ہیں، بکریاں جوان اشاروں کی عادی ہو چکی ہیں، بلا سوچے سمجھے اِدھر اُدھر مُڑ جاتی ہیں۔ بس یہی حالت آباء کی تقلید کرنے والوں کی ہے۔ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۲/۱۷۱)۔ بہرے، گونگے، اندھے، عقل و خرد سے کام نہ لینے والے جانور۔ انہیں انسان کون کہہ سکتا ہے؟

اس آیت پر پھر غور کرو سلیم! کہ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (قرآن) کا اتباع کرو تو یہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اس مذہب و مسلک کی پیروی کرتے رہیں گے جس پر ہمارے آباؤ اجداد چلتے رہے ہیں۔ یعنی قرآن (ما انزل اللّٰہ) کے اتباع اور مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (اسلاف کے مسلک) کے اتباع کو ایک دوسرے کے مقابل لایا ہے۔ تم دیکھو گے سلیم! کہ یہ چیز جس طرح نزولِ قرآن کے زمانہ میں حقیقت تھی، اُسی طرح آج بھی حقیقت ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے فرقے ہیں۔ جن کی کیفیت یہ ہے کہ، وہ ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق میں اُلجھے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، وہ ایک دوسرے کو برداشت (TOLERATE) کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان سب میں قدرِ مشترک اسلاف کی تقلید ہوتی ہے (فرقہ بنتا ہی اسلاف کی تقلید سے ہے)۔ لیکن اگر کوئی شخص انہیں قرآن کے اتباع کی طرف دعوت دے تو یہ سب پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اُسے "دین" کا عظیم فتنہ قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ وہی ہے جو قرآن نے بیان کی ہے۔ مختلف فرقے، ایک دوسرے سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رکھیں، ان میں سے کوئی بھی مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا کے خلاف نہیں ہوتا اس کے خلاف آواز اسی کی ہوتی ہے جو قرآن کی طرف دعوت دیتا ہے۔ یہ آواز ان میں سے کسی کے لئے بھی قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ قرآن سورۂ بقرہ کی ایک آیت میں بیان کی ہے۔ لیکن آیت کے سامنے آنے سے پہلے، ایک اہم نکتہ کا تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے۔ بچہ اپنی پیدائش کے بعد، اپنی مملکت میں حکمران ہوتا ہے۔ جب جی چاہتا ہے سوتا ہے، جب جی چاہتا ہے جاگتا ہے۔ بھوک لگتی ہے تو اُس کی ایک آواز (رونے) پر دودھ حاضر ہو جاتا ہے۔ سردی لگتی ہے تو خود بخود کپڑا اُس کے اوپر آ جاتا ہے۔ گرمی لگتی ہے تو پنکھا ہلنے لگ جاتا ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔ لیکن جوں جوں وہ بڑا ہوتا ہے اُس کے ان اختیارات و اقتدارات میں کمی واقع ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ اب وہ گھر میں اپنے بجائے ایک اور شخصیت کو صاحبِ اختیار و اقتدار دیکھتا ہے۔ یہ شخصیت اُس کے باپ کی ہوتی ہے۔ وہ گھر کا حاکمِ اعلیٰ ہوتا ہے۔ وہی کھانے پینے کو دیتا ہے۔ اُسی کا فیصلہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ میں قولِ فیصل ہوتا ہے۔ گھر کا ہر فرد اسی سے ہدایت لیتا اور اسی کے اشاروں پر چلتا ہے۔ یہ آسرا بچے کے لئے بہت بڑا آسرا اور یہ سہارا بہت محکم سہارا

ہوتا ہے۔ جس قوم میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا صحیح انتظام ہو اس کے بچے، عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ، ذہنی پختگی میں بھی بڑھتے جاتے ہیں، تا آنکہ ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب وہ (ذہنی طور پر) باپ کے سہارے کے محتاج نہیں رہتے۔ لیکن جن قوموں میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا صحیح انتظام نہیں ہوتا (اور زوال آمادہ اقوام میں ہی ہوتا ہے) ان کے بچے عمر کے لحاظ سے تو جوان ہو جاتے ہیں لیکن ذہنی اعتبار سے بچے کے بچے ہی رہتے ہیں۔ اس لئے وہ عمر بھر سہاروں کے محتاج رہتے ہیں۔ جب باپ زندہ ہو، ہر معاملہ میں راہنمائی اور فیصلہ کے لئے اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جب وہ مر جائے تو وہ، زندگی کے ہر دوراہے پر، ان کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جن میں ان کے آباؤ اجداد کے اقوال اور فیصلے درج ہوں۔ ایسی قوموں کے نزدیک، آباؤ اجداد کی عقل سے بڑھ کر، کسی کی عقل اور ان کے فیصلوں سے بہتر، کسی کے فیصلے نہیں ہوتے وہ اسی میں عافیت سمجھتے ہیں کہ اسلاف کے نقش قدم پر آنکھیں بند کئے چلتے جائیں۔ وہ یہ کچھ کرتے تو اس لئے ہیں کہ ان کا اپنا ذہن ناپختہ ہوتا ہے اور اس میں معاملات کے فیصلے کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، لیکن چونکہ انسان کا نفس بڑا حیلہ تراش واقع ہوا ہے اس لئے وہ انہیں یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیتا کہ وہ ایسا کچھ اپنی ذہنی کمزوری کی وجہ سے کرتے ہیں (کیونکہ اس سے ان کی شکست پندار ہوتی ہے) بلکہ انہیں سمجھاتا یہ ہے کہ وہ یہ کچھ اسلاف کے احترام اور بزرگوں کی تعظیم کی وجہ سے کرتے ہیں۔ وہ انہیں کہتا یہ ہے کہ ان کی تعظیم و احترام کا تقاضا ہے کہ ع

خطائے بزرگاں گرفتن خطا ست

اگر ان کی کسی بات کے متعلق علم بھی ہو جائے کہ وہ غلط ہے، تو بھی اس پر گرفت نہیں کرنی چاہیئے، بلکہ سمجھنا یہی چاہیئے کہ ان کی غلطی میں بھی مصلحت کا کوئی پہلو ہوگا۔ رفتہ رفتہ اسلاف کا یہ احترام ان کے دل میں اس درجہ راسخ ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان کی کسی غلطی کی طرف اشارہ کرے تو اس سے انہیں اسی طرح غصہ آجاتا ہے جیسے کسی نے ان کے باپ کو گالی دی یا ان کے معبود کی شان میں گستاخی کی ہو۔ اسی کا نام اسلاف پرستی (ANCESTOR WORSHIP) ہے، جسے قرآن شرک قرار دیتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اس نے سورۂ بقرہ کی اس آیت میں بیان کیا ہے جسے درج کرنے سے پہلے میں نے تمہیداً یہ کچھ لکھا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (۲/۱۶۵) ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کے سوا اوروں کو اسی جیسا معبود بنا لیتے ہیں اور ان میں ایسی ہی کشش و جاذبیت محسوس کرتے ہیں جیسی خدا میں کرنی چاہیئے۔ اس کے برعکس جو لوگ خدا کے بتائے ہوئے راستے کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں ان کے لئے قانون خداوندی کی کشش و جاذبیت سب سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (۲/۱۶۵)۔

قرآن کے متعلق مسلمانوں کی ذہنیت یہ ہو چکی ہے کہ جب اُن کے سامنے اس قسم کی آیات پیش کی جاتی ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ یہودیوں کے متعلق ہے، یہ عیسائیوں کے متعلق۔ فلاں آیت قریش مکّہ کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ فلاں منافقین مدینہ کے متعلق۔ گویا یہ تمام آیات دوسروں کے متعلق ہیں۔ ہمارا اُن سے (اور اُن کا ہم سے) کوئی واسطہ نہیں۔ یہی کچھ ہم اُن آیات کے متعلق کہہ دیتے ہیں جن میں قرآن نے اسلاف کی تقلید سے منع کیا ہے۔ ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ یہ آیات یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکّہ کے متعلق ہیں، ہمارے متعلق نہیں۔ حالانکہ قرآن کے یہ قوانین ابدی ہیں اور ہم پر بھی ان کا اسی طرح اطلاق ہوتا ہے، جس طرح اس کے زمانۂ نزول کے مخاطبین پر ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود، ہم اسے گوارا ہی نہیں کر سکتے کہ ان آیات کو اپنے اور اپنے اسلاف سے متعلق قرار دیں۔ اس سے ہمارے دل کو ٹھیس لگتی ہے۔ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے ہمارے بزرگوں کی سوء ادبی ہوتی ہے۔ جہاں تک دل کو ٹھیس لگنے کا تعلق ہے، ان آیات سے جس طرح آپ کے دل کو ٹھیس لگتی ہے اسی طرح اُن لوگوں کے دل کو بھی ٹھیس لگتی ہے جن کے متعلق (آپ سمجھتے ہیں کہ) یہ آیات آئی ہیں۔ اپنے دل کی ٹھیس کا اس قدر خیال کرنا اور دوسروں کے دل کی ذرا بھی پرواہ نہ کرنا، یہ تو کچھ اچھی ذہنیت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن اپنی تعلیم کے سلسلہ میں "اپنے اور پرائے" میں کچھ فرق نہیں کرتا۔ بلکہ یوں کہئے کہ ان قوانین کے بیان کرتے وقت "اپنا پرایا" اس کے پیش نظر ہوتا ہی نہیں۔ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور یہ بتا دیتا ہے کہ جو لوگ اس کے مطابق زندگی بسر کریں گے ان کا انجام یہ ہوگا، اور جو اس کی خلاف ورزی کریں گے ان کی روش کے عواقب یہ ہوں گے۔ اس کے بعد وہ دنیا کی ہر قوم (مسلم و غیر مسلم) سے کہتا ہے کہ وہ اس اصول کی روشنی میں اپنی اپنی روش کا جائزہ لیں اور خود اندازہ کر لیں کہ اس روش کا نتیجہ کیا مرتب ہوگا۔ اس میں کسی کے دل کو ٹھیس لگنے یا نہ لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی شخص (یا گروہ) اس بات سے بُرا مان لیتا ہے کہ قرآن نے اس کی یا اس کے اسلاف میں سے کسی کی غلط روش کو غلط کیوں کہا ہے تو وہ بُرا مانا کرے۔ قرآن اس کے جذبات کی رعایت سے غلط کو صحیح کبھی نہیں کہہ سکتا۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ کہتا ہے کہ اس میں بُرا ماننے کی بات ہی کچھ نہیں۔ اگر تم پر (قرآن کی روشنی میں) یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ تمہاری فلاں روش غلط ہے تو تم اُسے چھوڑ دو، اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ تمہارے اسلاف میں فلاں کی روش غلط تھی تو تمہیں اس سے کچھ تعلق نہیں۔ وہ اپنے معاملات کا آپ ذمہ دار تھا۔ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ۔ یہ (تمہارے اسلاف) گزر چکے ہیں۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ۔ جو کچھ اُنہوں نے کیا اس کی ذمہ داری ان پر ہے، جو کچھ تم کرتے ہو اس کے ذمہ دار تم ہو۔ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲/۱۴۱) تم سے یہ نہیں پوچھا جائیگا کہ اُنہوں نے کیا کیا تھا؟ اس لئے اس میں تمہارے برا ماننے کی کیا بات ہے؟

لیکن اسلاف پرستی کا برا ہو کہ وہ انسان کو صداقت پسندی کی طرف آنے ہی نہیں دیتی!

پھر اس حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ تم اپنے اسلاف کے متعلق یہ فیصلہ کر لو کہ ان کی ہر بات غلط تھی۔ وہ کہتا صرف یہ ہے کہ ان کی باتوں کو قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھ لو۔ جو باتیں ان میں سے قرآن کے مطابق ہوں۔ انہیں صحیح سمجھو۔ جو اس کے مطابق نہ ہوں، انہیں غلط سمجھو۔ اس لئے کہ صحیح اور غلط کا معیار خدا کی کتاب ہے۔ اِنَّ ھُدَی اللہِ ھُوَ الْھُدٰی (۲/۱۲۰)۔ ہدایت تو صرف وہی ہے جو خدا کی طرف سے ملی ہے۔

اس مقام پر ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے۔ ان (اسلاف پرست) حضرات کے سامنے جب اسلاف میں سے کسی کی کوئی ایسی بات پیش کی جائے جو قرآن کے خلاف ہو، تو یہ اس کے جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ اُن کے سامنے بھی قرآن تھا اور وہ ہم سے بہتر قرآن سمجھتے تھے۔ لہذا جو کچھ انہوں نے کہا ہے (اگرچہ وہ ہمیں قرآن کے خلاف نظر آتا ہے لیکن ہمیں یہی سمجھنا چاہئے کہ) وہ قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اس دلیل کو سلیم! ذرا آگے بڑھاؤ تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ (اس خیال کے مطابق) قرآن اب ہمارے لئے بے کار ہے۔ اس لئے کہ قرآن کی ہر آیت کے متعلق اسلاف نے کچھ نہ کچھ لکھ دیا ہے اور چونکہ ہم نے اسی کو قرآن کی تعلیم سمجھنا ہے جسے ان اسلاف نے لکھ دیا ہے، اس لئے ہمارے لئے ان اسلاف کے نوشتے ضروری رہ گئے، نہ کہ قرآن۔ اگر ہمارے پاس یہ نوشتے موجود ہوں اور قرآن نہ ہو، تو اس سے کچھ کمی واقع نہیں ہو گی۔ لہذا ہمارے لئے قرآن بے کار ہے۔ اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ ہمارے ہاں قرآن کا مصرف صرف اس کی تلاوت (پڑھ لینا) رہ گیا ہے، عمل اسی پر ہے جو اسلاف نے لکھ دیا ہے۔ چنانچہ ہمارے زمانے میں جو لوگ قرآن کی تفاسیر لکھتے ہیں۔ ان میں (زیادہ سے زیادہ) زبان ان کی اپنی ہوتی ہے۔ مطالب و معانی سب وہی ہوتے ہیں جو اسلاف نے بیان کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی شخص قرآن کا کوئی ایسا مفہوم بیان کرے جو اسلاف کے بیان کردہ مفہوم سے مختلف ہو، تو اس کی اس کوشش کو مردود، اور اسے دین کے لئے فتنہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں قرآن کی وہی تفسیر معتبر سمجھی جاتی ہے جو سلف کے مسلک کے مطابق ہو۔

قرآن میں بے شمار آیات ہیں جن میں تدبّر و تفکّر (غور و فکر) کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ یہ حکم کسی خاص زمانے کے لوگوں کے لئے ہے۔ اس کے بعد یہ حکم منسوخ سمجھا جائے۔ لہذا تدبّر فی القرآن کا حکم ہمارے لئے بھی ویسا ہی ہے جیسا ہمارے اسلاف کے لئے تھا۔ لیکن ان حضرات کے تصوّر کے مطابق ہمارے لئے یہ حکم منسوخ ہے۔ تدبّر جو کچھ کیا جانا تھا، اسلاف نے کر لیا۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو انہوں نے بھی تدبّر نہیں کیا (بلکہ کسی نے بھی نہیں کیا) اس لئے کہ سب سے پہلے قرآن پر تدبّر نبی اکرمؐ نے کرنا تھا۔ لیکن (ان حضرات کے عقیدہ کے مطابق) حضورؐ کو قرآن کی تفسیر بھی وحی کے ذریعے بتا دی گئی۔ اس لئے آپ کے لئے تدبّر کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ آپؐ کے بعد ہمارے اسلاف کے لئے بھی تدبّر کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ

قرآن کی تفسیر روایات میں آچکی تھی۔ اور روایات کی موجودگی میں تدبّر کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اس کے بعد ہم ہیں۔ اور ہمارے لئے بھی تدبّر کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا سوچئے کہ قرآن نے جو تدبّر و تفکّر کا حکم دیا ہے تو وہ کس کے لئے ہے؟

یہ تمہیں معلوم ہی ہے سلیم! کہ

۱۔ خدا نے دین کو قرآن میں مکمل کر دیا اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ اس کے بعد سلسلۂ نبوّت کو ختم کر دیا۔

۲۔ رسول اللہؐ نے اپنی احادیث (تفسیرِ قرآن) کا کوئی مجموعہ اُمّت کو نہیں دیا، نہ ہی خلفائے راشدین یا صحابہؓ نے کوئی ایسا مجموعہ مرتب کیا۔

[احادیث کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں ان میں بھی تفسیر کا باب بڑا مختصر ہوتا ہے اور ان روایات کے متعلق (امام) احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ ان کی کوئی اصل نہیں]۔

اس سے انسان ایک ہی نتیجہ پر پہنچتا ہے اور وہ یہ کہ خدا اور اُس کے رسولؐ نے اُمت کے لئے تدبّر کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ قرآن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انسانیت کو پہلی مرتبہ بالغ (TREAT) کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو زندگی کے محکم اور غیر متبدل اصول دے کر، آزاد رکھا گیا ہے کہ وہ ان قوانین کی روشنی میں، اپنے مسائل کا حل آپ تلاش کرے۔ اسی کا نام تدبّر فی القرآن اور تفکّر فی الکائنات ہے۔

لہٰذا سوچو سلیم! کہ تدبّر و تفکّر کے جس دروازے کو خدا اور اس کے رسولؐ نے اس طرح کھلا چھوڑا تھا، ہماری اسلاف پرستی کے جذبے نے اسے کس بُری طرح سے بند کر رکھا ہے۔ اُنہوں نے (خدا اور رسول نے) انسان کو بالغ قرار دیا تھا۔ ہم نے اپنے آپ کو پھر بچّہ بنا لیا اور زندگی کے ہر قدم پر فیصلوں کے لئے پیچھے تکنے لگ گئے۔ اپنی اس سہل انگاری اور عافیت کوشی کا نام اتّباعِ سلف رکھ لیا اور اپنے ذہن کی ناپختگی کو بزرگوں کے احترام کے مقدّس نقاب میں چھپانے کی کوشش کرنے لگے اور یوں اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ ہم زندگی کے صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔ حالانکہ ان بزرگوں نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ تم ہماری بات کو آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لینا۔ اُن کے متعلق ایسی روش کا اختیار کرنا، خود ان کے منشا کے خلاف ہے اور ناراضگی کا باعث۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ (۲/۱۶۶)۔ جب وہ لوگ، جنہیں دوسروں نے اپنا پیشوا بنا لیا تھا، اپنے ان متبعین سے اظہارِ بیزاری کریں گے اور یہ متبعین عذابِ خداوندی کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے اور جن سہاروں کو وہ اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے (یعنی تقلیدِ اسلاف) وہ ایک ایک کر کے ٹوٹتے نظر آئیں گے

تو اس وقت انہیں یہ حسرت ہوگی کہ اگر زندگی کا دھارا ایک بار پیچھے کی طرف مڑ جائے تو پھر ہم اپنے ان پیشواؤں سے اسی طرح اظہار بیزاری کریں جس طرح انہوں نے ہم سے اظہار بیزاری کیا ہے (۲/۱۶۷)۔ لیکن انہیں معلوم نہیں کہ زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف کبھی نہیں مڑا کرتا۔ زندگی وہ جوئے رواں ہے کہ اس میں جو پانی آگے نکل گیا وہ واپس نہیں آ سکتا۔ زندگی "آواگون کے چکر" (تناسخ) میں نہیں گھومتی۔ یہ سیدھے راستے پر آگے کی طرف چلی جاتی ہے۔ اس لئے ظہور نتائج کے وقت اس کی آرزو کرنا، کہ ہمارے اعمال واپس کر دیئے جائیں تاکہ ہم ان کی اصلاح کرلیں، موہوم خیال اور ناکام آرزو ہو گی۔

بہرحال، میں یہ کہہ رہا تھا سلیم! کہ ہمارے اسلاف میں سے جو فی الواقع صالح تھے انہوں نے یہ کبھی نہیں کہا ہوگا کہ تم ہمارے اقوال کی اندھی تقلید کرتے رہو۔ انہوں نے ہمیشہ یہی کہا ہوگا کہ اطاعت صرف احکام خداوندی کی کی جائے گی۔ تم ہمارے اقوال کو بھی کتاب اللہ کی سند اور تائید کے بغیر مت مانو۔ باقی رہے وہ لوگ جو دیدہ دانستہ دوسروں کو اپنے پیچھے لگاتے ہیں تاکہ اس سے ان کی "دکانداری" بڑھے، تو قرآن نے کئی ایک مقامات میں اس منظر کا نقشہ کھینچا ہے جب یہ پیشوا اور ان کے متبعین جہنم میں جمع ہوں گے اور وہاں ایک دوسرے کو مطعون کریں گے کہ تم ہماری تباہی کا باعث ہو۔ مثلاً سورۂ ابراہیم میں ہے کہ فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا کُنَّا لَکُمۡ تَبَعًا فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّغۡنُوۡنَ عَنَّا مِنۡ عَذَابِ اللّٰہِ مِنۡ شَیۡءٍ ۔ یہ متبعین اپنے پیشواؤں سے (یہ محکوم اپنے حاکموں سے) کہیں گے کہ ہم تمہارا اتباع کیا کرتے تھے۔ تو کیا تم اس عذاب خداوندی کو جو ہم پر مسلط ہو رہا ہے، دور نہیں کر دو گے؟ اس کے جواب میں وہ پیشوایان مذہب اور ہادیان سیاست ان سے کہیں گے کہ لَوۡ ہَدٰٮنَا اللّٰہُ لَہَدَیۡنٰکُمۡ اگر اس عذاب سے نکلنے کا کوئی راستہ ہمیں دکھائی دیتا تو تمہیں بھی وہ راستہ دکھا دیتے۔ اس وقت تو جس طرح بے بس اور لاچار تم ہو، ہم بھی ویسے ہی ہیں۔ سَوَآءٌ عَلَیۡنَاۤ اَجَزِعۡنَاۤ اَمۡ صَبَرۡنَا مَا لَنَا مِنۡ مَّحِیۡصٍ (۱۴/۲۱)۔ اب چیخنے چلانے سے کیا حاصل ہے۔ یہاں سے نکل بھاگنے کی کوئی سبیل ہی نہیں۔ لہٰذا اس عذاب کو برداشت کرنا ہوگا۔

سورۂ سبا میں ان کے باہمی مکالمات کو ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا لَوۡ لَاۤ اَنۡتُمۡ لَکُنَّا مُؤۡمِنِیۡنَ (۳۴/۳۱)۔ یہ متبعین اپنے سرداروں اور پیشواؤں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہوتے۔ تم ہی نے ہمیں گمراہ کیا قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡۤا اَنَحۡنُ صَدَدۡنٰکُمۡ عَنِ الۡہُدٰی بَعۡدَ اِذۡ جَآءَکُمۡ بَلۡ کُنۡتُمۡ مُّجۡرِمِیۡنَ (۳۴/۳۲)۔ وہ پیشوایان اور سرداران ان سے کہیں گے کہ تم ہمیں مورد الزام کس منہ سے قرار دیتے ہو؟ خدا کی کتاب تمہارے پاس موجود تھی۔ کیا ہم نے تمہیں اس کے اتباع سے زبردستی روکا تھا؟ تم نے خود ہی اس کے اتباع کے بجائے ہمارے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ مجرم تم خود ہو اور الزام ہمارے

سر دھرتے ہو۔

تم نے دیکھا سلیم! ان پیشواؤں نے انہیں کیا جواب دیا ہے؟ یہ جواب کہ اللہ کی کتاب تمہارے پاس موجود تھی۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ اسے چھوڑ کر ہماری تقلید کرو؟ تم نے خود ہی ہمیں معبود بنا لیا۔ اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ اس کے جواب میں وہ کہیں گے کہ بَلْ مَكْرُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُونَنَا أَنْ نَكْفُرَ بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُ أَنْدَادًا (۳۴/۳۳) ۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم ہمیں ڈنڈے کے زور سے اپنے پیچھے نہیں لگایا کرتے تھے، لیکن تم دن رات ایسی تدبیریں کیا کرتے تھے جن سے ہم قانونِ خداوندی سے انکار کر کے تمہیں خدا کا ہمسر بنا لیتے۔ ہم ان تدبیروں کے حریف نہیں ہو سکتے تھے اس لئے تمہارا اتباع اختیار کر لیتے تھے۔ یہ بھی تو جبری اطاعت ہی تھی اگرچہ اس کے لئے جو طریق تم نے اختیار کیا تھا اس میں بظاہر جبر نہیں دکھائی دیتا تھا۔

سلیم! اس مکالمہ پر غور کرو اور پھر دیکھو کہ قرآن کس کس انداز و اسلوب سے بیانِ حقیقت کرتا ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ یہ عوام (متبعین) کہیں گے کہ رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ۔ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے اپنے سرداروں اور پیشواؤں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں سیدھے راستے سے گمراہ کر دیا۔ رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا (۳۳/۶۷) ۔ اے ہمارے پروردگار! تو انہیں دگنا عذاب دے۔ ایک ان کی اپنی غلط روی کی وجہ سے اور ایک اس وجہ سے کہ انہوں نے ہمیں گمراہ کیا، اس لئے انہیں خوشگواریوں اور سعادتوں سے دور رکھ! بہت دور!!

سورۂ اعراف میں یہی مکالمہ اسلاف اور اخلاف کے درمیان بیان کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ بعد میں آنے والی نسل اپنی پیشرو نسل کے متعلق کہے گی کہ انہوں نے ہمیں گمراہ کیا، اس لئے انہیں دگنا عذاب ملنا چاہیئے۔ اس کا انہیں جواب ملے گا کہ لِكُلٍّ ضِعْفٌ تم میں سے ہر ایک کو دگنا عذاب ملے گا۔ پہلی نسل کو اس لئے کہ وہ خود غلط روش پر چلے اور آنے والوں کے لئے غلط روی کا نمونہ بن گئے۔ اور تمہیں اس لئے دگنا عذاب دیا جائے گا کہ تم بھی تو اپنے بعد میں آنے والوں کے لئے بری مثال قائم کر گئے۔ وہ تمہارے اسلاف تھے تو تم بعد میں آنے والوں کے اسلاف تھے۔ یہی جواب یہ اسلاف اپنے اخلاف کو دیں گے کہ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ (۷/۳۹) تمہیں ہم پر کیا فوقیت حاصل ہے جو تم ہمارے لئے دہرا عذاب اور اپنے لئے اکہرا عذاب مانگتے ہو! ہم غلط روش پر چلتے تھے تو تم نے کونسا اپنی آنکھوں سے کام لے کر صحیح راستہ اختیار کر لیا تھا؟ اس لئے تم اپنے کیے کا پھل پاؤ، ہمیں مطعون کرنے سے کیا حاصل ہے؟

تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے اپنے دلکش اور حسین انداز میں کتنی عظیم حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ جو قومیں اپنی عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ کر اسلاف کی تقلید کا مسلک اختیار کر لیتی ہیں، ان میں غلط روی کا ایک ایسا چکر (VICIOUS CIRCLE) قائم ہو جاتا ہے جس سے وہ باہر نکل ہی نہیں سکتیں۔ ہر نسل، اپنے پیشروؤں کے نقوش قدم پر چل کر تباہ ہوتی ہے، اور اپنے نقوش قدم بعد میں آنے والوں کے لئے چھوڑ جاتی ہے تاکہ وہ بھی ان کی طرح تباہی اور بربادی کے جہنم میں گریں۔ دو چار نسلوں کے بعد یہی چیز بطور دلیل پیش کر دی جاتی ہے کہ اگر یہ روش غلط ہوتی تو ہمارے اسلاف صدیوں سے اس پر گامزن کیوں رہتے؟ اقوام سابقہ میں جب حالت یہاں تک پہنچ جاتی تھی تو خدا کی طرف سے ایک نیا نبی آ جاتا تھا جو انہیں، اس چکر (VICIOUS CIRCLE) سے نکال کر، سیدھے راستے پر لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ نئے نبی کی ضرورت اس لئے ہوتی تھی کہ وہ لوگ اپنے سابقہ نبی کی کتاب کو بھی مسخ کر دیتے تھے۔ اس طرح ان کے پاس کوئی ایسا معیار نہیں رہتا تھا جس پر وہ اپنی روش کو از خود پرکھ سکتے۔ لیکن رسول اللہ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ حضورؐ کی اُمت کے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ اس لئے انہیں اس چکر سے از خود ہی نکلنا ہوگا۔ اس کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم، اندھوں کی طرح ایک دوسرے کی لکڑی پکڑ کر چلتے رہنے کی بجائے، کھڑے ہو کر دیکھیں کہ ہم جس روش پر جا رہے ہیں، خدا کی کتاب اس کے متعلق کیا کہتی ہے۔ اس چکر سے نکلنے کا یہی راستہ ہے۔ اگر ہم سے پہلے کسی دور میں ایسا ہو جاتا تو ہم آج اس غلط راستے پر نہ ہوتے۔ اگر اُنہوں نے ایسا نہیں کیا تو ہمارے دور میں ایسا ہو جانا چاہیئے تاکہ ہم بھی صحیح راستہ پر چل سکیں اور ہماری آنے والی نسلیں بھی غلط راستے کو اپنے لئے سند نہ بنا سکیں۔ اگر ہم نے بھی ایسا نہ کیا تو ہم خود بھی موجودہ جہنم سے نہیں نکل سکیں گے اور آنے والی نسلوں کی غلط روی کے بھی ذمہ دار ہوں گے۔ کیونکہ ہر دور کی غلط روی، آنے والوں کے لئے سند میں اضافہ کر دیتی ہے۔ ہم نے (STEEL WORKS) کے کارخانے میں دیکھا تھا کہ جب انجن کو شروع میں (START) کرتے تھے تو اس کے لئے کافی زور لگانا پڑتا تھا۔ لیکن اس کے بعد، اس کا (FLY WHEEL) خود اپنے زور دروں (MOMENTUM) سے تیزی پکڑ لیتا تھا اور اس طرح اس کا ہر چکر، آنے والے چکر کے لئے تقویت کا موجب بن جاتا تھا۔ یہی کیفیت قوموں کی نفسیات کی ہے۔ شروع میں غلط راستے پر چلنے کے لئے کچھ دقت ہوتی ہے۔ لیکن بعد میں، گزشتہ نسل کی روش، آنے والی نسل کے لئے (MOMENTUM) کا کام دیتی ہے۔ اس چکر کو ختم کرنے کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ کسی دور کے مسلمان کھڑے ہو کر سوچیں کہ ہم کس راستے پر جا رہے ہیں۔

سلیم! جب اس کام کو کسی دور نے کرنا ہے تو وہ ہمارا ہی دور کیوں نہ ہو؟ میں جانتا ہوں (اور خود میری زندگی کا تجربہ اس پر شاہد ہے) کہ قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس آواز کی سخت مخالفت ہوگی۔ اس طبقہ میں بیشتر لوگ ایسے ہوتے

ہیں جن میں فکر و تدبّر کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ وہ اپنی موجودہ روش کو، جسے انہوں نے اسلاف کے اتباع میں اختیار کئے ہوتا ہے،" نیک نیتی" سے صحیح روش سمجھتے ہیں۔ اس لئے اس روش سے ذرا سا بھی اِدھراُدھر ہٹنا ان کے نزدیک جنت کی راہ کو چھوڑ کر جہنم کی طرف چلے جانے کے مرادف ہوتا ہے۔ (لیکن یہ ظاہر ہے کہ کتنی غلط باتیں ہیں جنہیں لوگ نہایت نیک نیتی سے صحیح سمجھتے ہیں۔ اس لئے، "نیک نیتی" اس امر کی دلیل نہیں ہو جاتی کہ وہ بات صحیح بھی ہے)۔ لیکن ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جانتے ہیں کہ یہ روش غلط ہے۔ لیکن چونکہ اس سے ان کے مفاد وابستہ ہوتے ہیں۔ اس سے عوام میں نہایت آسانی سے مقبولیت (POPULARITY) حاصل ہوتی ہے اور دکانداری کو فروغ۔ اس لئے وہ ہر اس آواز کی مخالفت کرتے ہیں جو اس راستے پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کی دعوت دے۔ وہ اس مخالفت میں نہایت اوچھے حربے اختیار کرتے اور کمینے ہتھیاروں پر اُتر آتے ہیں۔

لہٰذا اس آواز کے بلند کرنے کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب سوال یہی ہے کہ کیا ہم مقبولیت عامہ کی نگاہ فریب جاذبیتوں اور مخالفت کرنے والوں کی ضرر رسانیوں کے احساس سے، اس آواز کو جیتے جی اپنے سینے میں اور مرنے کے بعد پھر مٹی میں دبا دیں یا ان تمام بدنامیوں اور نکوہشوں کے علی الرغم، آنکھیں بند کر کے چلنے والوں سے حضور رسالتمآبؐ کے اتباع میں للکار کر کہیں کہ :

إِنَّمَآ أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ ۖ أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا۔ (۳۴/۴۶)۔

میں تم سے فقط ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ تم خدا کے لئے دو دو، ایک ایک، کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ اور پھر سوچو!

اگر اس انبوہ کثیر میں سے کچھ لوگ بھی اس آواز پر کھڑے ہو گئے تو سمجھ لو سلیم! کہ اس سے آدھا کام ہو گیا۔ اس لئے کہ جو شخص اندھا دھند چلے جانے کے بجائے، کسی پکارنے والے کی آواز پر رُک جائے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی روش پر نظر ثانی کے لئے تیار ہے (یا اُسے کم از کم اپنی موجودہ روش کے بارے میں کچھ تردد ضرور لاحق ہو گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ رکتا ہی کیوں) اور اس کے بعد اگر اس نے قرآن کی روشنی میں سوچنا شروع کر دیا، تو پھر کام بن گیا۔ ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص قرآن کی روشنی میں غور و فکر کرے اور صحیح راستہ اس کے سامنے نہ آجائے۔ اور وہ صحیح راستہ اس کے سوا اور کون سا ہے کہ انسان آنکھیں بند کر کے دوسروں کے پیچھے پیچھے نہ چلتا جائے بلکہ، وحی کی روشنی میں خود اپنی آنکھوں سے کام لیکر

خدا کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر چلے۔ یہی مسلک قرآن کا بتایا ہوا ہے جس پر نبی کریم گامزن تھے ؎

چہ خوش بودے اگر مردِ نکو پے زبندِ پاستان آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے

(اقبالؒ)

والسلام

پرویز

جون ۱۹۵۷ء

اُنتیسواں خط

(فرقے کیسے مِٹ سکتے ہیں؟)

ہاں سلیم! سوال بڑا پریشان کن ہے۔ لیکن دیکھو کہ قرآن اس کا جواب کتنا اطمینان بخش دیتا ہے۔ غور سے سنو۔

۱۔ قرآن نے دین کو مکمل کر دیا اور اس کے بعد مسلمانوں سے کہہ دیا کہ تمہارا شعارِ زندگی یہ ہے کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۲)۔ تم سب کے سب مل کر اس ضابطۂ خداوندی کو محکم طور پر تھامے رہو اور فرقوں میں مت بٹ جاؤ۔ یہ ہے دین کا اصل الاصول۔ اسی میں تمہاری فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے اور اسی سے خود دین کا (یعنی اس نظامِ زندگی کا جو تمہارے لئے تجویز کیا گیا ہے) قیام، تمکن اور استحکام وابستہ ہے۔ اس آیۂ جلیلہ کے الفاظ پر غور کرو، حقیقت اُبھر کر سامنے آتی جائے گی۔ سب سے پہلے یہ کہ حَبْلِ اللّٰہِ ایک ہے، ایک سے زیادہ نہیں۔ دین کا ضابطہ قرآن ہے اور یہی وہ عُرْوَۃِ الْوُثْقٰی (۲/۲۵۶)، وہ محکم سہارا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ (لَا انْفِصَامَ لَھَا) کبھی دغا نہیں دے سکتا۔ جو ہر زمانے میں، ہر مقام پر، تمام نوعِ انسان کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ ذہنِ انسانی کے وضع کردہ نظامِ زندگی، زمانے کے تقاضوں کے بدلنے سے، ٹوٹتے اور بنتے بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل۔ لیکن یہ ضابطۂ خداوندی زمان و مکان کی نسبتوں سے بلند اور حدود و قیود کے امتیازات سے ماوراء ہے۔ اس کے اصول، زندگی کی وہ مستقل اقدار ہیں جن میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (۱۰/۶۴)۔

۲۔ وَاعْتَصِمُوْا میں جمع کے صیغے (تم سب) اور جَمِیْعًا کی تخصیص سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ دین، خدا اور بندے کے درمیان، انفرادی تعلق کا نام نہیں کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ بیٹھے، اپنے اپنے انداز سے "گیان دھیان" کے ذریعے خدا سے لو لگائے اور اس طرح اپنی "مکتی" (نجات) کا سامان پیدا کرلے۔ دین، اجتماعی نظام زندگی کا نام ہے جس میں تمام افراد ایک ناقابل تقسیم وحدت کی حیثیت سے رہتے اور ایک طریق پر چلتے ہیں۔ نیز ان کی وجۂ جامعیت بھی دین کا اشتراک ہے۔ اسی سے یہ سب ایک اُمت بنتے ہیں۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (۲/۱۴۳)۔

۳۔ جَمِیْعًا نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ اس دین کے مطابق، زندگی اُسی صورت میں بسر ہوسکتی ہے جب پوری کی پوری اُمت ایک ہی طریق پر چل رہی ہو۔ اگر اس میں مختلف گروہ پیدا ہوگئے اور ہر گروہ نے ایک جداگانہ طریق کی پیروی اختیار کرلی، تو یہ دین باقی نہیں رہ سکتا۔ لَا تَفَرَّقُوْا کے حکم نے اس حقیقت کو اور بھی نمایاں کر دیا۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا میں امر (حکم) تھا۔ یعنی یہ کرو۔ اور لَا تَفَرَّقُوْا میں نہی ہے (کہ یوں نہ کرو)۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس بات کو امر اور نہی، مثبت اور منفی کی حدوں میں گھیر کر بیان کیا جائے، اس میں نہ کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی رہتی ہے، نہ مزید تاکید و تائید کی ضرورت۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ایک جامع اصول زندگی ہے جس میں کسی اختلاف یا استثناء کی قطعاً گنجائش نہیں۔

۴۔ قرآن نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ کوئی نیا اصول زندگی نہیں جو تمہیں پہلی بار دیا جا رہا ہے۔ یہی اصول ہے جو پہلے دن سے آج تک ہر نبی کی وساطت سے دیا جا رہا ہے۔ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسٰٓى۔ اللہ نے اُسی دین (نظام زندگی) کا راستہ تمہارے سامنے بھی کھول دیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا۔ وہی دین اب تمہاری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ اسی کا حکم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا تھا۔

یہ حکم کیا تھا؟ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ (۴۲/۱۳)۔ تم سب اسی دین کو قائم کرنا اور اس میں کسی قسم کا تفرقہ نہ پیدا کر دینا۔ یہی وہ دین کی وحدت اور تفرقہ سے اجتناب تھا، جس سے تمام انبیائے کرامؑ (زمان اور مکان کے اس قدر بُعد اور اختلاف کے باوجود) ایک "امت واحدہ" بن گئے تھے۔ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (۲۳/۵۲، ۲۱/۹۲)۔ اے گروہِ انبیاءؑ! یہ تمہاری جماعت اُمتِ واحدہ ہے تمہاری وجۂ جامعیت یہ ہے کہ میں تم سب کا نشو و نما دینے والا ہوں۔ لہٰذا تم صرف میرے قوانین کی نگہداشت کرنا۔ یہاں اس حقیقت کو نمایاں کیا گیا ہے کہ اُمت کی وحدت، ضابطۂ زندگی اور قانونِ حیات کی وحدت پر مبنی ہوتی ہے۔

جب تک دین ایک رہے گا، اُمت بھی ایک رہے گی - یا جب تک اُمت ایک ہو گی، اُس کا دین بھی ایک ہوگا
جب اُمت میں تفرقہ پڑ جائے گا تو دین بھی ایک نہیں رہے گا، الگ الگ ہو جائے گا - اور چونکہ دین ایک ناقابلِ تقسیم
وحدت ہے، اس لئے "الگ الگ دین" کے معنی یہ ہیں کہ اصل دین باقی نہیں رہا -

۵ - کسی اُمت (قوم، جماعت) میں تفرقہ پیدا کر دینا کتنا بڑا جرم ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگاؤ جسے خدا نے سورۂ طٰہٰ میں بیان کیا ہے - حضرت موسیٰؑ کچھ دنوں کے لئے باہر تشریف لے جاتے ہیں اور بنی اسرائیل کو حضرت ہارونؑ کی زیر نگرانی چھوڑ جاتے ہیں - جب آپ واپس آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ قوم نے گوسالہ پرستی اختیار کر رکھی ہے - اس کا جو اثر حضرت موسیٰؑ پر ہو سکتا تھا، ظاہر ہے - وہ غصے سے لال پیلے ہو جاتے ہیں اور اپنے بھائی سے پوچھتے ہیں کہ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوٓا (۲۰/۹۲) جب تم نے دیکھا تھا کہ لوگ گمراہ ہو رہے ہیں، تو وہ کونسی بات تھی جس کی وجہ سے تم نے انہیں (اس روش سے) روکا نہیں؟ اب سنو کہ حضرت ہارونؑ اس کا کیا جواب دیتے ہیں - یاد رہے کہ حضرت ہارونؑ بھی خدا کے رسول ہیں، عام آدمی نہیں ہیں - وہ جواب میں کہتے ہیں کہ إِنِّي خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي (۲۰/۹۴) "مجھے یہ اندیشہ گزرا کہ تو آ کر یہ نہ کہہ دے کہ (اے ہارونؑ) تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میرے فیصلہ کا بھی انتظار نہ کیا؟ تم نے سوچا سلیم! حضرت ہارونؑ نے کیا کہا؟ انہوں نے کہا کہ اگر یہ لوگ، جہالت کی وجہ سے، کچھ وقت کے لئے مورتی کی پوجا کرنے لگ گئے تھے، تو میرے نزدیک یہ اتنا بڑا جرم نہیں تھا جتنا بڑا جرم ان میں تفرقہ پیدا کر دینا تھا - یہ جواب ایک نبی کی طرف سے دیا جاتا ہے اور دوسرا نبی اس سے مطمئن ہو جاتا ہے - [جیسا کہ ذرا آگے چل کر بتایا جائے گا، قرآن نے خود فرقہ بندی (تفرقہ) کو شرک قرار دیا ہے] - اب ظاہر ہے کہ گوسالہ پرستی بھی شرک تھی اور تفرقہ انگیزی بھی شرک - لیکن تفرقہ انگیزی کا شرک ایسا شدید اور سنگین تھا کہ اس سے بچنے کے لئے گوسالہ پرستی کے شرک کو روا رکھا جا سکتا تھا - چنانچہ قرآن اس پر شاہد ہے کہ گوسالہ پرستی کے جرم کا ازالہ توبہ سے ہو گیا - فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ (۲/۵۴) - لیکن جب انہوں نے باہمی تفرقہ پیدا کر لیا اور اس طرح اُمت واحدہ کی بجائے مختلف گروہوں اور پارٹیوں میں بٹ گئے وَقَطَّعْنَٰهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ أُمَمًا (۷/۱۶۸) تو ان پر تباہی اور بربادی، ذلت و خواری، محرومی و محتاجی کا ایسا عذاب مسلط ہو گیا جو ہر جگہ سائے کی طرح ان کے پیچھے لگا رہتا تھا - ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ ٱلذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوٓا (۳/۱۱۱) -

۶ - جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، ہر رسول کا پیغام یہ تھا کہ "دین کو قائم کئے رہو اور باہمی تفرقہ مت پیدا کرو" - ہر رسول اس پیغام کے ذریعے، ایک جماعت، ایک اُمت متشکل کر کے جاتا - اس کی امت کچھ وقت تک تو متحد رہتی لیکن اس کے بعد

اس میں گروہ بندیاں اور فرقہ سازیاں شروع ہو جاتیں ۔ یہ کیوں ہوتا؟ قرآن اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ (۴۲/۱۴، ۴۵/۱۷) یعنی خدا کی طرف سے اَلْعِلْمُ (وحی) آجانے کے بعد، جس کا مقصد تمام اختلافات کو مٹا دینا ہے، باہمی تفرقہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی ۔ لیکن اس وحی کے وارث، باہمی ضد اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے اور ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنے کے جذبہ کی وجہ سے مختلف فرقے بنا لیتے ۔ یعنی اس گروہ بندی اور فرقہ سازی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انہیں دین کی کسی حقیقت کے سمجھنے میں غلطی لگ جاتی تھی یا کوئی شق مشتبہ اور مبہم رہ جاتی تھی ۔ خدا کی طرف سے دیئے ہوئے علم میں اشتباہ و ابہام کا کیا کام؟ یہ فرقہ سازی محض ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لئے ہوتی تھی ۔ ان میں سے جن لوگوں کے دل میں لیڈر بننے کا شوق چرایا وہ اپنا فرقہ الگ بنا لیتے ۔ پھر ہر فرقہ دوسرے فرقہ سے آگے نکل جانا اور اس پر غالب آجانا چاہتا ۔ اس سے باہمی کشمکش اور سر پھٹول شروع ہو جاتی اور یوں اس اُمت واحدہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ۔ اور اس کے ساتھ ہی دین بھی اس تشتت و افتراق کے پردوں میں گم ہو جاتا ۔ اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آگئی کہ فرقہ بندی علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی بنا پر وجود میں نہیں آتی ۔ اس کی بنیاد جذبات پر ہوتی ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر فرقہ کے لوگ اپنے فرقہ کے برسرِ حق ہونے کے ثبوت میں دلائل پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔ اور وہ کونسا جذباتی فیصلہ ہے جس کی تائید میں عقلِ فسوں ساز دلائل مہیا نہیں کر دیتی ۔

۷۔ نزولِ قرآن کے وقت دنیائے مذاہب کی یہی کیفیت تھی ۔ (واضح رہے کہ دین تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن جب فرقہ بندی میں اس کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں تو انہیں مذاہب کہا جاتا ہے) قرآن نے اپنے نزول کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وہ ان تمام اختلافات کو مٹا کر، خدا کا دین قائم کرے گا اور فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے انسانوں کو ایک اُمتِ واحدہ میں تبدیل کر دے گا ۔ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۔ (اے رسول) تجھ پر یہ کتاب صرف اس لئے نازل کی گئی ہے کہ جن امور میں یہ لوگ باہمی اختلاف کرتے ہیں، تو انہیں کھول کر بیان کر دے ۔ اس کے بعد، جو لوگ اس دین کی صداقت کو تسلیم کر لیں گے، یہ کتاب انہیں زندگی کے صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرے گی اور اس طرح ان کے لئے موجبِ رحمت بن جائے گی ۔ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۶/۶۴) یعنی تبیانِ حقیقت تو تمام انسانوں کے لئے یکساں ہو گی لیکن ہدایت اور رحمت صرف انہی کے لئے ہو گی جو اس کی صداقت پر ایمان لے آئیں گے ۔

اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آگئی کہ قرآن کا مقصد وحید اختلافات کو مٹا کر دین کی وحدت کا قیام ہے اور انتشار کا مٹ جانا خدا کی رحمت ہے ۔ اسی نقطہ کی وضاحت دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کر دی گئی ہے کہ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ

لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۔ اگر یہ مقصود ہوتا کہ تمام انسانوں کو مجبور کر کے ایک راستے پر چلایا جائے تو خدا کے لئے ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ اس نے جسطرح دیگر حیوانات کو اس انداز سے پیدا کیا ہے کہ ہر نوع کا فرد اپنی نوع اور جماعت کے ساتھ رہتا ہے، اس سے کبھی اختلاف نہیں کرتا (مثلاً تمام بھیڑیں ایک نہج سے زندگی گذارتی ہیں اور تمام شیر ایک ہی راستے پر چلتے ہیں) اسی طرح وہ انسانوں کو بھی جبلّی طور پر ایک ہی راستے پر چلنے پر مجبور کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انسانوں کو فکر و عمل کی آزادی دے رکھی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ چاہیں تو اتحاد و اتفاق کی زندگی بسر کریں اور چاہیں تو تشتّت و افتراق پیدا کر لیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں بتا دیا گیا ہے کہ تشتّت و افتراق کی زندگی عذاب کی زندگی ہے اور "ایک امت" بن کر رہنے کی زندگی رحمت اور سعادت کی زندگی۔ لیکن یہ وحدت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی اور قائم رہ سکتی ہے کہ تم اپنے دل کی رضامندی سے اور علیٰ وجہ البصیرت خدا کی کتاب کو اپنا ضابطۂ حیات بنا لو۔ اگر تم نے ایسا کر لیا تو تم نے زندگی کے مقصد کو پا لیا۔ چنانچہ جو آیت اوپر درج کی گئی ہے اس کا اگلا حصّہ یہ ہے کہ وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۔ ان لوگوں کے سوا جو وحی کے مطابق زندگی بسر کرتے سے خدا کی رحمت کے سزاوار بن جائیں، باقی سب ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہیں گے۔ حالانکہ انہیں پیدا اس لئے کیا گیا تھا کہ یہ (اپنی رضا اور رغبت سے) اُمتِ واحدہ بن کر رہیں وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ (۱۱/۱۱۸-۱۱۹)۔

اس آیت سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ:

۱۔ مقصودِ تخلیق انسانی یہ ہے کہ تمام انسان ایک اُمت (ایک عالمگیر برادری) بن کر رہیں اور باہمی اختلافات پیدا نہ کریں۔

۲۔ یہ اختلافات صرف وحیٔ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے مٹ سکیں گے۔ یہی زندگی رحمت کی زندگی ہے۔

۳۔ جو لوگ وحی کے مطابق زندگی بسر نہیں کریں گے ان کے اختلافات مٹ نہیں سکیں گے۔ یہ عذاب کی زندگی ہوگی۔

ان حقائق کی وضاحت کے بعد مسلمانوں سے کہہ دیا کہ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۔ دیکھنا! تم نے بھی کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے، خدا کی طرف سے واضح حقائق مل جانے کے بعد، فرقے بنا لئے اور آپس میں اختلاف کرنے لگ گئے وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۳/۱۰۵)۔ یہ لوگ، جو فرقوں میں بٹ جاتے ہیں اور آپس میں اختلاف کرنے لگ جاتے ہیں، ان پر سخت عذاب مسلط کر دیا جاتا

ہے۔ اس کے بعد کی دو آیات میں قرآن نے بتایا ہے کہ اختلاف اور تفرقہ کی زندگی درحقیقت، ایمان کے بعد کفر کی زندگی ہے اور روسیاہی کا موجب۔ اس کے برعکس، وحدت و ائتلاف کی زندگی سے سرخروئی نصیب ہوتی ہے اور خدا کی رحمت۔ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ۔ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۔ (۳/۱۰۶-۱۰۷)

ان آیات سے بھی ظاہر ہے کہ فرقہ بندی اور باہمی اختلافات کی زندگی لعنت اور عذاب کی زندگی ہے اور خدا کی رحمت ان پر ہوتی ہے جو ایک اُمت بن کر رہتے اور اختلافات سے بچتے ہیں۔

ضمناً یہ بھی دیکھو کہ قرآن نے اختلاف اور افتراق کا نتیجہ عذاب عظیم بتایا ہے۔ "عظیم" کا لفظ جس باب سے آیا ہے اس میں دوام اور استمرار کا پہلو مضمر ہوتا ہے۔ یعنی یہ عذاب وقتی اور ہنگامی نہیں ہوگا بلکہ استمراری اور دوامی ہوگا۔ جب تک فرقہ بندی رہے گی یہ عذاب بھی مسلّط رہے گا۔

۸۔ قرآن نے اس سے بھی آگے بڑھ کر، مسلمانوں سے کہہ دیا کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۔ دیکھنا! کہیں تم توحید پرست ہو جانے کے بعد مشرک نہ بن جانا۔

یہ چیز بڑی تحیّر انگیز اور (بظاہر) ناقابل فہم تھی کہ مسلمان، ایک خدا پر ایمان لانے کے بعد، مشرک کس طرح بن سکتے ہیں؟ کیا یہ بتوں کو پوجنا شروع کر دیں گے؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں، شرک بتوں ہی کی پرستش نہیں۔ جیسا کہ ہم بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کے قصّے میں دیکھ آئے ہیں، بُت پرستی تو "شرک خفی" (کم درجہ کا شرک) ہے "شرک جلی" اور ہے۔ اس کی وضاحت میں بتا دیا گیا کہ مشرک ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور فرقے بن گئے۔ اس فرقہ بندی سے ہوتا یہ ہے کہ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۱-۳۲)۔ ہر فرقہ اس خیال میں مگن رہتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور باقی فرقے باطل پر ہیں۔ فرقہ پرستی کی یہ ایسی نفسیات ہے جس کا مشاہدہ ہم ہر وقت کر سکتے ہیں۔ اس آیت میں كُلُّ حِزْبٍ کے ٹکڑے کو خاص طور پر ذہن میں رکھو کیونکہ یہ ایک اہم حقیقت کا پردہ کشا ہے جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

بہر حال، قرآن نے اُمت واحدہ سے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر تم نے دین میں فرقے پیدا کر لئے تو یہ توحید نہیں، شرک ہوگا اور کوئی فرقہ یہ کہہ کر اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکے گا کہ ہم اصلی اور حقیقی اسلام پر قائم ہیں اور دوسرے فرقے باطل پر ہیں۔ اسی بنا پر رسول اللہؐ سے کہہ دیا گیا کہ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ

فِیْ شَیْءٍ (۶/۱۶۰)۔ جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور ایک فرقہ بن کر بیٹھ جائیں، اے رسول! تجھے ان سے کوئی تعلق نہیں یعنی فرقے بنانے والوں سے نہ خدا کا کوئی تعلق ہے (کیونکہ وہ توحید پرست نہیں رہتے، مشرک ہو جاتے ہیں) اور نہ ہی خدا کے رسولؐ کا ان سے کوئی واسطہ، کیونکہ رسولؐ نے تو ایک دین قائم کیا اور ایک امت بنائی تھی۔ یہ الگ امت بنا لینے والے، درحقیقت ایک متوازی دین (نظامِ زندگی) کے حامل ہو گئے اس لئے انہیں اس رسولؐ سے کیا تعلق۔

اس مقام پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک امت بنائی جو دینِ حقہ پر قائم تھی۔ اس امت میں سے ایک فرقہ نکل کر الگ ہو گیا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ نیا فرقہ شرک کے جرم کا مرتکب اور باطل پرست ہے۔ بقیہ امت جو اپنے مسلک پر قائم ہے، اُسے ایک فرقہ ٹھہرا کر اسی جرم کا مرتکب قرار دے دینا تو کسی صورت میں درست نہیں ہو سکتا؟ یہ اعتراض اہم ہے، لیکن اس کا جواب یا اس مشکل کا حل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا۔

۹۔ سورۂ روم کی جس آیت میں کہا گیا ہے کہ وَلَاتَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔۔۔۔۔ اس سے پہلے ہے وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ۔ صلوٰۃ کو قائم رکھو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔ یعنی ان میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر دیئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دین میں نظامِ صلوٰۃ وہ بنیادی حقیقت ہے کہ جب تک یہ قائم رہے، فرقے نہیں بن سکتے۔ یہی وجہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ جب انبیاءؑ کے جانے کے بعد ان کی امت فرقوں میں بٹ جاتی ہے تو وہ درحقیقت صلوٰۃ کو ضائع کر دیتی ہے اور اپنے اپنے جذبات کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ (۱۹/۵۹)۔ اس کی زندہ شہادت خود ہماری اپنی حالت ہے۔ ہماری کیفیت یہ ہے کہ وہی صلوٰۃ جسے قرآن نے وحدتِ امت کا محکم ذریعہ بنایا تھا، آج فرقوں کی تمیز و تفریق کی علامت بن گئی ہے۔ چنانچہ اگر تم نے دیکھنا ہو کہ فلاں شخص کس فرقے سے متعلق ہے تو یہ دیکھو کہ وہ نماز کس طرح پڑھتا ہے؟ (یہی وجہ ہے کہ جب طلوعِ اسلام کے خلاف اس کے مخالفین نے یہ پروپیگنڈہ شروع کیا کہ یہ ایک نیا فرقہ ہے تو انہیں اپنے اس دعوے کی تائید میں یہ الزام بھی تراشنا پڑا کہ یہ لوگ تین وقت کی نماز پڑھتے ہیں اور ایک رکعت میں ایک ہی سجدہ ضروری سمجھتے ہیں۔ گویا انہوں نے ثابت یہ کرنا چاہا کہ چونکہ ان کی نماز اور فرقوں سے مختلف ہے اس لئے یہ ایک نیا فرقہ ہے۔ حالانکہ یہ سب بہتان تراشی اور افترا پردازی تھی۔ نہ طلوعِ اسلام کوئی الگ نماز تجویز کرتا ہے نہ تین وقتوں کی نماز بتاتا ہے نہ الگ فرقہ بناتا ہے۔ جس کے نزدیک فرقہ سازی شرک ہو، وہ بھلا خود فرقہ کیسے بن جائے گا؟)۔

بہرحال، یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن نے صلوٰۃ کو امتِ واحدہ کے لئے وجۂ جامعیت قرار دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب خود رسولؐ کے زمانے میں بعض تفرقہ انگیزوں نے ایک نئی مسجد تعمیر کی تو قرآن نے جس شدت سے اس فعل

مخالفت کی اس کا اندازہ سورۂ توبہ کی متعلقہ آیات سے لگ سکتا ہے۔ سنو! اور غور سے سنو! کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا۔ جن لوگوں نے اس غرض سے مسجد تعمیر کی کہ اس سے ملت اسلامیہ اور خود دین کو نقصان پہنچایا جائے۔ وَّکُفْرًا۔ اور کفر کی حمایت کی جائے یا کفر کی روش اختیار کی جائے۔ وَّتَفْرِیْقًا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ یعنی اس غرض سے کہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کیا جائے۔ تم اس مسجد کو مسجد سمجھتے ہو؟ یہ مسجد نہیں۔ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ۔ یہ وہ کمین گاہ ہے جس میں بیٹھ کر وہ شخص جو اس سے پہلے خدا اور رسول (نظام خداوندی) کا دشمن تھا، ملت پر تیر اندازی کرے گا۔ یعنی یہ مسجد نہیں۔ یہ وہ قلعہ ہے جس کے اندر خدا اور رسول کے دشمن پناہ لے کر دین کے قصر مشید کو منہدم کرنے کی مذموم کوشش کریں گے۔ وَلَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی۔ یہ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ اس مسجد کی تعمیر سے ہمارا ارادہ بجز بھلائی کے اور کچھ نہیں۔ ہم دین کی تخریب تھوڑا چاہتے ہیں؟ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۔ تم ان کی باتوں میں نہ آجانا۔ خدا گواہ ہے کہ یہ یکسر جھوٹے ہیں۔ لَا تَقُمْ فِیْهِ اَبَدًا۔ اے رسول! تم اس مسجد میں ایک قدم بھی نہ رکھنا۔ یہ مسجد تو یوں سمجھو کہ دوزخ کے کنارے پر کھڑی ہے۔ جس نے اسے بنایا ہے اور جو اس میں داخل ہوگا، یہ ان سب کو لے کر جہنم کے عمیق گڑھے میں جا گرے گی (۹/۱۰۷-۱۰۹) چنانچہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ رسول اللہؐ نے صحابہؓ کو بھیج کر اس مسجد کو منہدم کرا دیا۔

اس واقعہ سے تم اندازہ لگاؤ سلیم! کہ اسلام میں فرقہ بندی کس قدر شدید اور سنگین جرم ہے، کہ (اور تو اور) اگر کسی مسجد کی تعمیر میں بھی فرقہ بندی کی جھلک نظر پڑتی ہے تو اس مسجد کا گرا دینا ضروری ہوتا ہے۔ مسجد گرائی جا سکتی ہے لیکن فرقہ کی طرح نہیں پڑنے دی جا سکتی۔ کیونکہ فرقہ بندی بہ نص صریح شرک ہے۔ اور شرک جلی۔

۱۰۔ یہ تھیں وہ کھلی کھلی ہدایات جو وحدت امت کے سلسلہ میں مسلمانوں کو دی گئیں۔ انہی ہدایات کی بنا پر نبی اکرمؐ نے امت واحدہ کی تشکیل فرمائی۔ یہ وہ امت تھی جس کا نظام ایک تھا۔ ضابطۂ زندگی ایک تھا۔ مرکز ایک تھا۔ دین ایک تھا۔ راستہ ایک تھا۔ نصب العین ایک تھا۔ ان میں نہ کسی قسم کا اختلاف تھا نہ افتراق۔ یہی تھی وہ جماعت جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (۳/۱۰۲) اللہ نے ان کے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا اور دین کے ذریعہ انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا۔ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔

اس کے بعد اس امت پر کیا گزری؟ یہ ایک حدیث ہے دلخراش اور داستان ہے جگر سوز۔ اس کے لئے تفصیل میں گئے بغیر، قرآن کے الفاظ میں صرف اتنا سن لو کہ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًا بَیْنَهُمْ (۴۲/۱۴)۔

جس طرح امم سابقہ نے، وحی کے مل جانے کے بعد، باہمی ضد اور سرکشی کے جذبے سے دین میں فرقے بنا ڈالے تھے، یہ بھی فرقوں میں بٹ گئے۔ قرآن کے اس قدر واضح، بیّن اور صریح احکام و ہدایات تنبیہات و تاکیدات کی موجودگی میں، امت کا فرقوں میں بٹ جانا یقیناً ایک تحیّر انگیز واقعہ ہے لیکن اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ امّت فرقوں میں بٹی اور یہ فرقے اب تک موجود ہیں۔ اس مقام پر رہ رہ کر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ فرقوں میں بٹنے والے لوگ اپنی اس روش کے جواز میں بالآخر کوئی دلیل تو پیش کرتے ہوں گے؟ جی ہاں! وہ دلیل پیش کرتے ہیں۔ غور سے سنو کہ وہ دلیل کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ۔ (میری امت میں اختلاف رحمت ہے)۔ تم نے سوچا سلیم! کہ یہ بات کیا ہوئی؟ یعنی وہی اختلاف جس کے متعلق قرآن نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ وہ خدا کا عذاب ہے، باعث کفر ہے شرک ہے۔ اسی اختلاف کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ (معاذ اللہ) رسول اللہؐ نے اسے باعث رحمت قرار دیا ہے! جو شخص ذرا بھی قرآنی تعلیم سے مس رکھتا ہو، وہ بلا ادنیٰ تامّل کہدے گا کہ عربی زبان کا یہ فقرہ کبھی رسول اللہؐ کا ارشاد نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ نے کبھی ایسا نہیں فرمایا ہوگا۔ یہ ناممکن ہے کہ خدا ایک چیز کو عذاب قرار دے اور اس کا رسول اسے رحمت بتائے۔ لیکن آپ یہ کچھ کہتے رہیئے۔ فرقہ پرست اپنی بات پر اڑے رہیں گے کہ نہیں! رسول اللہؐ نے ایسا فرمایا اور ضرور فرمایا تھا۔ یہ محض اس لئے کہ اگر اسے حدیث رسول اللہؐ قرار نہ دیا جائے تو پھر فرقہ بندی کے جواز کی راہ کوئی نہیں رہ جاتی لیکن وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ جو لوگ حقیقت کو طوعاً (بہ طیب خاطر) نہیں مانتے، حقیقت اُن سے اپنے آپ کو کرہاً (مجبوراً) منوا لیتی ہے۔ اس کی شہادت حال ہی میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ ہوا یہ کہ مرزائیوں کے خلاف یہ اعتراض کیا گیا کہ انہوں نے ایک نیا فرقہ بنا کر امت میں اختلاف پیدا کر دیا ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اگر ہمارے کسی عمل سے امت میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے تو امت کو اس کے لئے ہمارا شکر گزار ہونا چاہیئے، نہ کہ شکوہ سنج۔ اس لئے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ اختلاف امتی رحمۃ۔ لہذا ہمارا یہ نیا فرقہ امت کے لئے مزید رحمتوں کا باعث ہے۔

تم سوچو سلیم! کہ ان کے اس جواب کا جواب الجواب کیا ہو سکتا تھا؟ اس کے جواب میں (جمعیت اہل حدیث کے ترجمان "الاعتصام" کو) مجبوراً کہنا پڑا کہ "اختلاف اُمتی رحمت" کوئی حدیث ہی نہیں۔ اس لئے اسے سند میں پیش نہیں کیا جا سکتا لیکن سلیم! اب اس فقرے کو حدیث نہ قرار دینے سے کیا حاصل؟ اس نے جس قدر تباہی مچائی تھی اس ایک ہزار برس میں مچا دی۔ اس نے اُمت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ انہیں فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر کے مستقل جنگ و جدال کا سامان پیدا کر دیا ان کی دنیا اور عاقبت دونوں خراب کر دیں۔ ایسی عظیم ہلاکتوں اور تباہیوں کے بعد اگر اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا کہ یہ فرمان رسولؐ نہیں ہے تو اس سے اُن نقصانات کی تلافی کیا ہو گی؟[1] اس قسم کی ہیں سلیم! وہ وضعی حدیثیں جن کے متعلق میں کہا

[1] اور تماشا یہ کہ اسے قول رسول اللہؐ نہ قرار دینے کے باوجود فرقے سب اپنی اپنی جگہ برقرار رہے اور برقرار ہیں۔

کرتا ہوں کہ یہ عجمی سازش کا نتیجہ ہیں اور یہ ہے وہ جرم جس کی پاداش میں مجھے گردن زدنی اور کشتنی قرار دیا جاتا ہے۔

بہرحال، یہ تو جملۂ معترضہ تھا، میں کہہ یہ رہا تھا کہ فرقہ بندی کے جواز میں "اختلاف امتی رحمت" کو بطور دلیل پیش کیا گیا۔ لیکن اس میں ایک سقم تھا اور وہ یہ کہ اس کی رو سے تمام فرقے موجب رحمت، فلہذا حق پر قرار پا جاتے تھے اور فرقہ بندی اسے کبھی گوارا ہی نہیں کر سکتی کہ ہر فرقے کو سچا سمجھا جائے۔ لہذا اس کے لئے ایک اور حدیث وضع کی گئی جس میں کہا گیا کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ میری اُمت میں تہتّر فرقے ہوں گے۔ ان میں سے ایک فرقہ ناجی ہوگا۔ باقی سب جہنمی ہوں گے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ اس میں "ایک فرقہ" کی استثناء نے کس طرح ہر فرقہ کو مطمئن کر دیا کہ وہ برسرحق ہے اور باقی سب باطل پر ہیں۔ قرآن نے فرقوں کے متعلق کہا تھا کہ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ہر فرقہ اس زعم باطل میں رہتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ یعنی قرآن نے کل حزب (تمام فرقے) کہہ کر اس چور دروازے کو بند کر دیا جس کے راستے فرقہ پرستی کا جھوٹا اطمینان داخل ہو سکتا تھا۔ لیکن اس وضعی روایت نے "ایک فرقہ کی استثناء" سے اس دروازے کو چوپٹ کھول دیا۔ چنانچہ ہماری ہزار سالہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اسی استثناء کی آڑ میں، ہر فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور دوسرے فرقوں کو جہنمی قرار دینے کے "جہاد عظیم" میں مصروف چلا آ رہا ہے اور ان خون کے چھینٹوں کو اپنے لئے وجہ سرخروئی سمجھ رہا ہے۔ چنانچہ خود ہمارے ہاں بھی آجکل جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس داستان رنگین کی زندہ شہادت ہے۔ علاوہ ان فسادات کے جو مختلف فرقوں میں برپا ہوتے رہتے ہیں، آئے دن اس قسم کی خبریں اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ فلاں مقام پر فلاں فرقہ کے متبعین نے فلاں فرقہ کے امام کو قتل کر دیا اور فلاں مقام پر فریق مخالف کے خطیب کو مار دیا گیا۔ یہ اس امت کے "دیندار" طبقہ کا حال ہے جسے بہ نص صریح بتایا گیا تھا کہ

مَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا (۴/۹۳)۔

جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو عمداً قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا عذاب اور اس کی لعنت ہوگی۔ اور اس کے لئے اللہ نے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ہمارے یہ فرقے اب تک مسجدوں کی چار دیواری یا مناظرہ کے میدانوں تک محدود تھے اور اس قسم کی آوازیں بہرحال سننے میں آتی رہتی تھیں کہ فرقہ بندی بڑے نقصان کا باعث ہے۔ مسلمانوں کو باہمی اتحاد و اتفاق سے رہنا چاہیئے۔ لیکن اب ہمارے ہاں ایک ایسی تبدیلی واقع ہوئی ہے جس سے فرقوں کی پوزیشن یکسر بدل گئی ہے۔ ہماری "جمہوریۂ اسلامیۂ پاکستان" نے جو دستور مرتب کیا ہے، اور جسے خیر سے اسلامی دستور قرار دیا گیا ہے، اس میں "مسلمانوں کے ان مسلّمہ فرقوں" کو آئینی سند عطا کر دی گئی ہے۔ یعنی اسلامی دستور

اور اس میں فرقوں کی آئینی حیثیت! یا ویلنا و یاللعجب!! یہ وہ دستور ہے جس پر ہماری مذہبی جماعتوں نے چراغاں کیا تھا[1]

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما؟

۱۱۔ اب سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ فرقے بہر حال موجود ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو مٹانے کے لئے تیار نہیں۔ ہر فرقہ، فرقے مٹانے کی تدبیر یہ بتاتا ہے کہ دوسرے فرقے اپنے آپ کو اس فرقے میں شامل کرلیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کوئی فرقہ بھی تیار نہیں۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ اس مشکل کا حل کیا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم اور بڑا نازک ہے اس لئے اس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔

۱۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ ہر قسم کے اختلافات کو مٹانے کے لئے آیا ہے۔

۲۔ اس پر ہمارا ایمان ہے۔

۳۔ قرآن ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔

اب تم سوچو کہ اگر ہم اس کے بعد بھی یہ کہتے ہیں کہ ہمارے اختلافات مٹ نہیں سکتے اور فرقے ختم نہیں ہوسکتے تو اس کی زد کہاں جاکر پڑتی ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ (معاذ اللہ) قرآن میں اب اس کی صلاحیت نہیں کہ وہ اختلافات مٹا سکے۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا ہم میں سے کوئی بھی ایسا کہنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ لیکن اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ اب ہمارے فرقے مٹ نہیں سکتے تو اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہوسکتے ہیں کہ ہم عملاً اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرآن کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ وہ فرقوں کو مٹا سکتا ہے! اگر قرآن کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے تو ہمیں سب سے پہلے اس خیال کو دماغ سے نکال دینا ہوگا کہ قرآن کے ہوتے ہوئے فرقے نہیں مٹ سکتے۔ یاد رکھئے! قرآن کا ہر دعویٰ سچا ہے اور اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اختلافات کو مٹا دے۔ اس کے بعد سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ طریق کیا ہے جس کے مطابق قرآن اختلافات کو مٹاتا ہے؟

آج سے کچھ عرصہ پیشتر ہمارے ہاں (پنجاب میں) ایک جماعت[2] پیدا ہوئی جس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ خالص قرآن پر عمل کرے گی اور اس طرح مسلمانوں میں پیدا شدہ اختلافات کو مٹا دے گی۔ یہ مقصد بڑا نیک اور یہ دعویٰ بہت مبارک تھا۔ لیکن اس کا جو عملی نتیجہ ہمارے سامنے آیا وہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس سے سابقہ فرقوں کا مٹنا تو کجا، ان میں ایک اور فرقے کا اضافہ ہوگیا۔ ہمارے لئے ان حضرات کی نیت پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن چونکہ اختلافات مٹانے کے لئے قرآن نے جو طریق بتایا تھا وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل رہا، اس لئے ان کی یہ کوشش ناکام رہی۔ بدقسمتی یہ کہ اس ناکامی نے خود قرآن کے مشن کو بڑا نقصان پہنچایا۔ اس طرح کہ اب اگر کسی سے کہا جاتا ہے کہ ہمارے اختلافات قرآن کی رو سے مٹ سکتے ہیں تو وہ اس کے جواب میں طنزاً اور یا ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہہ دیتا ہے کہ صاحب یہ نسخہ بھی آزمایا جاچکا اور ناکام ثابت ہوچکا ہے۔ یعنی ان حضرات کی ناکامی نے خود قرآن کے متعلق یہ خیال پیدا کر دیا کہ (معاذ اللہ) اس میں اس کی صلاحیت ہی نہیں رہی کہ یہ اختلافات کو مٹا سکے۔

۱۲۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن ان اختلافات کے مٹانے کا کیا طریق بتاتا ہے؟

---

[1] یہ دستور اکتوبر ۱۹۵۸ء میں منسوخ ہوگیا تھا۔ [2] فرقۂ اہل قرآن۔

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لو کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ وَ مَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ (۴۲/۱۰)۔ جس معاملہ میں بھی تمہیں اختلاف ہو اُس کا فیصلہ (حکم) اللہ کی طرف سے ہونا چاہئے۔ اس میں "حکم" کا لفظ غور طلب ہے۔ یعنی یہ انفرادی چیز نہیں کہ دو آدمیوں میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہو اور وہ اپنے طور پر قرآن سے فیصلہ لینے کے لئے بیٹھ جائیں۔ متنازعہ فیہ امور میں حکم یا فیصلہ ہمیشہ تعبیر ہے مقام سے ملا کرتا ہے، اسے حکم یا ثالث کہتے ہیں۔ اسی مقصد کے لئے قرآن نے رسول اللہؐ سے کہا تھا کہ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (۴/۶۵)۔ تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ کبھی صاحب ایمان نہیں کہلا سکتے جب تک یہ اپنے اختلافی امور میں تجھے اپنا (فیصلہ دینے والا) تسلیم نہ کریں۔ اور پھر جو فیصلہ یہاں سے صادر ہو اس کے خلاف اپنے دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں، بلکہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ یعنی قرآن سے فیصلہ انفرادی طور پر نہیں لیا جائے گا بلکہ اس کے لئے ایک زندہ اور محسوس ثالث اور حاکم کی ضرورت ہوگی۔ اس فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کو قرآن میں "اللہ اور رسولؐ" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس آیت سے چند آیات پہلے ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔ اے جماعت مومنین! تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ... (۴/۵۹)۔ اور اگر تم میں کسی معاملہ میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اسے اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش نہ کرو (بلکہ) اسے "اللہ اور رسولؐ" کی طرف لوٹا دو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو سمجھا جائے گا کہ تمہارا اللہ اور آخرت پر ایمان ہے۔ اس کے معنی صاف طور پر یہ ہیں کہ دو افراد میں اختلاف تو ایک طرف، اگر افسران ماتحت کے کسی فیصلہ سے بھی اختلاف ہو تو اسے قرآنی نظام کی مرکزی اتھارٹی (اللہ اور رسولؐ) کی طرف لوٹا دو، یہی شرطِ ایمان ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو یہ کفر ہو جائے گا۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے تفرقہ اور اختلاف کو کفر سے تعبیر کیا ہے۔ اس کفر سے محفوظ رہنے کی عملی شکل یہ بتائی گئی ہے کہ اُمت کے پاس قرآن ہو اور قرآن کی روشنی میں فیصلہ دینے والا رسولؐ۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں ہے وَ كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَیْكُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ وَ فِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ (۳/۱۰۱)۔ تم کس طرح کفر میں مبتلا ہو سکتے ہو جبکہ حالت یہ ہے کہ:

۱۔ تمہارے پاس کتاب اللہ موجود ہے۔ اور

۲۔ اس کے ساتھ تم میں اُس کا رسولؐ موجود ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک اُمت میں (۱) قرآن اور (۲) رسولؐ موجود ہو، فرقے پیدا نہیں ہو سکتے۔

۳۔ اس سے ہمارے سامنے ایک اور سوال آ گیا۔ اور وہ یہ کہ قرآن کی ان آیات سے تو یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ کی موجودگی (یعنی زندگی) تک اُمت نے فرقوں سے بچے رہنا تھا، لیکن آپ کے بعد فرقوں سے محفوظ رہنے کی کوئی صورت نہیں تھی کیونکہ فرقوں سے بچنے کے لئے قرآن اور رسولؐ دونوں کی موجودگی کی ضرورت تھی اور جب ان میں سے ایک جزو (رسولؐ) موجود نہ رہا تو اس حفاظت کی شکل باقی نہ رہی۔ قرآن کہتا ہے کہ تم نے بات کو صحیح طور پر نہیں سمجھا۔ تم اس خیال میں ہو کہ "رسولؐ کی موجودگی" سے مراد یہ ہے کہ جب تک محمد رسول اللہؐ

تم میں زندہ موجود ہیں اس وقت تک یہ شکل باقی رہے گی۔ جب وہ وفات پا جائیں گے تو پھر "رسول" موجود نہیں رہیگا۔ یہ بات غلط ہے۔ یہ سلسلہ رسول کی طبعی زندگی سے مشروط نہیں، اس کے بعد بھی قائم رہے گا۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں یہ کہکر اس کی صراحت کر دی گئی کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۔ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۔ محمدؐ بجز اس نیست کہ اللہ کا رسول ہے۔ اس سے پہلے بہت سے رسول (اپنا فریضۂ پیغام رسانی ادا کرنے کے بعد) دنیا سے چلے گئے سو اگر (کل کو) یہ وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے، تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ یہ نظام اس کی زندگی تک محدود تھا) پھر اپنی سابقہ روش کی طرف لوٹ جاؤ گے؟ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ط (۳/۱۴۴) جو (رسول کی وفات پر) اپنی سابقہ روش پر لوٹ جائیگا تو وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیگا (اپنا ہی کچھ بگاڑے گا)۔

اس سے بات بالکل واضح ہو گئی یعنی یہ کہ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ سے مراد رسول اللہ کی طبعی زندگی نہیں۔ آپ کی وفات کے بعد بھی یہ سلسلہ بدستور باقی رہ سکتا تھا یہی وجہ ہے کہ قرآن نے حضورؐ کو خَاتَمُ النَّبِيّٖنَ کہا ہے۔ یعنی نبوت آپ کی ذات پر ختم ہو گئی۔ لیکن "رسالت[1]" آپ کے بعد بھی جاری رہے گی۔ نبوت کے معنی ہیں خدا کی طرف سے وحی پانا اور رسالت سے مراد ہے اس وحی کو آگے پہنچانا اس کے مطابق نظام قائم کرنا متنازعہ فیہ امور میں فیصلے دینا۔ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ جب رسول اللہ وفات پا گئے، تو اُمت میں کہرام مچ گیا ایسا ہونا فطری امر تھا۔ شدت جذبات میں، بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جس نظام کو رسول اللہ نے قائم فرمایا تھا، اب وہ ختم ہو گیا کیونکہ اس کے لئے وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ کی شرط تھی۔ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ برسرِ منبر تشریف لائے اور "فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ" کا قرآنی مفہوم اس انداز سے سمجھا دیا کہ اس سے بہتر انداز کوئی ہو نہیں سکتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اَيُّهَا النَّاسُ! مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّهٗ، قَدْ مَاتَ ۔ وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَاِنَّهٗ حَیٌّ لَا يَمُوْتُ ۔ اے لوگو! جو تم میں سے محمدؐ کی محکومیت اختیار کئے تھا اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا معبود وفات پا گیا ہے۔ لیکن جو خدا کی محکومیت اختیار کئے تھا تو اس کا معبود زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس کے بعد آپ نے وہی آیت پڑھی جو اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ یعنی وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ..... اس سے حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی۔ سمجھ گئے سلیم! کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد یہ نظام کس طرح قائم رہیگا۔ چنانچہ وہ اُٹھے اور اُنہوں نے فوراً خلیفۃ الرسولؐ (یعنی رسول اللہ کے جانشین) کا انتخاب کیا اور اس طرح رسول اللہ کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا اُسے پُر کر لیا۔ اس لئے کہ یہ ظاہر ہے کہ کسی کے جانشین کی موجودگی، خود اس کی اپنی موجودگی ہوتی ہے اس طرح اُمت میں "قرآن اور رسولؐ" بدستور موجود رہا۔

اس مقام پر اتنا اور واضح کر دینا ضروری ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد فریضۂ رسالت کی ادائیگی درحقیقت پوری اُمت کے ذمے عائد ہوتی تھی۔ اس لئے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ:

ا۔ کتاب اللہ کی وارث اُمت ہے، نہ کہ کوئی ایک فرد۔ سورۂ فاطر میں ہے وَالَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ

---

[1] رسالت سے میری مراد دین کو آگے پہنچانا یا اسے عملاً قائم کرنا ہے۔ اس سے مراد خدا کی طرف سے وحی حاصل کر کے لوگوں تک پہنچانا نہیں۔ اس قسم کی رسالت حضورؐ کے بعد ختم ہو گئی ہے۔

هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ - اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ۔ اللہ وہ ہے جس نے تیری طرف (اے رسولؐ) یہ کتاب نازل کی جو ان حقیقتوں کو سچ کر دکھانے والی ہے، جو اس کے سامنے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ رسولؐ کے بعد کیا ہوگا؟ اس کے لئے اُس خدا نے جو اپنے بندوں کے تمام حالات سے باخبر ہے کہا یہ کہ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا (۳۵ / ۳۱-۳۲)۔ پھر ہم نے اس کتاب کی وراثت کے لئے اپنے بندوں میں سے (اُس امت کو) منتخب کر لیا ہے یعنی پہلی بات یہ ہے کہ قرآن کی وارث پوری اُمّت ہے۔ اس کے بعد آگے بڑھئے۔

۲۔ رسول اللہؐ کا فریضہ یہ تھا کہ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ (۷ / ۱۵۷)۔ وہ معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔ اب یہی فریضہ اُمت کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ..... (۳ / ۱۱۰) تم بہترین اُمت ہو جسے نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم معروف کا حکم دو۔ اور منکر سے روکو۔

دیکھا سلیم! ان حقائق سے واضح ہے کہ رسول اللہؐ کی جانشین درحقیقت پوری کی پوری اُمت ہے۔ عملی انتظام کی سہولت کے لئے اُمت اپنے میں سے بہترین فرد کو اپنا نمائندہ بنا کر اس سلسلہ کو قائم رکھتی ہے۔ اس طرح اُمت میں "کتاب اور رسول" بدستور باقی رہتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں اختلافات کے رونما اور فرقوں کے پیدا ہونے کا امکان ہی نہیں رہتا۔ چنانچہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں نہ کوئی اختلاف پیدا ہوا، نہ کسی فرقے نے جنم لیا۔ اس لئے کہ اس دور میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی اختلافی معاملہ کے تصفیہ کے لئے افرادِ اُمت از خود فیصلہ کرنے بیٹھ گئے ہوں۔ اختلافی امور میں مرکزی اتھارٹی کی طرف رجوع کیا جاتا تھا اور اس کے فیصلوں کی اطاعت سب پر لازم تھی۔

یہیں سے ہمیں اُس سوال کا جواب مل جاتا ہے جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا تھا۔ یعنی یہ سوال کہ اُمت ایک طریق پر قائم ہے۔ کچھ لوگ اس طریق سے اختلاف کر کے الگ فرقہ بنا لیتے ہیں۔ اس صورت میں اُمت دو فرقوں میں بٹ گئی۔ جن لوگوں نے الگ فرقہ بنا لیا، وہ تو یقیناً مجرم ہیں۔ لیکن جو پہلے طریق پر قائم رہے اُنہیں تو مجرم نہیں قرار دیا جا سکتا؟ بالکل ٹھیک ہے۔ یہ ہے وہ دلیل جسے ہر فرقہ کی طرف سے یہ کہہ کر پیش کیا جاتا ہے کہ ہم اصلی اور حقیقی اسلام پر قائم ہیں اور الگ فرقے دوسروں نے بنائے ہیں۔ لیکن ایسا کہنے میں اس حقیقت کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ جب تک "فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ" کی کیفیت رہے، یہ صورت جسے یوں بیان کیا جاتا ہے، پیدا نہیں ہو سکتی۔ اُس وقت اگر کوئی جماعت اُمت سے اختلاف کرے گی تو رسولؐ کا جانشین، قرآن کے اس حکم کے ماتحت کہ، اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (۶ / ۱۶۰) اس امر کا اعلان کر دے گا کہ اُمت کو نئے فرقے سے کوئی سروکار نہیں۔ لہٰذا وہ اُمت کا فرقہ کہلا ہی نہیں سکے گا۔ اُسے مسلمانوں سے کچھ واسطہ ہی نہیں رہے گا۔ وہ اسلام کے دائرہ سے خارج ہوگا۔ اس لئے اُمت

اُمت واحدہ ہی رہے گی۔

بہر حال یہ تھی وحدتِ اُمت کی وہ عملی شکل جسے قرآن نے رسول اللہؐ کی وفات کے بعد تجویز کیا تھا اور جسے حضورؐ کی وفات کے بعد اختیار کیا گیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ صورت قائم نہ رہی۔ خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی۔ سلاطین نے اپنی مصلحتوں کے ماتحت سیاست کو مذہب سے الگ کر دیا۔ اس یکسر غیر قرآنی تقسیم کی رو سے، سیاست سے متعلق امور کے فیصلے بادشاہ خود کرتے تھے۔ باقی رہی شریعت، سو اس کے متعلق اس کے سوا کوئی صورت ہی نہ تھی کہ لوگ انفرادی طور پر فیصلے کرتے۔ اس ضمن میں ایک اور دشواری سامنے آئی۔ قرآن نے "اللہ اور رسولؐ" کی اطاعت کا حکم دیا تھا۔ "اللہ اور رسولؐ" کا جو مفہوم قرآنی نظام میں لیا جاتا تھا، اس مفہوم کی اب گنجائش ہی نہ تھی۔ اس لئے کہ اب وہ نظام ہی باقی نہ تھا۔ لہذا اب "اللہ اور رسولؐ" کی اطاعت کا کوئی نیا مفہوم لیا جانا ناگزیر ہو گیا۔ اللہ کی اطاعت کے متعلق تو سمجھ لیا گیا کہ اس سے مراد کتاب اللہ کی اطاعت ہے۔ لیکن رسولؐ کی اطاعت کس طرح کی جائے، یہ سوال مشکل تھا۔ اس کے حل کے لئے اس کے سوا کوئی اور صورت نظر نہیں آتی تھی کہ حضورؐ کی احادیث کی طرف رجوع کیا جائے۔ زمانۂ خلافت میں چونکہ اطاعتِ رسولؐ کا عملی مفہوم سامنے تھا اس لئے احادیث کے جمع اور مرتب کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب اس کی ضرورت پڑ گئی۔ لہذا احادیث کے مجموعے مرتب کئے گئے۔ اب "اللہ اور رسولؐ" کی اطاعت کا طریقہ یہ قرار پایا کہ قرآن اور حدیث کی رو سے متنازعہ فیہ امور کے فیصلے انفرادی طور پر کئے جائیں۔ ان انفرادی فیصلوں میں اختلاف ناگزیر تھا۔ اس لئے مختلف فرقوں کے نزدیک "قرآن اور حدیث" کے فیصلے مختلف ہو گئے۔ ان اختلافات کو مٹانے کے لئے مناظرے اور مباحثے شروع ہو گئے۔ اس کا جو نتیجہ نکلا وہ ہمارے سامنے ہے۔ یعنی۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ اُمت میں بیسیوں فرقے موجود ہیں اور ہر فرقہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت کا مدعی اور حقیقی اسلام پر کاربند ہونے کا دعوے دار ہے۔ اور چونکہ اختلافات مٹانے والی کوئی زندہ اتھارٹی موجود نہیں، یعنی "خدا اور رسول" کی شکل باقی نہیں، اس لئے کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا کہ کون غلط کہتا ہے اور کون صحیح ہے۔

میرا خیال ہے سلیم! اب ہم خود بخود اس مقام تک پہنچ گئے ہیں جہاں ہمیں اس سوال کا جواب مل جائے کہ اُمت میں وحدت پیدا کرنے کی شکل کیا ہے؟ اس کی شکل یہ ہے کہ جس نظام کے گم ہو جانے سے فرقہ بندی شروع ہوئی تھی اس نظام کو پھر سے قائم کر دیا جائے۔ اس کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ اس فکر کو عام کیا جائے کہ فرقوں کی موجودگی اور اسلامی زندگی دو متضاد چیزیں ہیں جو، قرآن کی رو سے، ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ اور فرقوں کو مٹا کر اسلامی زندگی پیدا کرنے کا طریق، قرآنی نظام کے قیام کے سوا اور کوئی نہیں۔ میرے سامنے یہی مقصد ہے اور اسی کے حصول کے لئے میں مصروفِ جدوجہد ہوں۔

لیکن اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اب قرآنی نظام کے قیام کا کوئی امکان نہیں، تو اسے کم از کم اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا نہیں رکھنا چاہئے کہ ہماری موجودہ زندگی اسلامی زندگی ہے۔ یا (فرقوں کے باوجود) اسلامی ہو سکتی ہے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ موجودہ مسلمان اس حقیقت کو سامنے لانے کے لئے بآسانی تیار نہیں ہوں گے۔ وہ اسے کبھی تسلیم نہیں کرنا چاہیں گے کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلامی زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک قابل قبول یہی مسلک ہو گا کہ تمام فرقوں میں سے ایک فرقہ حق پر ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ جس فرقہ سے میں متعلق ہوں، وہ حق پر ہے۔ لہٰذا اس کے مطابق زندگی، اسلامی زندگی ہے۔ جو نظریہ ان سے اس اطمینان کو چھینتا ہے، وہ ان کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ انہیں اس کے خلاف غصّہ آتا ہے۔ لیکن ان کا یہ غصّہ خود قرآن کے خلاف ہونا چاہئے جو فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے، نہ کہ اس کے خلاف جو قرآن کی اس تعلیم کو ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یا تو انہیں یہ ثابت کرنا چاہئے کہ قرآن کی تعلیم یہ نہیں۔ اور اگر یہ اس کی تردید نہیں کر سکتے تو پھر ان کے برافروختہ ہو جانے سے قرآنی حقیقت تو اپنی جگہ سے بدل نہیں جائے گی۔ یاد رکھو سلیم! جب تک ہم اس تلخ حقیقت کو گوارا نہیں کر لیتے کہ فرقہ بندی کی زندگی قطعاً اسلامی زندگی نہیں، ہم قرآن کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر نہیں آ سکتے۔ قرآن کی رو سے صراطِ مستقیم ایک ہی ہے۔ جب اُمت مختلف راستوں پر چل نکلے تو پھر وہ صراطِ مستقیم کسی کے سامنے بھی نہیں رہتا۔ سورۂ انعام میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۶/۱۵۳) یاد رکھو! میرا یہی ایک سیدھا راستہ ہے۔ پس تم سب اس کا اتباع کرو۔ اس کے سوا دوسرے راستوں پر نہ چلو۔ وہ راستے تمہیں اس صراطِ مستقیم سے متفرق اور پراگندہ کر دیں گے۔ اللہ نے تمہیں اس کا حکم دیا ہے تاکہ تم دین کی نگہداشت کرو اور تفرقہ بازی کی تباہیوں سے بچو۔

اس وقت تک میں نے صرف مذہبی فرقوں کے متعلق گفتگو کی ہے، سیاسی پارٹیوں کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ لیکن ان کے متعلق کچھ جداگانہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ شعبے نہیں۔ اس لئے تفرقہ، مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو یا سیاسی پارٹیوں کی صورت میں، اس کی حیثیت یکساں ہے۔ قرآن کی رو سے سیاسی پارٹی بازی کتنا بڑا جرم ہے اس کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ حضرت موسیٰؑ سے (عطائے نبوت کے بعد) کہا گیا کہ ہم نے تمہیں ایک خاص مشن کے لئے منتخب کیا ہے۔ اس لئے اب اس مہم کے سر کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور فرعون کو اس کی دست درازیوں سے روکو۔ فرعون کا وہ جرم کیا تھا جس کی وجہ سے

اس کے خلاف اس قدر اہم اور شدید کارروائی کی ضرورت پڑ گئی ؟ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ ۔ فرعون نے سخت سرکشی اختیار کر رکھی ہے ، اس نے اودھم مچا رکھا ہے ، اس نے انسانیت کو تباہ کر دیا ہے ! اس نے کیا یہ ہے کہ جَعَلَ اَہۡلَہَا شِیَعًا (۲۸/۴) اس نے باشندگان ملک کو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا ہے ۔

تم نے غور کیا سلیم ! کہ پارٹی بازی عدالت خداوندی میں کتنا بڑا سنگین جرم ہے ۔ سورۂ انعام میں ہے کہ جس قوم پر ، اس کے جرائم کی پاداش میں خدا کا عذاب مسلّط ہوتا ہے اس کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں ۔ قُلۡ ہُوَ الۡقَادِرُ عَلٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَ عَلَیۡکُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِکُمۡ ۔ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ اس قوم پر اس قسم کے حاکم مسلّط ہو جاتے ہیں جو ظلم و استبداد سے ان کا کچومر نکال دیتے ہیں ۔ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِکُمۡ کبھی یہ ہوتا ہے کہ قوم کے نچلے طبقہ (عوام) میں اضطراب اور عدم اطمینان اس شدّت تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ قانون شکنی اور فساد انگیزی پر اُتر آتے ہیں اور اس طرح معاشرہ کا نظام تہ و بالا ہو جاتا ہے ۔ اَوۡ یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا وَّ یُذِیۡقَ بَعۡضَکُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ یا ایسا ہوتا ہے کہ خواص اور عوام مل کر مخلوط پارٹیاں بنا لیتے ہیں ۔ ہر ایک لیڈر اپنے پیچھے کچھ بھیڑیں لگا لیتا ہے اور پھر یہ پارٹیاں ایک دوسرے سے لڑتی ہیں ۔ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَفۡقَہُوۡنَ (۶/۶۵) ۔ غور کرو کہ ہم کس طرح مختلف پہلوؤں کو سامنے لا کر حقیقت کو واضح کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ بات کو سمجھ سکیں ۔

لہٰذا مذہبی فرقے ہوں یا سیاسی پارٹیاں ، قرآن کی رو سے دونوں خدا کا عذاب ہیں ۔ لیکن پارٹیوں کا مٹانا ایسا مشکل نہیں ہوتا ۔ ایک عمدہ نظام میں پارٹیوں کو آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے ۔ اصل دشواری مذہبی فرقوں کے مٹانے میں پیش آتی ہے کیونکہ اس کی مخالفت میں عوام کے مقدّس جذبات کو ابھارا جاتا ہے ۔ اس کا علاج سوائے قرآنی نظام کے احیاء کے اور کچھ نہیں ۔

وہی دیرینہ بیماری ، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

کیوں سلیم! قرآن کا بتایا ہوا علاج سمجھ میں آیا؟ اس سے اطمینان ہوا یا نہیں؟ ہوگا کیوں نہیں، تم تو قلبِ سلیم رکھتے ہو۔

اچھا خدا حافظ!

والسلام

پرویز

جنوری ۱۹۵۸ء

(باقی خطوط کے لئے تیسری جلد ملاحظہ فرمائیے)